

فارسی ادب

کی

مختصر ترین تاریخ

ڈاکٹر محمد ریاض

ڈاکٹر صدیق شبلی

فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ

ڈاکٹر محمد ریاض
ڈاکٹر صدیق شبلی

سنگ میل پبلی کیشنز ٥ چوک اُردو بازار - لاہور

891.51 Dr. Muhammad Riaz, Dr. Sadeeq Shibli
Farsi Adab Ki Mukhtasar Tareen Tarikh/ Dr. Muhammad Riaz, Dr. Sadeeq Shibli.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2011.
254pp.
1. Persian Literature - History.
I. Title.

2011

نیاز احمد نے
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-0010-5
ISBN-13: 978-969-35-0010-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

خاص مآخذ و منابع

۱	تاریخ ادبیات ایران (۲ جلد)	استاد جلال الدین ہمائی سنا
۲	تاریخ ادبی ایران (۴ جلد)	پروفیسر براؤن
۳	تاریخ ادبیات در ایران (۳ جلد)	استاد ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا
۴	سخن و سخنوران (۲ جلد)	استاد بدیع الزمان فروزانفر
۵	تاریخ نظم و نثر فارسی (۲ جلد)	استاد سعید نفیسی
۶	سیر سخن (۲ جلد)	حسین رزمجو / احمد احمدی (مشہد)
۷	مختصری در تحول نظم و نثر فارسی تاریخ	استاد ڈاکٹر صفا
۸	تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند	(ادبیات فارسی کے حصے)
۹	قبل از مغل ہندوستان میں فارسی (انگریزی)	ایم۔ اے۔ غنی
۱۰	ادب فارسی	زین العابدین موتمن
۱۱	تحول شعر فارسی	״ ״ ״
۱۲	ارمغان پاک	ڈاکٹر شیخ محمد اکرام
۱۳	رود کوثر	״ ״ ״
۱۴	پاکستان میں فارسی ادب (ج ۱)	ڈاکٹر ظہیر الدین احمد
۱۵	تذکرہ شعرائے پنجاب	لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید
۱۶	تذکرہ شعرائے کشمیر (۱ + ۳ جلد تکملہ)	مؤلفہ پیر سید حسام الدین راشدی
۱۷	ادب نامہ ایران	مقبول بیگ بدخشانی
۱۸	تاریخ ادبیات ایران	استاد ڈاکٹر رضا زادہ شفق۔
۱۹	گنج سخن (۳ جلد)	استاد ڈاکٹر صفا۔
۲۰	سبک خراسانی در شعر فارسی	استاد ڈاکٹر محمد جعفر محجوب
۲۱	مقالات منتخبہ مجلہ دانشکدہ خاور شناسی	مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور
	تعلیقات: مرتبہ ڈاکٹر سید عبدالشکور احسن، نذیر الحسن عابدی اور ڈاکٹر محمد بشیر حسین	
۲۲	ماہنامہ ہلال کراچی	شمارہ ۱ جنوری تا جولائی ۱۹۷۲ء

۲۳ ۔ قبل از مغلیہ دور میں کشمیر کے فارسی شاعر (انگریزی) ڈاکٹر محمد ظفر خان

۲۴ ۔ ماہنامہ ادبی دنیا کشمیر نمبر ۱۹۶۶ء

۲۵ ۔ فارسی ادب وادی کشمیر میں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری۔

۲۶ ۔ مجلہ دانش کدہ ادبیات تہران شمارہ ۳ سال دوم۔ ۳،۴ سال ششم۔ ۳ سال ہفتم۔ ۴،۳ سال ہشتم اور ۳ سال دہم۔

پیش گفتار

اردو میں فارسی ادب کی تاریخ کے موضوع پر کتابوں کی کوئی ایسی کمی نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے بیشتر کتابیں کسی ایک ملک کی ادبیات، یا کسی مخصوص دور یا چند اہم شعراء کے ذکر تک محدود نظر آتی ہیں۔ فارسی زبان و ادب کے زمانی و مکانی پھیلاؤ میں اس محدودیت کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر کتاب قدیم ترین ایام سے دورِ حاضر تک، ایران اور برصغیر پاک و ہند کے فارسی ادبیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ گو فارسی ادب کی قلمرو اس کتاب کے دائرہ کار سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس میں افغانستان، روس کی فارسی زبان ریاستوں اور بھارت کے معاصر فارسی ادب کا بیان شامل نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ موجودہ کتاب کی تنگ دامانی ہی کہی جا سکتی ہے۔

سلیم اختر صاحب نے تو اردو ادب کے دریا کو "مختصر ترین تاریخ" کے کوزے میں بند کر لیا لیکن فارسی کے ضمن میں دریا بہ حباب اندر" کرنا کافی دشوار معلوم ہوا۔ فارسی ادب کے ہزار سالہ دور کی تاریخ کو سمیٹنا آسان کام نہیں تھا تاہم فارسی کے نامور شعراء و ادباء اور اہم کتب کے بارے میں اختصار کے ساتھ ضروری معلومات اس تالیف میں یکجا کر دی گئی ہیں۔

کتاب کی تدوین میں ایرانی و غیر ایرانی فضلا کی تحقیقات سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اردو کے مقابلے میں فارسی میں ادب کا تصور زیادہ وسعت کا حامل ہے یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں خالص ادبی کتب کے ساتھ ساتھ علوم و فنون اور تذکرہ و تاریخ کی کتابوں کا ذکر بھی ملے گا۔

یہ کتاب ڈاکٹر محمد ریاض صاحب اور راقم الحروف کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ قدیم ترین ایام سے خوارزمشاہیوں تک کے ایران اور مغلیہ سلطنت کے قیام سے پہلے ہندوستان کے فارسی ادب کا حصہ راقم نے لکھا اور ڈاکٹر محمد ریاض صاحب نے مغلوں سے عہد حاضر تک کے ایرانی اور مغلیہ سلطنت کے قیام سے موجودہ زمانے تک کے برصغیر کے فارسی ادب کی تاریخ لکھی۔ امید ہے کہ یہ کتاب فارسی زبان سے دلچسپی رکھنے والے عام شائقین اور طلبہ کے لئے یکساں طور پر مفید ثابت ہوگی۔ اہل علم سے توقع ہے کہ وہ مؤلفین کو اپنی مشفقانہ راہنمائی سے محروم نہیں رکھیں گے۔ ان کی سرپرستی ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ہوگی۔

ہم نذیر احمد صاحب (مالک مطبوعات سنگ میل) کی ہمت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے کاغذ کی اس واقعی ہوشربا اور حوصلہ شکن گرانی میں اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

ڈاکٹر محمد صدیق خان

اسلام آباد

۵ر فروری ۱۹۷۴ء

باب اوّل

ابتدا سے سلاجقہ و خوارزمشاہیوں تک

فارسی زبان کا ارتقاء

(قبل از اسلام ایرانی زبان وادب)

فارسی زبان نے موجودہ شکل کم و بیش تیسری صدی ہجری میں اختیار[ل] کی لیکن یہ ایک آریائی زبان ہے اور اس کی تاریخ تو ایران میں آریوں کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ ایران میں آریوں کا داخلہ آج سے تقریباً ۴۰۰۰ سال قبل شروع ہوا، اور یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا لیکن جدید ترین تحقیقات کے مطابق ایران میں مقیم دو آریائی قبیلوں کا ذکر پہلی بار آشوری بادشاہ شلم نصر کے ایک کتبے میں ۸۳۶ ق م کے لگ بھگ ملتا ہے۔ یہ دو قبیلے ماد اور پارس تھے۔ ماد پہلا خاندان ہے جس نے ۷۰۰ ق م میں ایران کے اندر ایک آریائی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ ایرانی پیغمبر زرتشت قوم ماد ہی میں پیدا ہوا۔ اور اس کی کتاب اوستا کی زبان انہی کی زبان ہے۔ اس نظریے کو عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا کیونکہ اوستا میں ایسے داخلی شواہد موجود ہیں جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب شمال مشرقی ایران میں لکھی گئی۔ یہ اسی زبان میں لکھی گئی جو شمال مشرقی ایران میں اس وقت رائج تھی۔ یہ مادی زبان نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ لوگ تو ایران کے مغربی حصے میں آباد تھے ان کا پایہ تخت ہمدان کا موجودہ شہر تھا۔ مادی زبان جو سرمایہ ہم تک پہنچا ہے وہ چند ناموں سے زیادہ نہیں ہے۔

ل۔ تاریخ ادبیات در ایران۔ ص: ۱۴۰

اوستائی زبان: یہ ایران کی قدیم ترین زبان ہے۔ اس کی قدامت کا تعین زرتشت کے زمانے ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس مسئلے پر محققین میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے اور زرتشت کی پیدائش بعض کے خیال میں ۱۱۰۰ ق م اور بعض کے نزدیک ۱۰۰۰ ق م ہوئی۔ ۶۰۰ ق م پر اب زیادہ لوگ متفق ہیں۔ اوستا اس پیغمبر پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب کا نام ہے۔ گاتھا اوستا کا سب سے اہم حصہ ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ زرتشت کا اپنا کلام ہے۔ ایرانیوں کی یہ مقدس کتاب بیلوں کی چار سو کھالوں پر لکھی ہوئی تھی۔ لیکن ہخامنشی دور میں سکندر اعظم کے حملے میں یہ کھالیں ضائع ہوگئیں۔ موجودہ اوستا کی جمع و تدوین کا کام اشکانی بادشاہ بلاش سوم ۱۴۸ - ۱۹۱ء کے زمانے میں شروع ہوا اور ساسانی عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ اوستا یسنا، یشت، وندیداد، ویسپرد اور خردہ اوستا ــــ پانچ حصوں اور ۸۳۰۰۰ کلمات پر مشتمل ہے۔ اس کا خط دنیا کا مکمل ترین خط ہے۔ ہخامنشی عہد میں دین زرتشت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس شاہی خاندان کا تعلق اہل پارس سے تھا یہ بھی ماد ہی کی طرح آریائی خاندان تھا۔ ہخامنشی قبیلہ ماد پر غلبہ حاصل کرکے برسر اقتدار آیا اور انہوں نے ۵۵۰ ق م سے ۳۳۰ ق م تک حکومت کی۔ کوروش اور داریوش جیسے عظیم بادشاہوں کا تعلق اسی سلسلے سے تھا۔ ہخامنشیوں نے اپنی دلاوری سے حدود سلطنت کو وسعت بخشی اور اپنی ذہانت اور تدبر سے ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے شاندار کارنامے انجام دیئے اور اپنے کارناموں کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے حدود مملکت کے اندر مختلف مقامات پر کئی زبانوں میں چٹانوں پر کندہ کرایا۔ ان میں سے بیشتر کتبے ایرانی زبان میں ہیں۔ اس زبان کو فرس قدیم یا فارسی باستان کہا جاتا ہے۔ یہ اس عہد کی ادبی زبان تھی۔ یہ اوستائی زبان سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ دونوں زبانیں کسی ایک زبان کی شاخیں معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں کے قواعد صرف و نحو ملتے جلتے ہیں۔ اس مشابہت کے باوجود دونوں زبانیں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں۔ یہی دونوں زبانیں فارسی کا نقش اولین کہی جاسکتی ہے۔

ہخامنشی دور کے کتبے میخی خط میں لکھے گئے ہیں۔ چٹانوں اور پتھروں کے علاوہ تختیوں، برتنوں اور مہروں پر بھی اس عہد کی تحریریں ملتی ہیں۔ ہخامنشی کتبے تخت جمشید (نزد شیراز) نقش رستم، نقش رجب اور بیستون (نزد کرمانشاہ) میں پائے گئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اور اہم بیستون میں داریوش کا کتبہ ہے۔ ان کتبوں میں خدا، اور بادشاہ کی تعریف کے ساتھ ہخامنشی فتوحات کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ خط میخی قدیم زمانے میں بابل اور نینوا میں رائج تھا۔ ایران میں یہ خط وہاں سے ہی آیا۔ یہ خط صرف چٹانوں، دیواروں یا برتنوں پر حروف کندہ کرنے کے کام آتا تھا۔

فارسی باستان کے جو کتبے خط میخی میں ملے ہیں ان میں استعمال ہونے والے الفاظ کی تعداد چار سو سے زیادہ نہیں ہے۔ اس مشکل خط کو پڑھنے میں گروٹ فنڈ، ریس، ایرکوف اور ہنری راؤلنسن کی محققانہ کاوشیں قابلِ ذکر ہیں۔

۳۳۰ ق م میں سکندر اعظم کے ہاتھوں ہخامنشی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور ایران پر ۸۰ سال تک سکندر کے جانشین "سلوکی" قابض رہے۔ اس تمام عرصے میں، ایران میں یونانی زبان و تمدن کو غلبہ حاصل رہا اور اس طرح ایرانی زبان کی ترقی رک گئی۔ مشرقی ایران کے علاقے "پرتو" یا "پارتھیا" کے بہادر لوگوں نے ایران کو یونان کے سلوکی حکمرانوں سے آزاد کرایا۔ ۲۴۹ ق م میں ارشک یا اشک اول نے اشکانی خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان نے ۲۲۶ء تک تقریباً پانچ سو سال تک حکومت کی یہ لوگ چونکہ صحرانشین اور علم و فضل سے بیگانہ تھے اس لئے وہ ایک عرصہ تک یونانی تمدن کے زیرِ اثر رہے۔ بعض اشکانی بادشاہ تو حامیٔ یونان کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

اشکانیوں کے عہد میں بالآخر پہلوی زبان نے یونانی زبان کی جگہ لی۔ یہ پارتھیا والوں کی زبان تھی "پرتو" ہی بدل کر "پہلو" یا "پہلو" بنا اسی نسبت سے وہاں کی زبان پہلوی کہلائی۔ یہ زبان اگرچہ ایک خاص علاقے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ایرانی زبان تھی بلکہ یہ اوستائی زبان اور فارسی باستان کا نسبتہً ایک نیا روپ تھا۔ یہ زبان ایران کے بیشتر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اشکانی بادشاہ فرہاد چہارم کے زمانے میں پہلوی کے لئے ایک خاص خط بھی وضع ہوا یہ خط آرامی رسم الخط سے ماخوذ تھا۔ "ایادگار زریران" اور "درخت آسوریگ" تیسری صدی کی پہلوی تصانیف ہیں۔ فرانسیسی مستشرق (E. BENVENISTE) کے خیال میں یہ دونوں کتابیں منظوم ہیں۔

اشکانیوں کے بعد ساسانیوں نے ایران پر تقریباً ۴۰۴ سال تک حکومت کی۔ ان کے دورِ حکومت میں ایران کو پھر سے عہد ہخامنشی کی سی عظمت نصیب ہوئی۔ زرتشتی مذہب کو دوبارہ فروغ حاصل ہوا۔ آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم نے عرب مجاہدین سے شکست کھائی اور ایران پر عرب قابض ہوگئے۔ اشکانی عہد میں پہلوی زبان کو جو ترقی نصیب ہوئی تھی وہ اس دور میں بھی جاری رہی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ تبدیلیاں بھی آگئیں۔ ساسانی پہلوی کو فارسی میانہ بھی کہتے ہیں۔

موجودہ فارسی کا ارتقا اسی زبان سے ہوا۔ فارسی اور پہلوی ایک دوسرے سے اتنی مشابہ ہیں کہ اگر فارسی سے عربی الفاظ نکال دیے جائیں تو وہ پہلوی زبان سے بہت قریب پہنچ جاتی

ہے۔ ساسانی بادشاہوں کے کتبوں، مہروں اور سکوں پر تحریریں اسی زبان میں مرقوم ہیں۔ پہلوی زبان میں ایک وسیع سرمایۂ ادب موجود ہے۔ پہلوی میں ادب کا سلسلہ اشکانی عہد سے شروع ہوا، اور عربوں کے ایران پر تسلط کے بہت بعد تک جاری رہا۔ بیشتر پہلوی تصانیف کا تعلق دین زرتشت سے ہے۔ ملک الشعراء بہار مرحوم نے اپنی کتاب سبک شناسی جلد اول میں دینی، اخلاقی اور ادبی موضوعات پر تقریباً ۱۰۱ پہلوی کتب کے نام گنوائے ہیں۔ ان میں نثر اور نظم دونوں کی کتابیں شامل ہیں۔ ساسانیوں کے عہد میں بہت سی کتب یونانی اور سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں بھی ہوا۔ ان میں کلیلہ ودمنہ اور الف لیلہ قابل ذکر ہیں۔

پہلوی زبان کا رسم الخط بہت ہی مشکل تھا۔ یہ دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا۔ اس میں صرف ۲۵ حروف تھے۔ بعض حروف کئی کئی آوازوں کے لئے استعمال ہوتے تھے اس لئے اس کا لکھنا اور پڑھنا دونوں بہت مشکل تھا۔ چونکہ یہ خط آرامی سے ماخوذ تھا۔ اس لئے پہلوی میں بعض کلمات کا املا تو آرامی ہی رہا لیکن ان کو پڑھا پہلوی میں جاتا تھا۔ مثلاً عشر (عشر) لکھا جاتا تھا لیکن پڑھا "دہ" جاتا تھا۔ اس قسم کے الفاظ کو اصطلاح میں "ہزوارش" کہا جاتا ہے۔ ان کی تعداد پہلوی میں ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ ایران میں عربوں کی حکومت کے بعد پہلوی خط آہستہ آہستہ متروک ہو گیا۔ ایرانی مسلمان ہوتے گئے۔ پہلوی خط کے ساتھ ان کی پہلی سی وابستگی باقی نہ رہی۔ علاوہ ازیں عربی خط اس سے بہت آسان تھا اور اسے اپنا لیا گیا۔

فارسی ادبیات کا آغاز

۲۱ھ میں جنگ نہاوند میں ایرانیوں کی شکست کے بعد ایران علاقہ عربوں کے قبضے میں آ گیا۔ یہ قبضہ تیسری صدی ہجری میں ایران میں خود مختار ایرانی ریاستوں کے قیام تک برقرار رہا۔ خلافت عباسی میں ایرانیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ ایک ایرانی سردار ابو مسلم خراسانی نے عباسی خلافت کے قیام میں شاندار خدمات انجام دیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عباسیوں نے اپنے اس محسن کو بھی قتل کرا دیا۔ عباسیوں کے نامور وزراء کا برمکی خاندان بھی ایرانی الاصل تھا۔ ہارون الرشید کے جانشین مامون کی ماں ایرانی نژاد تھی اسی لئے امین و مامون کی جنگ تخت نشینی میں ایرانیوں نے مامون کا ساتھ دیا۔ اس کے صلے میں مامون نے اپنے جرنیل طاہر ذوالیمینین کو خراسان کی امارت

بخشی اور طاہر نے خود مختاری کا اعلان کر کے ایران میں عربوں کے تسلط کے بعد ۲۰۵ھ میں پہلی ایرانی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد ایران کے مختلف حصوں میں صفاریوں (۲۵۴-۲۹۰ھ) سامانیوں (۲۰۴-۳۸۹ھ)، دیلمیوں (۳۹۸-۴۴۳ھ) اور زیاریوں (۳۱۶-۴۳۴ھ) کی حکومتیں قائم ہوئیں۔

جدید ایرانی مورخین کا خیال ہے کہ ایرانیوں نے عربوں کے تسلط سے آزاد ہونے کی کوششیں ہمیشہ جاری رکھیں اس لحاظ سے وہ عربوں کے خلاف ہونے والی تمام شورشوں کا تعلق ایران کی تحریک آزادی سے جوڑتے ہیں لیکن تاریخی واقعات کی یہ توجیہ حد سے بڑھی ہوئی قوم پرستی کا نتیجہ ہے۔

عربوں کی فتح ایران اپنے دور رس اثرات کی بدولت بڑی اہمیت کی حامل ہے اس سے ایرانی شہنشاہیت کا تسلسل منقطع ہو گیا۔ اور ایران، وسیع اسلامی مملکت کا ایک صوبہ بن کر رہ گیا۔ ایرانیوں کی غالب اکثریت حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔ کچھ لوگ اپنے پرانے دین پر بھی قائم رہے

ان لوگوں نے ایران قدیم کے مذہبی اور ثقافتی ورثے کو نابود ہونے سے بچا لیا۔ انھوں نے پہلوی ادب میں گرانقدر اضافے کئے اور یہ سرمایہ بعد کے ادیبوں اور شاعروں کے بہت کام آیا۔ بعض زرتشتی ترک وطن کر کے ہندوستان چلے آئے۔

ایران میں اسلام کی اشاعت اور عربوں کی حکومت کی وجہ سے عربی زبان کو بھی رواج حاصل ہوا۔ بہت سی دینی اور دفتری اصطلاحات عربی سے ایرانی بولیوں میں داخل ہوئیں۔ آسان عربی خط نے پیچیدہ پہلوی خط کی جگہ لی۔ اسی دور میں مشرقی ایران کے علاقوں خراسان اور ماوراء النہر کی زبان، ادبی زبان بنی اور پارسی یا پارسی دری کہلائی۔ دری کا لفظ "در" سے منسوب ہے اور پہلوی میں "در" کا ایک معنی دربار یا بارگاہ شاہی ہے یعنی وہ زبان جو درباری اور سرکاری ہو اس زبان کا تعلق چونکہ شاہی دربار سے رہا اس لئے فارسی کو دری کہا گیا۔ ویسے بھی ایرانی چونکہ شاہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ ہر اچھی چیز کو شاہ یا اس سے منسوب کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان دری فصیح فارسی کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ایران کے انہی مشرقی علاقوں میں خود مختار ایرانی ریاستیں قائم ہوئیں اور انھی کی سرپرستی میں فارسی ادب کا آغاز ہوا۔ ادبیات فارسی کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانوں کی طرح فارسی میں بھی شعر پہلے کہے گئے، اور نثر بعد میں لکھی گئی۔

پہلا فارسی شاعر:- دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح فارسی میں یہ بھی مسئلہ بھی خاصا اختلافی ہے کہ فارسی کا پہلا شاعر کون تھا۔ جہاں تک فارسی میں شعر کہنے

کی شعر گوئی کی کوششوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ساسانی بادشاہ بہرام پنجم، حکیم ابو حفص سغدی، عباس مروزی، حنظلہ بادغیسی اور محمد بن وصیف کے نام ملتے ہیں۔ علامہ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی مرحوم کی تحقیقات کے مطابق فارسی کے قدیم ترین اشعار، عربی شاعر یزید بن مفرغ کے وہ ہجو یہ شعر ہیں جو اس نے عباد بن زیاد حاکم سیستان کے متعلق لکھے یہ اشعار ۶۰ - ۶۴ھ کے درمیان لکھے گئے۔ علامہ موصوف نے فارسی کے چند ایسے اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے، جو خراسان میں ۱۰۸ھ کے لگ بھگ بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔ لیکن ان کے کہنے والے یا ان کے کہنے والوں کا علم نہیں ہے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کے نزدیک بہرام گور نے جو شعر کہے وہ فارسی کی بجائے پہلوی میں ہوں گے۔ تذکرہ نویسوں نے ان میں تصرفات کر کے انہیں فارسی شعر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے بہرام گور فارسی کا پہلا شاعر نہیں ہو سکتا۔ ابو حفص سغدی ایران کا مشہور موسیقی دان تھا۔ اس نے ۳۰۰ھ میں ایک ساز "شہرود" ایجاد کیا۔ ۲۰۰ھ سے پہلے تو بہت سے فارسی کے شعراء کے نام ملتے ہیں۔ لباب الالباب کے مصنف عوفی نے لکھا ہے کہ جب خلیفہ مامون الرشید پہلی دفعہ مرو آیا تو ابو العباس مَرْوَزی نے خلیفہ کی شان میں ایک فارسی قصیدہ لکھا اور انعام پایا۔ علامہ قزوینی کے خیال میں اس قصیدے میں زبان و بیان کی جو پختگی نظر آتی ہے اس کی وجہ سے اسے فارسی کے سب سے پہلے شاعر کا کلام تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

استاد جلال الدین ہمائی نے تاریخ سیستان کے حوالے سے لکھا ہے کہ فارسی زبان کا سب سے پہلا شاعر محمد بن وصیف سیستانی ہے جس نے یعقوب بن لیث صفاری کی شان میں ۲۵۱ھ میں ایک فارسی قصیدہ کہا۔ صاحب چہار مقالہ نے حنظلہ بادغیسی کا نام قدیم ترین شعرائے فارسی میں لیا ہے۔ ڈاکٹر صفا کی تحقیق کے مطابق حنظلہ کا زمانہ محمد بن وصیف سے پہلے کا ہے لیکن انہوں نے حنظلہ سے منسوب اشعار کی صحت میں شبہ کا اظہار کیا ہے۔ بہر کیف فارسی کے اولین شعراء میں محمد بن وصیف اور حنظلہ کا نام لیا جا سکتا ہے اور تیسری ہجری کے نصف اوّل کو فارسی شاعری کا نقطہ آغاز اور طاہری و صفاری ادوار کو فارسی شاعری کا پہلا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔

طاہری دور (۲۰۵ - ۲۵۹ھ)

اس خاندان کا بانی طاہر ذوالیمینین عباسی خلیفہ مامون الرشید کا جرنیل تھا۔ اس نے مامون کے بھائی امین کو شکست دی اور اس کے صلے میں خراسان کی امارت پائی۔ اس طرح ایران پر عربوں کے تسلط کے بعد ایرانی حکومت قائم ہوئی۔ طاہریوں کا دار الحکومت نیشاپور فارسی ادب کا پہلا مرکز بنا۔

حنظلہ بادغیسی :- یہ طاہری دور کا مشہور ترین شاعر تھا۔ چہار مقالہ کے مصنف کے قول کے مطابق یہ ایک جید دیوان شاعر تھا۔ احمد بن عبداللہ خجستانی جو پہلے خرکار تھا حنظلہ کے ان اشعار سے متاثر ہوا اور وہ خراسان کی امارت تک پہنچا ؎

مہتری گر بکام شیر در است   شو خطر کن ز کام شیر بجوی
یا بزرگی و عز و نعمت و جاہ   یا چو مردانت مرگ رویاروی

حنظلہ کی وفات ۲۱۹ - ۲۲۰ھ میں بتائی جاتی ہے لیکن ڈاکٹر صفا کی تحقیق کے مطابق یہ شاعر تیسری صدی کے نصف اول میں زندہ تھا۔

صفاری دور

اس خاندان کا بانی یعقوب بن لیث تھا۔ اس کے آباؤ اجداد صفار (ٹھٹھیرے) تھے بعض محققین صفاریوں کا سلسلہ نسب ساسانیوں سے ملاتے ہیں۔ یعقوب نے معمولی درجے سے ترقی کر کے سیستان پر قبضہ کر لیا۔ پھر کرمان، ہرات، بلخ اور خراسان فتح کر لئے اور خلافت بغداد کے لئے اس کا وجود خطرہ بن گیا۔ یعقوب کے بعد اس کا بھائی عمرو لیث بادشاہ بنا اور اس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ صفاری خاندان کی حکومت اسمٰعیل سامانی کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

صفاری عہد فارسی زبان و ادب کے حق میں بہت سازگار ثابت ہوا۔ یعقوب لیث چونکہ خود ایک ایسے دور، ایرانی داستانوں کے مرکز سیستان میں پیدا ہوا تھا۔ اسے ایرانی روایات سے بڑی محبت تھی۔ وہ عربی زبان نہیں جانتا تھا۔ تاریخ سیستان کی روایت کے مطابق شعراء اس کی شان میں عربی قصائد کہتے تھے لیکن یہ انہیں سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے شعراء سے کہا کہ جو زبان میں سمجھ نہیں سکتا اس میں تم میرے قصیدے کیوں کہتے ہو۔ اس نے اپنے دبیر محمد بن وصیف کو فارسی میں شعر کہنے کا حکم دیا۔ اس کی تقلید میں دوسرے شعراء نے فارسی میں شعر کہے۔ دوسرے شعراء میں محمد بن مخلد، بسام کرد خارجی، فیروز مشرقی اور ابو سلیک گرگانی قابل ذکر ہیں۔ اگر محمد بن وصیف کو فارسی کا پہلا شاعر مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ فارسی شاعری کا آغاز عربی شاعری کی پیروی میں قصیدہ گوئی سے ہوا۔ بدقسمتی سے اس دور کے شعراء کا پورا کلام ہم تک نہیں پہنچا۔ البتہ تذکروں اور تاریخ کی کتب سے اس دور کے پچاس کے قریب شعر ملے ہیں۔ ان اشعار کا موضوع مدح، پند اور عشق ہے۔ زبان کی قدامت، بیان کی ناپختگی اور عروض

ترالی کی غلطیاں اس دور کے اشعار میں عام ہیں۔

صفاری شعرا

محمد بن وصیف محمد بن وصیف صفاریوں کا ایک لائق اور ذہین دبیر تھا۔ وہ اس خاندان کا وفادار ملازم تھا۔ اس نے ۲۵۱ھ میں یعقوب کی فتح ہرات پر ایک زوردار قصیدہ فارسی میں کہا۔ ۲۸۳ھ میں رافع بن ہرثمہ کے قتل پر ایک قطعہ کہا۔ عمرو بن لیث جب اسمٰعیل سامانی کے ہاتھوں ۲۸۷ھ میں قید ہوا تو اس نے اسمٰعیل کی خدمت میں اس کی رہائی کیلئے ایک پُر درد قطعہ لکھا۔ وہ اس خاندان کی خوشی اور غم میں ہمیشہ شریک رہا۔ محمد بن وصیف کی فارسی شاعری کا آغاز ۲۵۱ھ سے ہوا۔ یہ سلسلہ اس کی وفات ۲۹۷ھ تک یعنی چھیالیس سال جاری رہا لیکن اس کے صرف تئیس ۲۳ شعر دستیاب ہوئے ہیں۔

نمونۂ کلام

ای امیری کہ امیران جہاں خاصہ و عام — بندہ و چاکر و مولای و سگ بند و غلام

ازلی خطی در لوح کہ ملکی بدھید — بہ ابی یوسف یعقوب بن اللیث ہمام

بسام کرد خارجی یہ شخص خارجیوں کے ساتھ صلح کے لئے یعقوب بن لیث کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی محمد بن وصیف کی پیروی میں فارسی شعر کہے۔ عمار خارجی کے قتل پر اس کا ایک فارسی قطعہ ملتا ہے۔

نمونۂ کلام:-

ہر کہ حرم کرد عرب را خدای — عہد ترا کرد حرم در عجم

ہر کہ درآمد ہمہ باقی بشدند — باز فنا شد کہ ندید این حرم

فیروز مشرقی: یہ بھی اس عہد کا ایک معروف شاعر تھا اور عمرو بن لیث ۲۶۵۔ ۲۸۷ھ کا معاصر تھا۔ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے فارسی شاعری کو جلا بخشی۔

نمونۂ کلام:-

بہ خط و آن لب و دندانش بنگر — کہ ہموارہ مرا دارند در تاب

یکی ہمچون برات در اوج خورشید — یکی چون شایورد از گرد مہتاب

ابو سلیک گورگانی بھی عمرو بن لیث کا معاصر تھا۔ غزنوی دور کے مشہور شاعر منوچہری نے اس کو شمار خراسان کے عظیم شعرا میں کیا ہے۔

نمونۂ کلام :-

خون خود را گر بریزی بر زمین — بہ کہ آب روی ریزی در کنار
بت پرستیدن بہ از مردم پرست — پند گیر و کار بند و گوش دار

سامانی دور

عباسی خلیفہ مہدی کے زمانے میں، بلخ کا ایک رئیس سامان خدا حاکم خراسان اسد بن عبداللہ کے حُسن سلوک سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا اور اس نے اپنے ایک بیٹے کا نام اپنے محسن کے نام پر اسد رکھا۔ اسی اسد کے چار بیٹوں نے خراسان میں امن و امان قائم رکھنے میں خلیفہ مامون الرشید کی بڑی مدد کی۔ اور اس کے صلے میں ان چاروں بھائیوں میں احمد کو فرغانہ، یحییٰ کو چاچ، الیاس کو ہرات اور نوح کو سمرقند کی حکومت ملی۔

ان بھائیوں میں احمد سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے اپنے بھائی نوح کی وفات کے بعد سمرقند اور کاشغر کے علاقے بھی اپنی حکومت میں شامل کر لئے۔ نصر احمد کا جانشین ہوا اور نصر کے بھائی اسمٰعیل نے عمرو بن لیث کے بیٹے کو شکست دے کر صفاریوں کی حکومت ختم کر دی۔ سامانی خاندان کی اصل حکومت کا آغاز اسمٰعیل کے دور ہی سے ہوتا ہے۔ اس نے بخارا کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اسمٰعیل کے بیٹے نصر کا دور علم و ادب کی ترقی کے باعث ایک

ئے طوق ماہ

خاص امتیاز رکھتا ہے۔ ۳۸۹ھ میں ترک سردار بغرا خاں نے بخارا پر قبضہ کر لیا۔ اور آخری سامانی تاجدار عبدالملک کو قیدی بنا لیا۔ عبدالملک کی موت اسی حالت میں واقع ہوئی۔

فارسی شاعری کو جو فروغ سامانی عہد میں نصیب ہوا اس کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ سامانیوں کے اقتدار کے ساتھ فارسی شاعری کی صبح صادق طلوع ہوئی۔ اس تمام ترقی کی وجہ یہ ہے کہ شعر دوست اور علم پرور سامانی بادشاہ فارسی زبان اور اس کی ترویج میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ شعراء اور ادبا کو گرانقدر صلے عطا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے وزراء مثلاً جیہانی ابوالفضل بلعمی اور ابو علی بلعمی کی کوششیں بھی اس عہد میں فارسی ادبیات کی ترقی میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس ترقی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ عوفی نے اپنے تذکرے میں ستائیس شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ جن کا تعلق سامانی دور سے تھا۔ اس عہد میں شعراء کی کثرت کے باوجود ان کا کلام محفوظ نہیں رہا۔ وہ اڑھائی ہزار کے قریب اشعار تذکرہ و تاریخ اور جغرافیہ

لغت کی کتابوں سے جمع کئے گئے ہیں جن میں سے تقریباً ایک ہزار اشعار رودکی کے ہیں۔

فارسی شاعری کا آغاز عربی شاعری کی تقلید میں قصائد سے ہوا تھا۔ سامانی دور کے پہلے شعراء کے سامنے عربی شعراء کا کلام تھا۔ وہ اس کی پیروی کرتے رہے لیکن اس عہد میں بقول ڈاکٹر محمد جعفر محجوب فارسی شاعری نے ایک حد تک عربی شاعری کے اثر سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ فارسی شعراء نے عربی بحروں میں اپنے ذوق کے مطابق بحروں کا انتخاب کیا اور ان میں تصرفات بھی کئے۔ اس دور میں بعض نئی اصناف سخن مثلاً مثنوی، رباعی اور دوبیتی کو رواج حاصل ہوا۔ عربی شاعری میں ان اصناف کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ دوبیتی اور رباعی سے پہلے ایرانی ادب میں موجود تھی اور دوبیتیوں کو فہلویات کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر محجوب نے اس عہد میں لکھی جانے والی مثنویوں کی تعداد سینتیس ۳۷ بتائی ہے۔ اس دور کے شعراء کے کلام میں عربی الفاظ کا استعمال بھی نسبتاً کم ہوا ہے۔

سامانی دور کی غزل کی لطافت اور روانی کو بہت سراہا گیا ہے۔ مشہور غزنوی شاعر عنصری نے رودکی اور دقیقی نے شہید بلخی کی غزل کی بہت تعریف کی ہے لیکن یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ اس زمانے میں غزل قصیدے کا ہی حصہ تھی یا اس سے الگ ہو کر ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ قدیم شعراء کے ہاں غزل اور تغزل کا مطلب قصیدہ کی تشبیب بھی ہے۔ ممکن ہے اس دور کی غزل سے مراد تشبیب ہی ہو۔

شاہنامہ: اس عہد کا شاعر مسعودی مَروَزی اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ فارسی کا پہلا شاعر ہے جس نے شاہنامہ لکھا، اسی عہد کے ایک اور شاعر دقیقی نے بھی اس طرف توجہ کی اس طرح فارسی کے عظیم شاہکار شاہنامہ فردوسی کی بنیاد اسی دور میں رکھی گئی۔ شاعری کا ایک اور موضوع جو اس عہد میں شروع ہوا وہ حکمت و موعظت ہے اس اعتبار سے کسائی مروزی، حکیم ناصر خسرو قبادیانی کا پیشرو تھا۔ سامانی شعراء سے پہلے کسی فارسی شاعر نے زبان و قلم کو ہجو و ہزل سے آلودہ نہیں کیا تھا لیکن اس دور کی شاعری کا دامن ہجو و ہزل سے بھی داغدار نظر آتا ہے۔ فارسی میں مرثیے بھی سب سے پہلے انہی شعراء کے ہاں نظر آتے ہیں۔ رودکی نے تو اپنی جوانی کا بھی مرثیہ لکھا۔ سامانی شعراء کے ہاں نحو و طرز بیان کی سادگی پائی جاتی ہے۔ ان کے قصائد عام طور پر مبالغے سے خالی ہیں اور ان کی کہی ہوئی ہجویات میں اعتدال موجود ہے۔ ان کے ہاں کہیں کہیں صنائع بدائع کا استعمال بھی ملتا ہے۔ ردیف کی طرف ان کی توجہ زیادہ دلچسپ ہے

سامانی دور کے شعراء

ابوشکور بلخی اصل نام کسی جگہ نہیں ملتا۔ یہ اپنی کنیت سے ہی مشہور ہے۔ اس کو فارسی کا اولین مثنوی نگار قرار دیا گیا ہے اس نے اپنی مثنوی آفرین نامہ ۳۳۲-۳۳۶ھ کے درمیان مکمل کی۔ اس کے علاوہ اس نے دو مثنویاں اور لکھیں۔ ابوشکور کے قصائد و قطعات کے متفرق اشعار کتب تذکرہ و لغت میں ملتے ہیں۔ محمد دبیر سیاقی نے اپنی کتاب گنج بازیافتہ میں ابوشکور کے ۴۳۸ اشعار جمع کئے ہیں۔ اس شاعر کو فلسفے سے بھی رغبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نام کے ساتھ لفظ حکیم لکھا جاتا ہے۔ اس کے کلام میں بھی حکیمانہ رنگ غالب ہے۔
ابوشکور کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا نصف اول تسلیم کیا گیا ہے۔

نمونۂ کلام :-

— تا بدانجا رسید دانش من	کہ بدانم همی کہ نادانم
— خردمند گوید خرد پادشاست	کہ بر خاص و بر عام فرمانرواست
— جهان را بدانش توان رشتن	بدانش توان رشتن و بافتن

شہید بلخی ابوالحسن شہید بن حسین وراق اپنے عہد کا بلند پایہ فلسفی اور متکلم تھا۔ اس نے مشہور عالم ابوبکر محمد بن زکریا رازی کے ساتھ مناظرے کئے۔ فرخی نے شہید کی خوشنویسی کی بھی تعریف کی ہے۔ رودکی نے اس کی وفات پر اس کا مرثیہ لکھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا انتقال ۳۲۹ھ (رودکی کا سال وفات) سے پہلے ہو گیا تھا۔ شہید عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ مختلف کتابوں سے دستیاب ہونے والے اس کے فارسی اشعار سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ اشعار رباعی، دوبیتی، مثنوی، قصیدہ اور قطعہ کی صورت میں ملتے ہیں۔ شہید کی غزل کو بعد کے شعراء نے بہت سراہا ہے۔

نمونۂ کلام :-

اگر غم را چو آتش دود بودی	جہاں تاریک بودی جاودانہ
دریں گیتی سراسر گر بگردی	خردمندی نیابی شادمانہ

رودکی استاد ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی تیسری صدی ہجری کے وسط میں سمرقند کے علاقہ "پنج رودک" میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنا تخلص اپنے قصبہ رودک کی نسبت سے رکھا۔ اس کا رود (ایک ساز) سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اکثر شعراء اور تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے

کہ رودکی اندھا تھا۔ بعض کو خیال تھا کہ وہ مادر زاد اندھا تھا۔ استاد سعید نفیسی مرحوم نے رودکی کے کلام سے تشبیہات کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن کا کہنے والا مادر زاد اندھا نہیں ہو سکتا مثلاً ایک نظم میں رودکی نے نقشہ کھینچا ہے کہ میں نے بہ چشم خود دیکھا اس کا رنگ ایسا تھا۔ لیکن استاد بدیع الزماں فروزانفر مرحوم نے اس دلیل سے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے عربی کے ایک مادر زاد اندھے شاعر بشار بن برد کے دیوان سے ایسی متعدد مثالیں دی ہیں جن میں شاعر دیکھنے اور رنگوں کی بات کرتا ہے یا ایسی تشبیہیں دیتا ہے۔ جن کا تعلق بصارت سے ہے۔ استاد فروزانفر کے خیال میں مادر زاد اندھا شاعر اپنے تخیل کے زور سے اور طرز بیان کے عام سانچوں کو استعمال کرتے ہوئے ایسی باتیں کہہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صفا نے بھی رودکی کو مادر زاد اندھا لکھا ہے۔

کہتے ہیں رودکی نے آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ آواز اچھی تھی۔ موسیقی میں مہارت رکھتا تھا اور شعر بھی خوب کہتا تھا۔ ان خوبیوں کی بنا پر نصر بن احمد سامانی کا قرب حاصل ہوا اور اس کے مزاج میں رودکی اتنا دخل رکھتا تھا کہ

؎ بوی جوی مولیاں آید ہمی   یاد یار مہرباں آید ہمی

والا قصیدہ سن کر امیر ہرات میں اپنا طویل قیام ختم کر کے بخارا آنے پر مجبور ہو گیا۔ شاعری کی تاریخ میں یہ شاعرانہ معجزہ ایک قابل ذکر مثال ہے۔ (دیکھئے چہار مقالہ)

رودکی کا شمار فارسی کے عظیم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ بعد کے شعراء نے اسے استاد شعرا یا سلطان شعراء کے نام سے یاد کیا ہے۔ رودکی فارسی کا پہلا شاعر ہے جس نے فارسی شاعری کے وسیع امکانات کی نشاندہی کی۔ قصیدہ، مثنوی، غزل اور رباعی میں رودکی نے اپنی قدرت کلام کے بہترین نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔ رودکی بہت ہی پرگو شاعر تھا۔ رشیدی سمرقندی کے بقول اس نے ایک لاکھ تیس ہزار شعر کہے۔ لیکن استاد سعید نفیسی مرحوم بڑی کاوش کے بعد رودکی کے جو اشعار جمع کئے ہیں ان کی تعداد بمشکل ایک ہزار تک پہنچی ہے۔ رودکی نے ابوالفضل بلعمی کی فرمائش پر کلیلہ ودمنہ کا فارسی میں منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف اوزان میں چار مثنویاں اور بھی لکھی تھیں۔ رودکی نے غزل اور مرثیے بھی لکھے۔

سامانیوں کے دور میں رودکی کو عزت اور دولت سب کچھ ملا۔ اس لئے اس کے کلام کا آہنگ نشاطیہ ہی رہا لیکن اس کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی عمر کا آخری حصہ پریشانی میں بسر ہوا۔ رودکی نے ۳۲۹ھ میں وفات پائی اور اپنے قصبے پنج رودک ہی میں مدفون ہوا۔

نمونۂ کلام:

شاد زی با سیاہ چشمان شاد — کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد
ز آمدہ تنگدل نباید بود — وز گذشتہ نکرد باید یاد
من و جعد موی غالیہ بو — من و آں ماہ روی حور نژاد
نیکبخت آں کسی کہ داد و بخورد — شور بخت آنکہ او نخورد و نداد
باد و ابر است ایں جہان افسوس — بادہ پیش آر، ہر چہ بادا باد

دقیقی سامانی شعراء میں رودکی کے بعد دقیقی دوسرا بڑا شاعر ہے۔ اس کا نام ابو منصور محمد بن احمد تھا۔ اس اسلامی نام کے باوجود محققین کا خیال ہے کہ وہ آتش پرست تھا۔ اس کی تائید میں بعض اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں آتش پرست مسلمان جیسے نام رکھ لیا کرتے تھے۔ بلخ، طوس یا سمرقند کو اس کا وطن بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صفا کی تحقیق کے مطابق دقیقی ۳۶۷ - ۳۶۹ھ کے درمیان اپنے ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس نے امرائے چغانیاں کی مدح کی۔ اس نے نوح بن منصور (۳۶۶ - ۳۸۷ھ) کے ایماء پر شاہنامہ لکھنا شروع کیا۔ ابھی وہ ایک ہزار شعر لکھ پایا تھا کہ قتل ہو گیا۔ دقیقی کا نام انہی اشعار کی بدولت زندہ ہے۔ فردوسی نے ان اشعار کو اپنے شاہنامے میں شامل کر لیا۔ رزم نگاری میں دقیقی، فردوسی کا پیشرو تھا۔ شاہنامے کے علاوہ دقیقی کے قصائد و قطعات بھی ملتے ہیں۔

نمونۂ کلام:-

شب سیاہ بداں زلفکان تو ماند — سپید روز، بپاکی رخان تو ماند
عقیق را چو بسایند نیک سودہ گران — گر آبدار بود با لبان تو ماند
بوستان ترکان ہزار گشتم بیش — گل شکفتہ، برخسارکان تو ماند

کسائی مروزی حکیم ابو الحسن مجد الدین کسائی مرو کا رہنے والا تھا۔ اس کے اپنے اشعار ہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۳۴۱ھ میں پیدا ہوا۔ اس نے طویل عمر پائی اور سامانی عہد کا آخری اور غزنوی عہد کے ابتدائی دور کو دیکھا۔ اس لئے عوفی نے اس کا شمار غزنوی عہد میں کیا ہے۔ کسائی نے سامانیوں کے وزیر عتبی م ۳۷۲ھ اور سلطان محمود کی شان میں قصیدے بھی لکھے۔ کسائی فارسی کا پہلا شاعر ہے جس نے دینی و فلسفیانہ مسائل نظم کئے۔ سلجوقی دور کے مشہور شاعر ناصر خسرو نے کسائی کے کلام کی تکمیل کی اور اس نے کسائی کے

جواب میں قصیدے لکھے اور وہ کسائی کا نام بے حد احترام سے لیتا ہے۔ کسائی کے ہاں خوبصورت تشبیہات اور فطرت نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

نمونۂ کلام:-

گل نعمتی است ہدیہ فرستادہ از بہشت | مردم کریم تر شود اندر نعیم گل
ای گل فروش گل چہ فروشی بجای سیم | وز گل عزیز تر چہ ستانی بسیم گل

رابعہ بنت کعب قزداری

چوتھی صدی ہجری کی یہ غزل گو شاعرہ پہلی عورت ہے جس کا نام فارسی شعراء میں نظر آتا ہے۔ یہ بلوچستان کے مشہور مقام خضدار میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ کعب عربی النسل تھا۔ رابعہ علم و فضل کے ساتھ ساتھ حسن و جمال میں بھی بے مثال تھی۔ لوگ اسے زین العرب کہتے تھے۔ اسے اپنے بھائی حارث کے غلام بکتاش سے عشق تھا۔ حارث نے غیرت میں آکر رابعہ کو ہلاک کر دیا۔ مولانا جامی نے رابعہ کو صوفی عورتوں میں شمار کیا ہے اور اس کے عشق کو عشق حقیقی قرار دیا ہے۔ رابعہ کے عشق کے بارے میں جامی نے ایک مثنوی گلستان ارم کے نام سے لکھی۔ رابعہ کا کلام لطافت اور سوز و گداز سے پُر ہے۔

مرا بعشق ہمی متہم کنی بحیل | چہ حجت آری پیش خدای عزّ و جل
نعیم بی تو نخواہم جحیم با تو رواست | کہ بی تو شکر زہرست و با تو زہر عسل

سامانی دور کی نثر

شاعری کی طرح سامانی دور میں فارسی نثر کو بھی اہمیت ملی۔ فارسی نثر کی اوّلین کتب کا تعلق اسی عہد سے ہے۔ سامانیوں سے پہلے فارسی نثر کے متفرق جملے بعض عربی تصانیف میں ملتے ہیں۔ ماہ فرور دین کے بیٹے بہافرید نے جو ایک نئے دین کا بانی تھا۔ اپنے پیروکاروں کو فارسی زبان میں سات نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور ۱۳۲ھ کے لگ بھگ فارسی میں ان نمازوں کی ایک کتاب بھی مرتب کی تھی۔ ہندی کتاب شناناق ۱۲۰ - ۱۷۰ھ کے درمیان فارسی میں ترجمہ ہوئی۔ اور فارسی خط میں لکھی گئی۔ ایک کتاب تاج المصادر کرودکی سے منسوب کیا گیا ہے۔ ابو حفص سعدی نے اپنی لغت بھی سامانی دور میں مرتب کی لیکن اب ان سب کتابوں کے نام یا حوالے ہی موجود ہیں۔ اصل کتب کا پتہ نہیں چلتا۔

مقدمہ شاہنامہ (تالیف ۳۴۶ھ) کو اب تک فارسی نثر کا قدیم ترین نمونہ سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ڈاکٹر مہدی بیانی مرحوم کو حکیم ابوالقاسم سمرقندی کا مسائل فقہ پر لکھا ہوا ایک فارسی رسالہ ملا ہے۔ ان کے نزدیک اس رسالے کا سال تصنیف ۲۲۰ھ ہے۔ اس لئے سردست اس رسالے کو فارسی نثر کا اولین موجود نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ رسالہ ۸۱ اوراق پر مشتمل ہے۔[1]

مقدمہ شاہنامہ

سامانی دور کے نثر نگاروں نے ایران قدیم کی بکھری ہوئی تاریخ اور روایات کو محفوظ کرنے کے لئے بڑی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں نثر کے بہت بڑے شاہنامے لکھے گئے۔ سامانی وزیر ابو منصور المعمری کی نگرانی میں قدیم ایران سے متعلق بہت سی داستانوں کا مجموعہ شاہنامہ کے نام سے مرتب کیا گیا۔ یہ کام ۳۴۶ھ میں تکمیل کو پہنچا۔ معمری نے اس شاہنامے پر ایک مقدمہ لکھا۔ اس مجموعے سے فردوسی نے بھی استفادہ کیا۔ اب معمری کے نثری شاہنامے کا تو کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن اس کا مقدمہ شاہنامہ فردوسی کے بعض قدیم نسخوں میں شامل دستیاب ہوا ہے۔ اس مقدمے کی زبان سادہ اور رواں، جملے واضح اور چھوٹے ہیں۔

شاہنامہ بلخی

بلعمی نے اپنی تاریخ میں سامانی شاعر ابوالموید بلخی کے شاہنامے کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی فارسی نثر میں لکھا گیا تھا۔ اس کا ذکر اور اقتباسات بھی دوسری کتابوں میں ملتے ہیں۔

تاریخ بلعمی

اس دور میں دو اہم عربی کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری کی تاریخ الرسل والملوک کا فارسی ترجمہ منصور بن نوح کی فرمائش پر اس کے وزیر ابوعلی محمد بن محمد بلعمی نے ۳۵۲ھ میں کیا۔

تفسیر طبری

تفسیر طبری کا ترجمہ اسی مقصد کے کئی علماء نے مل کر کیا۔ یہ ترجمہ چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ترجمے کی زبان سادہ ہے چونکہ ترجمہ عربی سے ہوا ہے اس لئے عربی الفاظ فارسی ترجمے میں آ گئے ہیں۔

عجائب البلدان

یہ کتاب ابوالموید بلخی کی تصنیف ہے اور نوح بن منصور کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس میں بعض شہروں کے عجائبات کی تفصیل دی گئی ہے۔

حدود العالم من المشرق الی المغرب

علم جغرافیہ کی کتاب ہے۔ مصنف کا نام معلوم نہیں۔ سال تصنیف ۳۷۲ بتایا جاتا ہے۔

---

[1] مجلہ دانشکدہ ادبیات تہران؛ شمارہ ۳،۴ سال ششم

الابنیہ عن حقائق الادویہ

ابو منصور موفق بن علی ہراتی کی اس تالیف کا موضوع خواص ادویہ ہے ۔

غزنوی دور ۳۵۱ - ۵۸۲ھ / ۹۶۲ - ۱۱۸۶ء

عباسی خلفاء کی طرح آخری سامانی بادشاہ بھی اپنی فوجوں میں ترک سپاہی رکھنے پر مجبور ہو گئے تھے ۔ الپتگین سامانیوں کا ایک مستند جرنیل تھا اور ان کی جانب سے حاکم خراسان مقرر ہوا تھا ۔ عبدالملک سامانی کے عہد میں یہ ناراض ہو کر ۳۵۱ھ میں غزنی آگیا اور وہاں اس نے اپنی حکومت قائم کر لی ۔ اس کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ۳۶۶ھ میں اس کے غلام اور داماد سبکتگین نے اس کی تکمیل اور فتوحات کر کے سلطنت غزنی کو تقویت بخشی ۔ ۳۸۷ھ میں سبکتگین فوت ہوا تو اس کا بیٹا اسمٰعیل تخت نشین ہوا ۔ لیکن وہ سات ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا ۔ اسے معزول کر کے محمود نے حکومت سنبھال لی ۔ یہی عہد غزنویوں کے عروج کا زمانہ ہے ۔ اس عظیم فاتح کی تلوار کے سامنے ہندوستان اور ایران میں کوئی نہ ٹھہر سکا ۔ ہندوستان کی کثیر دولت اور ایران کا ایک بڑا حصہ اس کے قبضہ میں آگیا ۔ یہ پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا ۔

سلطان کی وفات کے بعد ۴۲۱ھ میں چند ماہ اس کے بیٹے محمد نے حکومت کی ۔ لیکن سلطان کے دوسرے بیٹے مسعود نے محمد کو تخت سے الگ کر کے خود حکومت پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے زمانے میں سلجوقیوں کی قوت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا ۔ وہ مرو میں ان سے شکست کھا کر ۴۳۱ھ میں غزنی آگیا اور وہاں سے اسے ہندوستان کے غزنوی مقبوضات کا رخ کرنا پڑا ۔ ۴۳۲ھ میں اس کے قتل کے ساتھ ایران میں غزنویوں کا ایک دور ختم ہوا ۔ لیکن اس خاندان کی حکومت ۵۸۲ھ تک قائم رہی ۔ غوریوں نے انہیں غزنی چھوڑنے پر مجبور کیا اور سلطان خسرو شاہ بن بہرام شاہ (۵۴۷ — ۵۵۵ھ) کے زمانے میں غزنویوں کا پایہ تخت لاہور منتقل ہو گیا ۔ آخری غزنوی بادشاہ خسرو ملک ۵۸۲ھ میں غیاث الدین کے ہاتھوں گرفتار ہوا ۔

غزنویوں کی حکومت کا زمانہ زیادہ طویل نہیں ہے حقیقت میں سلطان محمود کا دور ہی اس میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے ۔ اس کے عہد میں غزنی عالم اسلام میں ایک نئے مرکز علم و ادب کی حیثیت سے ابھرا ۔ محمود کو جہاں کہیں علماء کا پتہ چلتا وہ انہیں اپنے دربار میں لانے کی کوشش کرتا ۔ پروفیسر براؤن نے سلطان کو غارت کنندہ علماء لکھا ہے ۔ سلطان کو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی

دلچسپی تھی۔ دربار میں چار سو شعراء موجود تھے۔ فوجی مہمات میں اکثر شعراء سلطان کے ہمرکاب رہتے تھے اور ان شعراء نے محمود کے جنگی کارناموں کو شعر کے قالب میں ڈھال کر ابدی بنا دیا۔ سلطان کی داد و دہش کا سن کر شعراء دربار محمودی میں پہنچنے کی آرزو کیا کرتے تھے۔ اس کے ملک الشعراء عنصری کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ اس کے ہاں کھانا چاندی کے دیگچوں میں پکتا تھا اور سونے کے برتنوں میں کھایا جاتا تھا

سلطان کی سرپرستی کی وجہ سے فارسی شاعری نے اس عہد میں بڑی ترقی کی۔ سلطان کے فرزند اور وزراء بھی شاعری سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے۔ انہوں نے شعراء کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ سلطان کی ساری زندگی جنگ و جہاد میں گزری۔ لوگوں کو اس مقصد کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے کی ضرورت تھی اور سلطان کے شعراء نے اس فرض کو بخوبی انجام دیا۔ محمود اس وجہ سے بھی شعراء کی قدر کرتا تھا۔

غزنوی عہد کو فارسی شاعری کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ شاہنامہ فردوسی فارسی شاعری کا اتنا بڑا شاہکار ہے کہ اس دور کو فردوسی کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ عنصری اور فرخی کے قصائد، فارسی شاعری کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس عہد میں فارسی شاعری کی ترقی کا ایک اور سبب یہ ہے کہ سامانی دور میں اس ترقی کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ نثر و نظم میں شاہنامہ نویسی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ بلعمی نے اس کی ابتدا کی اور دقیقی نے اسے آگے بڑھایا۔ اور فردوسی نے اسے کمال تک پہنچایا۔ عنصری و فرخی کی قصیدہ گوئی کے لئے راستہ رودکی نے صاف کر دیا تھا۔

ایرانی نقاد فارسی ادبیات کی پیشرفت کے لئے سلطان محمود کی کوششوں کا اعتراف بڑی نیم دلی سے کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں سامانیوں کا رتبہ اس ضمن میں غزنویوں سے بہت اونچا ہے۔ کیونکہ سامانی ایرانی الاصل تھے۔ انہیں اپنے ماضی سے محبت تھی اور اس ماضی کو زندہ و محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے بڑی کوششیں کیں۔ ایرانی فضلاء کا خیال ہے کہ سامانیوں کے برعکس غزنوی ترک النسل تھے۔ انہیں ایران اور اس کی روایات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ تو صرف مدح و ستائش کے خریدار تھے۔ انہوں نے صرف ان شعراء کو انعام و اکرام سے نوازا جو ان کے قصیدے کہتے تھے۔ لیکن ایرانی محققین کی یہ رائے انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ فردوسی کے ساتھ محمود کی بدسلوکی کے فرضی یا حقیقی واقعہ کی وجہ سے محمود کے بارے میں ان کی آراء میں حقیقت کم اور تعصب زیادہ ہوتا ہے۔

عنصری اور فرخی نے قصیدہ گوئی کے علاوہ غزل گوئی کی طرف بھی توجہ دی۔ اگرچہ قطعہ گوئی کو فروغ نہ پاسکی لیکن ترجیع بند اور ترکیب بند کے اچھے نمونے غزنوی شعراء کے ہاں مل جاتے ہیں۔ مسمط تو اسی دور میں ایجاد ہوئی۔ ڈاکٹر محجوب نے مختلف اوزان میں اس عہد کی ۱۵ مثنویوں کی فہرست دی ہے۔ ان میں عنصری کی وامق و عذرا اور فردوسی کا شاہنامہ بھی شامل ہیں۔

اس دور کے شعراء کے کلام میں واقعہ نگاری اور فطرت نگاری کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ عنصری اور فرخی کے قصائد میں سلطان محمود کی جنگوں کی تفصیل، فطرت اور مناظر فطرت کی شاعرانہ تصویر کشی ملتی ہے۔ جزئیات نگاری شاہنامہ فردوسی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر محجوب نے اس دور کی غزلوں میں ایک اہم نکتے کی نشاندہی کی ہے کہ اس دور کے عاشقوں میں بعد کے ادوار کے عشاق جیسی خاکساری اور نیازمندی نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ فتوحات و مہمات کے اس دور میں لوگوں میں جنگجوئی کے جذبات غالب تھے۔

غزنوی دور کے شعراء

فردوسی

یوں تو دربار غزنی میں چار سو شعراء موجود تھے لیکن جو شہرت و عظمت ان میں شاہنامہ کے خالق فردوسی کے حصے آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی اس عظمت و شہرت کے باوجود فردوسی کے حالات زندگی اور صحیح نام تک کے بارے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صفا کی تحقیق کے مطابق اس کا نام ابوالقاسم منصور بن حسن تھا اور وہ طوس کے علاقے طابران کے ایک گاؤں باژ میں ۳۲۹ھ میں پیدا ہوا۔ یہ اپنے گاؤں میں زمینداری کرتا تھا۔ فردوسی نے ۳۷۰ھ کے لگ بھگ شاہنامہ اپنی دلی امنگ سے بغیر کسی کی فرمائش کے لکھنا شروع کیا اور تیس سال وہ اس عظیم کام میں مصروف رہا۔ طوس کے امراء میں سے ابودلف اور علی دیلم نے فردوسی کی مدد کی اور اس کا حوصلہ بڑھایا۔ شاہنامہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ فردوسی گردش حالات سے غربت و افلاس میں مبتلا ہو گیا۔ دوستوں کے مشورے پر وہ محمود کے دربار میں پہنچا۔ سلطان محمود کی شان میں چند مدحیہ شعر لکھ کر اس نے شاہنامے میں شامل کئے۔ فردوسی ۳۹۴ تا ۳۹۵ھ کے درمیان دربار میں آیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فردوسی نے شاہنامہ محمود کی فرمائش پر لکھنا شروع کیا نہ محمود نے فی شعر ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا۔

دوسری روایت کے بموجب شاہنامہ کی تکمیل کے بعد فردوسی کو اس کی اپنی توقع کے خلاف

ساٹھ ہزار اشرفیوں کی بجائے میں ہزار درہم ملے۔ اس سے دل شکستہ ہو کر وہ غزنی سے نکل گیا اس نے محمود کی ہجو کہی اور روپوش ہو گیا۔ ایک مدت کے بعد خواجہ حسن میمندی کی سفارش پر سلطان محمود نے ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کو بھجوائیں۔ کہتے ہیں کہ جب سلطان کے آدمی وہاں پہنچے تو فردوسی مر چکا تھا اور لوگ اس کا جنازہ لئے جا رہے تھے۔ فردوسی کی بیٹی کو یہ انعام پیش کیا گیا تو اس نے لینے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ فردوسی کی وفات ۴۱۱ یا ۴۱۶ھ ہے۔

انعام کے سلسلے میں فردوسی کی محرومی کے کئی اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً (۱) فردوسی شیعہ اور محمود سنی تھا (۲) شاہنامہ ایران قدیم کے جلیل القدر بادشاہوں کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ اس کی قدر کوئی ایرانی الاصل بادشاہ ہی کر سکتا تھا۔ (۳) شاہنامہ کی پیش کش کے وقت دربار محمود میں فردوسی کا کوئی حامی وزیر موجود نہ تھا۔ (۴) کہا جاتا ہے شاہنامہ کے بعض مطالب مثلاً حسب و نسب کی اہمیت یا رستم کی شجاعت کی مبالغہ آمیز تعریف محمود کو پسند نہ تھے۔

ان سب وجوہات سے اتفاق تو نہیں کیا جا سکتا لیکن فردوسی کی محرومی کے واقعے کو جھٹلانے کے لئے جن ٹھوس دلائل کی ضرورت ہے وہ ابھی میسر نہیں آئے۔ ایک مثنوی یوسف و زلیخا غلطی سے فردوسی کے نام منسوب کر دی گئی ہے۔

شاہنامہ: شاہنامہ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں فردوسی نے ایران کے پہلے داستانی بادشاہ کیومرث سے لے کر آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم تک پچاس بادشاہوں کی سرگذشت لکھی ہے۔ اس کا اہم ترین حصہ کیانی بادشاہ کیکاؤس کے بارے میں ہے۔ رستم اسی کے عہد میں ہوا۔ یہی کردار اور اس سے متعلقہ روایات شاہنامے کی جان ہیں۔ واقعات لکھتے وقت فردوسی نے قابل اعتماد ماخذوں سے کام لیا ہے۔

ڈاکٹر صفا نے شاہنامہ کی مندرجہ ذیل خصوصیات کا ذکر بطور خاص کیا ہے۔ (۱) فردوسی نے ملی روایات کو بڑی دیانتداری اور احتیاط سے شاہنامے میں شامل کیا ہے۔ (۲) شاہنامے میں مناظر فطرت، میدان جنگ، پہلوانوں کے کردار اور ان کے مقابلوں کی جزئیات کو بڑی مہارت سے نظم کیا گیا ہے۔ (۳) شاہنامے کی تمہید اور ہر داستان کے آغاز میں حمد، نعت، حکمت و موعظت اور عبرت کی باتیں بیان کی گئی ہیں (۴) شاہنامہ سادگی بیان میں اپنی مثال آپ ہے۔ اتنے سو سال گزر جانے کے بعد آج بھی وہ کم و بیش ہر ایرانی کے لئے قابل فہم ہے۔

شاہنامہ ایرانی بادشاہوں کی صرف منظوم تاریخ ہی نہیں۔ بلکہ یہ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ایک رزمیہ ہے جسے دنیا کے عظیم رزمیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مافوق الفطرت

واقعات، شجاعتوں کے مبالغہ آمیز کارناموں اور حسد و انتقام کی حکایات سے معمور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک ایسا نگار خانہ ہے جس میں قدیم ایرانی تمدن و ثقافت اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ شاہنامے میں فردوسی نے واقعہ نگاری، منظر کشی، جذبات نگاری اور کہیں کہیں ایجاز و اختصار کا حق ادا کر دیا ہے۔

براؤن کے خیال میں ساٹھ ہزار اشعار کی اس کتاب کا ایک ہی بحر میں ہونا اکتاہٹ کا باعث ہے لیکن یہ ایک ذوقی مسئلہ ہے اس میں براؤن کی رائے زیادہ قابل لحاظ نہیں۔ پروفیسر ہادی حسن مرحوم کے نزدیک فردوسی میدان جنگ اور جنگ کی منظر کشی میں بڑی مہارت کا ثبوت دیتا ہے لیکن میدان کارزار کی آوازوں کی طرف اس کا دھیان نہیں جاتا۔ ان صوتی اثرات کی کمی کے باعث جنگ کا نقشہ نامکمل سا رہ جاتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ فردوسی مردانہ اور زنانہ احساسات کو ایک ہی طرح پیش کرتا ہے، سہراب کی موت پر رستم اور تہمینہ (سہراب کی ماں) ایک ہی طرح ماتم کرتے ہیں۔

نمونۂ کلام:-

دو لشکر بیکدیگر آویختند — تو گفتی همی اندر آمیختند
ز آسیب شیران پولاد چنگ — دریده دل شیر و چرم پلنگ
زمین کرده بد سرخ رستم بجنگ — یکی گرزه گاو پیکر بچنگ
ز خون دلیران بدشت اندرون — چو دریا زمین موج زن شد ز خون
ز سم ستوران در آن پهن دشت — زمین شد شش و آسمان گشت هشت
فرو رفت و بر رفت روز نبرد — بماهی نم خون و بر ماه گرد
بروز نبرد آن یل ارجمند — بشمشیر و خنجر بگرز و کمند
برید و درید و شکست و ببست — یلان را سر و سینه و پا و دست

میاسای ز آموختن یک زمان — ز دانش میفگن دل اندر گمان
چو گویی که وام خرد توختم — همه هرچه بایستم آموختم
یکی نغز بازی کند روزگار — که بنشاندت پیش آموزگار

فرخی: ابوالحسن بن جولوغ فرخی سیستان کا رہنے والا تھا۔ امیر خلف بانو کے ہاں ملازم تھا۔ شعر خوب کہتا تھا اور چنگ بجانے میں مہارت

رکھتا تھا۔ شادی کے بعد اس کے اخراجات بڑھ گئے تو وہاں سے ابوالمظفر امیر چغانیاں کے دربار کا رخ کیا۔ اس کی مدح اور اپنے حسب حال ایک شاندار قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔ سے

با کاروان حلہ برفتم ز سیستان　　　با حلۂ تنیدۂ ز دل بافتہ ز جان

امیر داغگاہ (گھوڑوں کی پرورش گاہ، جہاں انہیں داغا جاتا تھا) میں تھا۔ فرخی نے یہ قصیدہ امیر کے پیشکار عمید اسعد کو سنایا اسے یقین نہ آیا کہ فرخی جیسا دیہاتی ایسا قصیدہ کہہ سکتا ہے۔ اس نے فرخی کو داغگاہ کی کیفیت بتائی اور اس کا امتحان لینے کے لئے کہا کہ ایک قصیدہ داغگاہ کے بارے میں لکھو۔ فرخی نے اس موضوع پر بھی قصیدہ کہا۔ عمید اسعد فرخی کو امیر کے پاس لے گیا۔ امیر کو دونوں قصیدے بہت پسند آئے اور اس نے فرخی کو انعام و اکرام سے نوازا۔

ترکیہ کے مشہور محقق ڈاکٹر احمد آتش مرحوم[1] نے ٹھوس دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ فرخی ۴۰۶ھ میں چغانیاں گیا کیونکہ اس نے اپنے قصیدے میں امیر کو عید نوروز کے ساتھ ایک مذہبی عید کی بھی مبارکباد دی ہے اور ایسا اتفاق ۴۰۶ھ میں ہی پیش آیا کہ نوروز کے ساتھ عید آئی۔

امیر چغانیاں کے ہاں فرخی نے ایک سال سے زیادہ قیام نہیں کیا۔ ۴۰۸ھ میں یا اس سے کچھ پہلے وہ محمود کے دربار میں آچکا تھا۔ وہاں اس کی بڑی قدر افزائی ہوئی۔ یہ سلطان محمود کی جنگی مہمات میں ہمیشہ سلطان کے ہمرکاب رہا۔ اس کے قصائد میں بھی ان مہمات کا بیان ملتا ہے۔ فرخی نے ۴۲۹ھ میں عالم جوانی میں ہی وفات پائی۔

فرخی غزنوی دربار کا وہ خوش قسمت شاعر ہے جس کا کم و بیش سارا کلام محفوظ ہے۔ قصیدہ گوئی میں فرخی کی تشبیب بڑی دلکش ہوتی ہے۔ بقول علامہ شبلی فرخی کے کلام کا عام جوہر زبان کی صفائی، سلاست اور روانی ہے۔ اس کے بعض قصائد میں منظر نگاری کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ محمود کی جنگوں کے بیان میں اس نے واقعہ نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ موسیقی میں مہارت کی وجہ سے اس کے کلام روانی و ترنم کا احساس ہوتا ہے۔ فرخی ایک نشاط پرست اور عیش کوش انسان تھا۔ اس لئے نشاطیہ آہنگ اس کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے وہ شاعر نشاط ضرور تھا لیکن اس نے سلطان محمود کی وفات پر جو دلدوز مرثیہ لکھا۔ اس سے سلطان کے ساتھ اس کی محبت و عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ علامہ شبلی کے نزدیک اس مرثیے سے فارسی شاعری میں پہلی بار شخصی مرثیے کے اصولوں کا تعین ہوا۔

---

[1] مجلہ دانشکدۂ ادبیات تہران شمارہ ۲ سال ہشتم

نمونۂ کلام۔

چون پرند نیلگون بر روی پوشد مرغزار
پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

خاک را چون ناف آہو مشک زاید بیقیاس
بید را چون پر طوطی برگ روید بیشمار

دوش وقت نیم شب بوی بہار آورد باد
حبذا باد شمال و خرما بوی بہار

باد گویی مشک سودہ دارد اندر آستین
باغ گویی لعبتان سادہ دارد در کنار

ترجمان البلاغت کو مدت تک فرخی کی تصنیف سمجھا جاتا رہا لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ یہ رادویانی کی ہے۔

عنصری

استاد ابوالحسن بن احمد عنصری بلخ کے ایک تجارت پیشہ خاندان میں پیدا ہوا۔ ایک سفر میں سامان تجارت چوروں نے لوٹ لیا۔ اس کے بعد عنصری نے یہ پیشہ ترک کر کے علم و ادب کی طرف توجہ دی۔ سلطان محمود کے بھائی امیر نصر کی وساطت سے سلطان کی بارگاہ میں پہنچا۔ اپنی لیاقت، ذہانت اور بدیہہ گوئی کی بدولت ملک الشعرا بنا۔ جنگ محمود غزنوی عنصری رزم و بزم میں اس کے ساتھ رہا اور اس نے محمود کے جنگی کارناموں کو بڑی ہنرمندی سے اپنے قصیدوں میں پیش کیا ہے۔ بارگاہ محمودی میں عنصری قابل رشک مقام پر فائز تھا۔ اس کے سونے چاندی کے برتنوں کا قصہ تو کافی شہرت رکھتا ہے۔ استاد فروزانفر مرحوم نے بعض اعتبارات سے اسے فارسی کا عظیم ترین قصیدہ گو قرار دیا ہے۔ اس کا کلام الفاظ و تراکیب کے حسن استعمال کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے قصیدوں میں منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے دلکش نمونے ملتے ہیں۔

قصائد کے علاوہ عنصری نے شاد بہر و عین الحیوۃ، وامق و عذرا، خنگ بت و سرخ بت کے نام سے مثنویاں بھی لکھیں لیکن عنصری کا بہت سا کلام بدقسمتی سے ضائع ہو گیا۔ عنصری کی گمشدہ مثنوی وامق و عذرا کی دریافت کا فخر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کو نصیب ہوا۔ یہ مثنوی ان کے مقدمے و حواشی کے ساتھ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد لاہور سے شائع ہوئی۔ دکتر محمد دبیر سیاقی کے اہتمام میں دیوان عنصری تہران سے شائع ہو چکا ہے۔

اس نے ۴۳۱ھ میں وفات پائی ہے۔

نمونۂ کلام:-

چہ چیز است رخسارہ و زلف دلبر
گل مشکبوی و شب روز پرور

گل اندر شدہ زیر نورستہ سنبل
شب اندر شدہ زیر خورشید انور

همانا که خورشید رنگ حبشی را — بدزدد که بخشد بیاقوت احمر
زنخش گلستانست و گیلان باتش — گیرزد برادری بهشت و به آذر

منوچہری دامغانی

ابوالنجم احمد بن قوص دامغان کا رہنے والا تھا۔ شروع شروع میں فلک المعالی منوچہر بن قابوس وشمگیر کے دربار سے وابستہ تھا۔ اسی کی نسبت سے اس نے اپنا تخلص منوچہری رکھا۔ پرانے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ دربار محمود کا شاعر تھا لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اس کے دیوان میں محمود کے نام کا کوئی قصیدہ نہیں ہے استاد ہادی حسن مرحوم کا خیال ہے کہ منوچہر چونکہ بعد میں سلطان محمود کے دربار میں آگیا تھا اور مسعود کے اپنے والد سے تعلقات اچھے نہیں رہے تھے اس لئے منوچہری نے جو قصائد محمود کے بارے میں کہے وہ دیوان سے نکال دیئے یا انہیں تبدیل کر دیا۔ ایرانی محقق دبیر سیاقی کے نزدیک منوچہری کا سلطان محمود سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہے۔ وہ سلطان مسعود کا شاعر تھا۔ وہ مازندران سے تقریباً ۴۲۳ھ میں غزنی آیا اس کے بعد وہ مسعود کے دربار میں پہنچا۔ منوچہری کا محمود بن محمود سے بھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ کہتے ہیں منوچہری نے جوانی میں ہی ۴۳۲ھ میں انتقال کیا۔

منوچہری غزنوی دربار میں پہنچا تو ابھی جوان ہی تھا۔ اس نے دربار کے بڑے شعراء کے مقابلے میں ایک خاص روش اختیار کرکے اپنی انفرادیت قائم کی۔ غزنوی عہد کے شعراء سبک خراسانی کے پیرو تھے لیکن منوچہری نے عرب شعراء کی تقلید کی۔ اس کے اشعار میں عربی الفاظ کی بھرمار ہے۔ اس نے عربی کی مخصوص بحروں میں قصائد لکھے۔ اور انداز میں عربی قصیدہ گوئی کی روایت کی تقلید کی۔

عربی کے نامانوس الفاظ و تراکیب کے استعمال کے باوجود منوچہری کے کلام میں روانی سلاست موجود ہے اور اسی وصف کی وجہ سے اس کا شمار صف اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے

فارسی شعراء میں منوچہری کی ایک اور خصوصیت فطرت اور مناظر فطرت کے ساتھ اس کی دلچسپی ہے۔ اس کے کلام میں فطرت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس طرح جلوہ گر ہے کہ اسے مصور فطرت یا شاعر فطرت کہا جا سکتا ہے۔ منوچہری کی ساری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی۔ اس کے اشعار میں کہیں غم کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ اس کے کلام میں مسرت و انبساط کا رنگ نمایاں ہے۔ خمریات میں اسے فارسی شاعری کا ابونواس کہا جا سکتا ہے۔ متقدمین میں کسی اور شاعر کے ہاں اتنے خوبصورت مسمط نہیں ملتے۔ اس لئے اکثر محققین نے منوچہری کو مسمط کا موجد قرار دیا ہے لیکن ڈاکٹر مجرب کا خیال ہے۔ منوچہری مسمط کا موجد نہیں ہو

سکتا۔ انہوں نے مسعود کے انداز میں شہید بلخی اور کسائی مروزی کے اشعار دیئے ہیں۔ نمونہ یہ ہے۔ [1]

الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل — کہ پیشاہنگ بیرون شد ز منزل
تبیرہ زن بزد طبل نخستین — شتربانان ہمی بندند محمل
نماز شام نزدیک است و امشب — مہ و خورشید را بینم مقابل
ولیکن ماہ دارد قصد بالا — فرو شد آفتاب از کوہ بابل
ندانستم من ای سیمین صنوبر — کہ گردد روز چونین زود زایل
چنان دو کفۂ سیمین ترازو — کہ این کفہ شود زان کفہ مایل
من و تو غافلیم و ماہ و خورشید — برین گردون گردان نیست غافل

عہد غزنوی کے مندرجہ ذیل شعراء بھی قابل ذکر ہیں۔

(۱) عبدالعزیز بن منصور عسجدی: یہ مرو کا رہنے والا تھا۔ عنصری اور فرخی کا معاصر صاحب دیوان شاعر تھا لیکن آجکل اس کا دیوان نہیں ملتا۔

(۲) لبیبی خراسانی: چوتھی صدی ہجری کے دور آخر کا شاعر تھا۔ فرخی کا معاصر اور ابوالمظفر امیر چغانیان کی بارگاہ سے وابستہ تھا۔

(۳) غضائری رازی: یہ ری میں دیلمی امراء کا مدح گر تھا لیکن دربار غزنی میں بھی محمود کی شان میں قصائد لکھ کر بھیجا رہتا تھا۔ اس نے گراں بہا صلے پائے۔ یہاں تک کہ محمود کا ملک الشعراء عنصری اس سے حسد کرنے لگا۔ ان دونوں میں چشمک رہی۔ غضائری کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غزنی نہیں آیا۔ ہدایت نے اس کی وفات ۴۲۶ھ میں لکھی ہے۔

[1] سبک خراسانی در شعر فارسی ص، ۱۶۲

غزنوی دور کی نثر

غزنوی دور شاعری کی طرح نثر میں بھی خاصا ثروتمند نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس عہد کے علما نے عربی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی خالص علمی موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔ تاریخ اس دور کی نثر کا دوسرا موضوع ہے۔ اس عہد کے نثر نگاروں کے ہاں تاریخ ہو یا فلسفہ زبان و بیان کی سادگی دونوں جگہ موجود ہے۔ ان کی نثر تکلف سے پاک ہے اس دور کے بعد فارسی نثر میں تصنع و تکلف بڑھ گیا۔

رسائل ابن سینا یہ رسائل شیخ الرئیس ابو علی سینا کی تالیف ہیں۔ یہ نامور فلسفی اور عالم بخارا کے قریب ایک قصبے خرمیثن میں ۳۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ہمدان میں ۴۲۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ سامانیوں خوارزمشاہیوں، آل زیار اور دیلمیوں کے دربار سے وابستہ رہے۔ محمود کی خواہش کے باوجود دربار غزنی نہیں آئے۔ شمس الدولہ دیلمی نے وزارت کا اعلیٰ ترین منصب انہیں سونپا۔ وزارت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ بو علی سینا نے فلسفہ و طب میں تدریس و تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے بیشتر کتب عربی میں ہیں۔ بہت سے فارسی رسائل اور کتابیں ان سے منسوب کی گئی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صفا کا خیال ہے۔ کہ دانشنامۂ علائی اور رسالہ نبض کے سوا ابو علی سینا کے ساتھ باقی کتب و رسائل منسوب کرنا درست نہیں ہے اصل میں وہ ان کی عربی تصانیف کے ترجمے ہیں جو ان کے شاگردوں یا دوسرے لوگوں نے کئے دانشنامہ علائی فارسی زبان میں مشائی فلسفے کی بہترین کتاب ہے۔ اس کا منطق طبیعات، الہیات کا حصہ ابن سینا نے خود لکھا۔ اور باقی کتاب ان کے شاگرد ابو عبید جوزجانی نے لکھ کر اس میں شامل کی۔ یہ کتاب بو علی نے علاؤ الدولہ پسر کاکویہ کی فرمائش پر لکھی اور اسی کے نام پر اس کا نام دانشنامہ علائی رکھا۔ اس کتاب کی زبان سادہ ہے۔ اس میں عربی زبان کی آمیزش بہت کم ہے۔ فارسی میں علمی اصطلاحات کا استعمال بڑی خوبی سے ہوا ہے۔ رسالۂ نبض کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔

التفہیم یہ کتاب ابو ریحان البیرونی کی تصنیف ہے۔ بیرونی کا شمار اپنے عہد کے عظیم ترین علماء میں ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی پیدائش خوارزم کے محلہ بیرون میں ہوئی۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا یا اس کے اجداد کا تعلق سندھ کے شہر نیرون سے تھا۔ نیرون کو غلطی سے بیرون سمجھ لیا گیا۔ بہر حال یہ بات تحقیق طلب ہے اس نے تحصیل علوم خوارزم ہی میں کی۔ یہ شاہزادہ مامون قابوس بن وشمگیر اور محمود کی ملازمت میں رہا۔ محمود کے ساتھ ہندوستان آگیا۔ وہاں سے اس نے سنسکرت زبان بھی سیکھی اور ہندوستان پر ایک معرکۃ الآرا کتاب عربی میں تحقیق ما للہند کے نام سے لکھی۔ بیرونی نے التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب ۴۲۰ھ میں ریحانہ بنت الحسین خوارزمیہ کی خواہش پر لکھی۔ یہ کتاب عربی و فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ بیرونی نے اسے پہلے عربی میں لکھا یا فارسی میں۔ یہ فارسی زبان میں علم نجوم، ہندسہ اور حساب

پڑھی جانے والی جامع ترین کتاب ہے۔ بیرونی کے عہد میں علمی مقاصد کے لئے عربی زبان استعمال کی جاتی تھی۔ اس نے فارسی میں اس موضوع پر کتاب لکھ کر فارسی کے علمی اعتبار میں اضافہ کیا۔ اس کی زبان سادہ اور طرز بیان روشن ہے۔ علاوہ ازیں یہ قدیم فارسی اصطلاحات کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔

تاریخ بیہقی خواجہ ابوالفضل محمد بن حسن کی تصنیف ہے۔ خواجہ بیہق میں پیدا ہوا اور اس نے نیشاپور میں تعلیم پائی۔ عربی و فارسی کے علاوہ خوشنویسی میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ یہ شخص غزنویوں کے دیوان رسالت میں محمود کے زمانہ ہی سے وابستہ ہو گیا تھا۔ سلطان عبدالرشید کے زمانے تک یہ ملازم رہا۔ ۴۴۴ھ میں سلطان کے قتل کے بعد اس کے وفادار ملازمین کے ساتھ قید و بند کی سختیاں برداشت کرتا رہا۔ رہائی کے بعد ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ۴۷۰ھ میں وفات پائی۔

تاریخ بیہقی کا شمار فارسی کی اہم تاریخوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب اپنے اسلوب کی دلکشی اور واقعات کی صحت کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کہتے ہیں یہ تاریخ آل سبکتگین کی سلطنت کے بارے میں تیس جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ استاد سعید نفیسی مرحوم کے خیال میں اس کا نام جامع التواریخ یا جامع التواریخ فی آل سبکتگین تھا لیکن اس کتاب کی یہ جلدیں دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ آجکل جو کتاب تاریخ بیہقی کے نام سے ملتی ہے وہ ادھوری اور نامکمل ہے اور اس کا تعلق زیادہ تر عہد مسعودی سے ہے۔ یہ کتاب اس دور کی تاریخ، معاشرت اور ادب کے بارے میں قیمتی اور مستند معلومات کی حامل ہے۔ یہ کتاب اپنے دلکش اسلوب کی وجہ سے ادبی کتب میں جگہ پاتی ہے۔ بیہقی خود منشی تھا اور غزنوی کے دور کے ممتاز دبیر ابونصر مشکان کا شاگرد تھا۔ شاید اسی وجہ سے کتاب کا انداز منشیانہ ہے اور عبارت قدرے پر تکلف ہے۔ صنائع بدائع، اقوال و افکار اور اشعار سے عبارت کی آرائش کا سامان کیا گیا ہے۔

سلجوقی دور (۴۲۹ - ۷۰۰ھ) سے خوارزمشاہیوں تک (۴۷۰ - ۶۲۸ھ)

سلجوقی سلاطین نسلاً ترک تھے اور ان کا تعلق ترکوں کی مشہور شاخ "غز" سے تھا۔ سلطان محمود نے اپنی سرحدوں کی حفاظت کیلئے انہیں ماوراء النہر میں آباد ہونے کی اجازت دے دی تھی لیکن ان کی بڑھتی ہوئی قوت غزنوی سلطنت کے لئے خطرہ بن گئی اور سلجوقیوں نے غزنویوں کو غزنی اور ان کے ہندوستانی متبوضات میں محدود کر دیا تھا۔ طغرل پہلا سلجوقی بادشاہ تھا جس نے ۴۲۹ھ میں نیشاپور میں اپنی

بادشاہت کا اعلان کیا۔ الپ ارسلان، ملکشاہ اور سلطان سنجر اس سلسلے کے مشہور بادشاہ تھے۔
ایران کا نامور مدبر اور فاضل نظام الملک طوسی، الپ ارسلان اور ملکشاہ کے زمانے میں وزارت
کے منصب پر فائز رہا۔ سلطان سنجر کی وفات ۵۵۲ھ کے بعد ایران میں سلاجقہ کی شاندار حکومت
کا دور تو ختم ہو گیا لیکن بعض علاقوں پر ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں کئی سال بعد تک قائم رہیں ان میں
سلاجقہ کرمان و اتابکان فارس و آذربائیجان قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ۵۴۳ - ۶۱۲ھ تک غزنی
اور ہرات کے درمیان پہاڑی علاقے پر غوریوں کی حکومت رہی اور اسی خاندان علاؤالدین جہانسوز
نے غزنی کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا اور شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں غزنویوں کی سلطنت کا
خاتمہ ہوا۔ ۵۹۰ھ میں سلجوقی بادشاہ طغرل دوم نے تکش خوارزم شاہ سے شکست کھائی اور لڑتا ہوا
مارا گیا۔ ۵۹۰ - ۶۱۶ھ تک ایران کے وسیع علاقے پر خوارزم شاہیوں کی حکومت رہی۔ چنگیز خاں
نے خوارزم شاہیوں کے دور ہی میں ایران پر حملہ کیا اور سارا ملک اس کی غارت گری کا شکار ہوا۔
سلجوقیوں نے ایران کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ختم کر کے پورے ملک میں ایک مستحکم حکومت قائم
کی۔ ایران سے باہر ان کی فتوحات کا سلسلہ مشرقی روم (ترکیہ) تک جا پہنچا۔ سلاجقہ کی اہمیت کا
اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خلیفہ بغداد ان کی حمایت کا محتاج تھا لیکن یہ لوگ خلافت
کے پوری طرح وفادار رہے۔ یہ خلیفہ کی طرح خود سنی تھے اور ایک حد تک متعصب بھی۔ انہوں نے
مشرقی روم کے عیسائیوں کے ساتھ جنگ کر کے فریضہ جہاد ادا کیا۔ حسن بن صباح کی قیادت میں
باطنی تحریک نے بھی اس عہد میں زور پکڑا۔ سلاجقہ نے باطنیوں کے قلعوں پر یلغاریں کیں۔ مذہب
سے وابستگی کی بنا پر انہوں نے اپنی حدود مملکت میں بے شمار مدارس کھلوائے۔ بغداد کا شہرۂ آفاق
مدرسہ نظامیہ بھی انہیں میں شامل ہے۔
ایران میں سلجوقی حکومت کی مدت سو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس عرصے میں فارسی
زبان و ادب کو بہت ترقی نصیب ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ تو یہی ہے کہ سلاجقہ کی زبردست حکومت
میں فارسی ادب کو سازگار ماحول میسر آیا۔ اس عہد میں ادب پروری، شعر دوستی اور علم نوازی
لازمۂ ریاست و سلطنت خیال کی جاتی تھی۔ شاعر و ادیب کے وجود کے بغیر کوئی دربار مکمل نہیں سمجھا
جاتا تھا۔ اس لئے سلجوقی بادشاہ، وزراء، امراء، اور سپہ سالار شعراء و ادباء کے قدردان تھے۔ سلاجقہ
وسیع سلطنت میں فارسی ادب کی سرپرستی کے بے شمار مواقع موجود تھے۔ اس عہد میں فارسی
شاعری کو خانقاہوں میں بھی باریابی حاصل ہو گئی تھی جس سے خانقاہوں کی رونق بڑھی اور شاعری
کو فروغ ملا۔
سامانی اور غزنوی دور میں فارسی کے مرکز زیادہ تر خراسان میں تھے لیکن اس دور میں خراسان

کی ادبی فارسی کا رواج رہی۔ ہمدان، اصفہان بلکہ آذربائیجان تک ہو گیا۔ سلجوقیوں کی سرپرستی کی وجہ سے لوگوں نے اس ادبی زبان کو اپنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی زبانوں کے بہت سے الفاظ فارسی دری میں شامل ہو کر اس کی ثروت میں اضافے کا باعث ہوئے۔ خراسان عربی زبان کے مراکز سے دور تھا اس لئے وہاں کی زبان عربی اثرات سے محفوظ رہی۔ لیکن سلجوقی دور میں ایک تو فارسی خراسان سے نکل آئی اور اس عہد میں ایران کے طول و عرض میں جو مدارس کھلے ان میں تدریس عام عربی زبان میں ہوتی تھی۔ اس لئے اس عہد کے فضلاء کی بدولت فارسی زبان میں عربی عنصر کے داخلے کی رفتار قدرے تیز ہو گئی۔

اس عہد کے شروع میں شعراء نے سامانی و غزنوی شعراء کی پیروی کی لیکن نئے ماحول میں تدریجی طور پر فارسی شاعری ایک نیا رنگ اختیار کرتی چلی گئی۔ اس دور میں فارسی شاعری کا ایک نیا اسلوب ابھرا جسے نقاد سبک عراقی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس اسلوب نے سبک خراسانی کی جگہ لی۔ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں مسعود سعد سلمان اور ابو الفرج رونی اس نئے سبک کی جانب مائل نظر آتے ہیں۔ سبک عراقی کا ارتقاء رَے، ہمدان وغیرہ میں ہوا۔ ایران کے ان علاقوں کو عراق عجم کہا جاتا تھا۔ اس لئے اس کو سبک عراقی کہا گیا ہے۔ محسنات شعری کا استعمال، قصیدے کے مقابلے میں غزل کو ترجیح دینا اور کلام میں فکری گہرائی اس سبک کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ڈاکٹر محجوب نے شعرائے آذربائیجان کو سبک عراقی کا پیرو تسلیم نہیں کیا۔ ان کے نزدیک ان شعراء میں خراسانی و عراقی دونوں اسالیب کی خصوصیات ملتی ہیں۔ بعض نقاد ان شعراء کے اسلوب شعری کو سبک آذربائیجانی قرار دیتے ہیں۔

سلجوقی دور میں غزل پر قصیدے کی برتری قائم رہی۔ اس عہد میں انوری، خاقانی اور ظہیر فاریابی جیسے باکمال قصیدہ گو پیدا ہوئے۔ ان اساتذہ کے قصیدوں میں سامانی و غزنوی شعراء کے برعکس تکلف و تصنع اور مبالغہ زیادہ ہے۔ علمی اصطلاحات کے استعمال اور فکر کی گہرائی کی وجہ سے قصیدہ ذرا گراں بار ہو گیا ہے۔ فارسی شعراء میں انوری پہلا شاعر ہے جس کے دیوان میں غزلوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے آخر تک غزل کہنے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں غزل کو اہمیت حاصل ہوئی اور ساتویں صدی کے بعد تو غزل نے قصیدے کی جگہ لے لی۔ اس عہد کے شعراء کے ان قطعات میں موضوع کا تنوع ملتا ہے۔ فارسی کے عظیم ترین رباعی گو شاعر خیام کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے۔ اس نے رباعی کے مختصر پیکر میں حیات و کائنات کے اہم مسائل سمو دیئے ہیں۔ ڈاکٹر محجوب کے خیال میں اس دور میں

تمام شعراء کے کہے ہوئے مسمط منوچہری کے مسمطات کی برابری نہیں کر سکتے۔ پہر موضوع پر مثنوی اس دور میں کہی گئی۔ ڈاکٹر محبوب کی تحقیق کے مطابق مستزاد اسی عہد میں ایجاد ہوئی اور اس کی اختراع مسعود سعد سلمان کے سر ہے۔ انوری اور سوزنی کی وجہ سے ہجو و ہزل کا ایک بہت بڑا سرمایہ اس دور میں جمع ہو گیا۔

سلجوقی دور کے شعراء

بابا طاہر عریاں
بابا طاہر ہمدان کے رہنے والے تھے۔ ساری زندگی درویشی میں گذری۔ شاید ترک لباس کیا ہو اس لئے عریاں کے نام سے مشہور ہوئے ہوں۔ ان کی ولادت چوتھی ہجری کے اواخر میں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ ۴۴۷ھ میں جب پہلا سلجوقی بادشاہ طغرل ہمدان گیا تو اس وقت عارف کامل کی حیثیت سے بابا طاہر کی شہرت پھیل چکی تھی۔ سلطان طغرل ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عریاں نے اسے مملکت داری میں عدل و انصاف کی تلقین کی اور مٹی کے لوٹے کا ایک ٹوٹا ہوا دستہ تبرک کے طور پر عطا کیا۔ سلطان طغرل اس دستے کو اپنے تعویذوں میں رکھا کرتا تھا وہ جب کسی مہم پر جاتا تو اسے انگلی میں پہن لیتا تھا۔

بابا طاہر کی تصنیفات میں عربی اقوال کا ایک مجموعہ بھی شامل ہے۔ جس میں علم و معرفت ذکر و عبادت اور وجد و محبت کے موضوع پر صوفیانہ عقائد بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی اصل شہرت و عظمت دو بیتیوں پر مبنی ہے۔ دوبیتی یوں تو رباعی کی طرح چار مصرعوں پر ہی مشتمل ہوتی ہے لیکن اس کا وزن رباعی کے مستعمل اوزان سے مختلف ہوتا ہے اور یہ ایران میں قبل از اسلام بھی موجود رہی ہے۔

یہ دوبیتیاں سادہ و رواں زبان میں لکھی گئی ہیں۔ خیالات سادہ ہیں لیکن سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے، سادگی و تاثیر دونوں میں لاجواب۔ ان کی زبان لری ہے جو فارسی دری سے قدرے مختلف ہے۔ ان دوبیتیوں کا ترجمہ مسٹر ہیرن ایلن نے لعلان بابا طاہر کے نام سے انگریزی نثر میں اور منظوم ترجمہ مسز الزبتھ کرٹس نے کیا ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ ڈاکٹر احمد سلیم شعبہ فارسی دانش گاہ سندھ نے کیا ہے۔

نسیمی کز بن آن کاکل آیو | آیو = آید
مرا خوشتر ز بوی سنبل آیو | لیثو = لیشب
بشو گیرم خیالش را در آغوش |
سحر از بسترم بوی گل آیو |

ابوسعید ابوالخیر شیخ ابوسعید فضل اللہ بن ابی الخیر، ۳۵۷ ہجری میں نیشاپور کے ایک قصبے مہنہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے عہد کے نامور علماء و مشائخ سے کسب فیض کیا۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی متوفی ۴۱۲ھ کے مرید تھے۔ ساری عمر لوگوں کی روحانی تربیت میں مصروف رہے ان کے نواسے محمد بن منور کی کتاب "اسرار التوحید فی مقامات شیخ ابی سعید" شیخ کے اقوال و احوال کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے شیخ کی عالی ظرفی، وسعت قلبی اور صلح کل مسلک کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے ۴۴۰ھ میں مہنہ ہی میں انتقال فرمایا۔ شیریں گفتار واعظ تھے۔ تصوف کی حقیقت کے بارے میں ان کا یہ قول بہت مشہور ہے۔

ترجمہ:۔ دل میں جو خواہشات ہیں، انہیں نکال دو اور ہاتھ میں جو کچھ ہے وے ڈالو۔ جو کچھ تم پر گزرے اسے اللہ کی رضا سمجھو اور حرف شکایت لب پر نہ لاؤ۔ ان کا ایک اور قول ہے۔

ترجمہ:۔ خدا اور بندے کے درمیان زمین ہے نہ پردہ نہ آسمان بلکہ وجود انسان پردہ ہے جب اس پردے کو ہٹا دو گے تو خدا کو پا لو گے۔

شیخ ابوسعید صوفیانہ عقائد و اخلاق کا ایک زندہ نمونہ تھے۔ کہتے ہیں کہ ابوسعید ابوالخیر کے شیخ بوعلی سینا کے ساتھ کئی روز تک مذاکرات رہے اور بوعلی سینا نے ان کے بارے میں کہا "جو کچھ میں جانتا ہوں ابوسعید دیکھتا ہے۔" اور ابوسعید نے بوعلی کے بارے میں فرمایا "جو کچھ میں دیکھتا ہوں وہ جانتا ہے۔"

ابوسعید شاید فارسی کے پہلے شاعروں میں ہیں جنہوں نے صوفیانہ عقائد کے اظہار کیلئے رباعیات کو ذریعہ بنایا۔ نمونۂ کلام کے طور پر دو رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔ پہلی رباعی کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں حسن مطلق کا پرتو نظر آتا ہے اور دوسری رباعی میں صوفیوں کے صلح کل مشرب کو پیش کیا گیا ہے۔

گفتم کہ کرائی تو بدین زیبائی　　گفتا خود را کہ من خودم یکتائی
ہم عشقم و عاشقم و ہم معشوقم　　ہم آئینہ ہم جمال ہم بینائی

آن آتش سوزندہ کہ عشقش لقب است
در بتکدہ کفر و دین چو سوزندہ لقب است
ایمان دگر و کیش محبت دگر است
پیغمبر عشق نہ از عجم نہ عرب است

ناصر خسرو (م ۴۸۱ھ) حکیم ناصر خسرو سلجوقی عہد کا ایک نامور مفکر اور صاحب طرز شاعر تھا۔ اس کا نام ناصر بن خسرو، کنیت ابومعین اور لقب

حجت تھا جو اسے فاطمی خلیفہ مستنصر باللہ کی جانب سے ملا تھا اور ناصر خسرو نے اس لقب کو اپنے اشعار میں کئی جگہ بطور تخلص استعمال کیا ہے۔ ناصر خسرو بلخ کے نواحی شہر قبادیان میں ۳۹۴ھ میں پیدا ہوا۔ اس کا گھرانہ خوش حال اور معزز تھا۔ حصول علم کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ اس نے قرآن مجید حفظ کیا۔ حدیث، فقہ، طب، نجوم، فلسفہ و ریاضی میں مہارت حاصل کی۔ مطالعہ ادیان سے بھی اسے گہری دلچسپی تھی۔ ۲۷ سال سے ۴۳ سال تک کی عمر کا زمانہ غزنوی و سلجوقی درباروں میں گزارا۔ پھر ایک ذہنی انقلاب نے اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل کے رکھ دیا اور ملازمت ترک کر کے وہ تلاش حق میں ایک طویل سفر پر روانہ ہوا۔ اس سات سالہ سیاحت میں اس نے چار مرتبہ حج کیا۔ مختلف اسلامی ممالک میں پھرتا رہا۔ وہ تین سال مصر میں مقیم رہا۔ اسمٰعیلی عقائد سے اس کی روح کو کچھ اطمینان ملا چنانچہ اس نے یہی مذہب اختیار کر لیا۔ مستنصر باللہ نے اسے حجت خراسان کا لقب عطا کیا۔ اور اسے ایران میں اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کے لئے مامور کیا۔ پھر اس نے اپنا سفر نامہ مرتب کیا۔ ناصر خسرو نے واپسی پر اپنے وطن بلخ میں اسماعیلی مذہب کی تبلیغ شروع کی تو علماء و امراء نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کام میں اس نے بڑی زحمتیں اٹھائیں، بلخ چھوڑنا پڑا۔ جہاں بھی گیا لوگوں نے اسے ذلیل و خوار کیا اس دوران میں اس نے فارسی نثر میں "زاد المسافرین" لکھی۔ اس میں اس نے اسمٰعیلی عقائد کی صداقت کو دلائل سے ثابت کیا ہے۔ ناصر خسرو ۴۵۶ھ میں بدخشاں پہنچا اور یمگان میں اس نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ ۴۸۱ھ میں اس نے یہیں وفات پائی۔

تصنیفات

نثری تصنیفات سفر نامہ، زاد المسافرین اور وجہ دین کے علاوہ ایک دیوان ناصر خسرو کی یادگار ہے جو ساڑھے گیارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ روشنائی نامہ اور سعادت نامہ اس کی دو مثنویاں ہیں۔ یہ مکمل مثنویاں پند و موعظت کے موضوع پر فارسی میں قدیم ترین مثنویاں ہیں۔

ناصر خسرو کے دیوان میں جو قصائد ملتے ہیں وہ کسی کی مدح میں نہیں کہے گئے۔ ان کا موضوع پند و حکمت، عقل و دانش کی فضیلت اور دنیائے دوں کی مذمت ہے۔ ناصر خسرو غزنوی دور کے شاعر سنائی کی حکیمانہ شاعری سے بہت متاثر تھا اور اس نے اس کے کام کو آگے بڑھایا۔ اسمٰعیلی مبلغ ہونے کی حیثیت سے اس نے شاعری کو اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ ان افکار کو منطقی استدلال کے ساتھ شاعرانہ پیرائے میں پیش کیا۔ وہ ہر چیز کے باطنی پہلو پر زور دیتا ہے۔ ناصر خسرو نے اپنے زمانے کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے تھے۔ اس کا بیان اس نے اپنی شاعری میں بڑے پُر درد طریقے سے کیا ہے۔ حکیمانہ مطالب اور مخصوص اسلوب بیان نے اسکی شاعری کو ایک

انفرادیت بخشی ہے۔ اس نے اپنے شعروں میں قرآن مجید سے بڑا استفادہ کیا ہے۔ اس کی زبان غزنوی و سامانی شعرا سے ملتی جلتی ہے لیکن اس کے ہاں عربی کلمات کا استعمال ان کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

نکوہش مکن چرخ نیلوفری را | بروں کن ز سر باد خیرہ سری را
بری دان ز افعال چرخ برین را | نشاید نکوہش ز دانش بری را
ہمی تاکند پیشہ عادت ہمی کن | جہاں مر جفا را تو مر صابری را
چو خود تو کنی اختر خویش را بد | مدار از فلک چشم نیک اختری را

امیر معزی (م ۵۲۰ھ)

ابو عبداللہ محمد بن عبدالملک معزی نیشاپوری سلطان سنجر کا درباری شاعر تھا۔ اس کا باپ برہانی الپ ارسلان اور ملکشاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ معزی ملکشاہ کی بارگاہ میں اپنے والد کا جانشین بنا۔ ایک مدت تک بادشاہ کی توجہ سے محروم رہا۔ آخر ایک امیر کی وساطت اور اپنی بدیہہ گوئی سے اس نے ملکشاہ کو اپنی جانب متوجہ کر ہی لیا۔ معز الدولہ ملکشاہ کا لقب تھا اس نے شاعر کو اپنے نام سے ملقب کر کے امیر معزی کہا اور وہ اسی لقب سے مشہور ہوا۔

ملکشاہ کے انتقال کے بعد سلطان سنجر کے عہد میں اس کی قدر و منزلت میں بہت اضافہ ہوا سلطان نے اسے اپنا ملک الشعرا بنایا۔ معزی کو سنجر کے دربار میں وہی مقام حاصل تھا۔ جو رودکی کو سامانی عہد میں اور عنصری کو غزنوی عہد میں حاصل تھا۔ سلطان سنجر ایک دن تیراندازی کی مشق کر رہا تھا کہ ایک تیر غلطی سے معزی کے آ لگا کہتے ہیں یہی تیر معزی کی ہلاکت کا باعث بنا۔

معزی قصیدہ نگاری میں عنصری فرخی اور منوچہری کا معتقد تھا۔ اس کے قصائد میں عنصری اور فرخی کے الفاظ و تراکیب عام ملتے ہیں۔ منوچہری کی طرح "سبک عرب" کی خصوصیات بھی اس کے قصائد میں پائی جاتی ہیں۔ استاد جلیل الشان فردوالفقر نے اس تقلید کی بنا پر تو یہاں تک کہہ دیا کہ معزی کی گردن پر دو شاعروں (عنصری و فرخی) کے دیوانوں کا قرض ہے اس کے بعض قصائد اپنے زمانے کے تاریخی و معاشرتی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ای ساربان منزل مکن جز در دیار یار من
تا یک زمان زاری کنم بر ربع و اطلال و دمن

ربع از دلم پرخون کنم خاک دمن گلگوں کنم
اطلال را جیحوں کنم از آب چشم خویشتن

از وردی یار خرگہی ایوان ہمی بینم تہی
وز قد آن سرو سہی خالی ہمی بینم چمن

عمر خیام

ابوالفتح عمر خیام بن ابراہیم نیشاپور میں ۴۰۸ھ یا ۴۱۰ھ میں پیدا ہوا۔ ۵۱۷، یا ۵۲۰ھ میں وفات پائی۔ خاندانی پیشہ شاید خیمہ دوزی تھا اس لئے خیام کے لقب سے مشہور ہوا۔ خیام اپنے وقت کا نامور ریاضی داں اور منجم تھا۔ اس نے فلسفہ بوعلی سینا سے پڑھا اور قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم امام موفق م ۴۳۰ھ سے پائی۔ حسن بن صباح، نظام الملک اور خیام کے ہم سبق ہونے کی روایت پر محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ تینوں کی عمروں میں بڑا فرق تھا لیکن سید سلیمان ندوی مرحوم کا خیال ہے کہ یہ تینوں ہم عمر تو نہیں تھے۔ لیکن ان کا ہم سبق ہونا بعید نہیں۔ کیونکہ یہ ہمدرسی ابتدائی تعلیم میں نہیں تھی بلکہ دینیات کی اعلیٰ تعلیم میں تھی اور اس میں مختلف عمروں کے طلبہ کا درس ہونا خارج از امکان نہیں۔

خیام کے زمانے میں اس کی شہرت فلسفی، منجم اور ریاضی داں کی حیثیت سے دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے معاصرین میں بطور شاعر زیادہ مشہور نہیں تھا۔ ملک شاہ سلجوقی نے اپنے رصدخانہ کے لئے جن ماہرین علم نجوم کو دعوت دی۔ خیام بھی ان میں شامل تھا اور جو زیچ اس طرح مرتب ہوئی وہ خیام ہی کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔

سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "خیام" میں فلسفہ، ہیئت، نجوم اور ریاضی کے موضوعات پر خیام کی پندرہ کتابوں کی فہرست دی ہے۔ اس میں اس کی رباعیات اور فارسی تصنیف نوروزنامہ بھی شامل ہے۔ خیام کی بہت سی کتابوں کے تراجم یورپی زبان میں ہو چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فراغت کے لمحات فکر شعر میں بسر ہوتے تھے۔ خیام کی شاعری کا کل سرمایہ چند رباعیات ہیں۔ انہی کی بدولت خیام کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی۔ ان رباعیات کی صحیح تعداد کا تعین ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ان کی تعداد ۶۶ سے لے کر ایک ہزار دو سو تک بیان کی گئی ہے۔ یہ اختلاف بھی ان رباعیات کی شہرت کی ایک دلیل ہے۔ ایرانی محقق الاستاد مجتبیٰ مینوی کو قونیہ کے ایک کتب خانے میں خیام کا ایک فارسی قصیدہ بھی ملا ہے۔

خیام نے اپنی رباعیات میں بڑی سادہ زبان اور سہل انداز میں نہایت لطیف اور حکیمانہ افکار بڑی مہارت سے پیش کئے ہیں۔ ان رباعیات میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی، خوشدلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلہ جبر اور توبہ و استغفار کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔ خیام کے نزدیک یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ انسان کو لمحات مسرت بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ اور انسان

اس دنیا میں بالکل بے بس و مجبور ہے ۔ لیکن ان حالات میں عیش کوشی اور نشاط طلبی کی ضرورت پر زور دیتا ہے ۔ اس کی عشرت پرستی اور لذت پرستی یونانی فلسفی ایپکیورس کی یاد دلاتی ہے ۔ شراب کی تعریف میں خیام کو فارسی شاعری کا ابونواس کہا جاسکتا ہے ۔

یورپ میں خیام کو اپنی رباعیات کی وجہ سے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اس کے تراجم اب دنیا کی تمام زبانوں میں ہوچکے ہیں لیکن انگریزی شاعر فٹزجیرالڈ کا انگریزی ترجمہ بہت زیادہ مقبول ہوا ۔ یورپ میں اس کی مقبولیت کا بڑا سبب اس کی شاعری کا یہی نشاطیہ پہلو بھی ہے ۔

می خوردن و شاد بودن آئین منست　　　فارغ بودن ز کفر و دین دین منست
گفتم بعروس دہر کابین تو چیست　　　گفتا دل خرم تو کابین منست

ہر ذرہ کہ بر خاک زمینی بودست　　　خورشید رخی زہرہ جبینی بودست
گرد از رخ نازنین بآقدم فشان　　　کان ہم رخ و زلف نازنینی بودست

حکیم سنائی (م ۵۳۵)

حکیم ابو المجد مجدود بن آدم سنائی ، غزنین میں پانچویں صدی ہجری کے وسط یا نصف دوم میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے اپنے بعض اشعار میں اپنا نام حسن بھی استعمال کیا ہے ۔ شاعری کے فن میں مہارت حاصل کر کے سنائی دربار غزنوی سے وابستہ ہو گئے اور ان کے دیوان میں سلطان مسعود بن ابراہیم (۴۹۲ھ ۔ ۵۰۸) اور یمین الدولہ بہرام شاہ بن مسعود (۵۱۱ ۔ ۵۵۲) کی مدح میں قصائد ملتے ہیں ۔ انہوں نے سلجوقی بادشاہ سلطان سنجر کی بھی مدح کی ۔ خراسان کے امرا و وزرا اور ممتاز شخصیتوں کے قصیدے بھی سنائی نے کہے ۔ قصیدہ گوئی کو انہوں نے جاہ و منزلت کے حصول کا ذریعہ بنایا ۔

ان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آیا کہ انہوں نے مدح گوئی بالکل ترک کر دی ۔ ان کی زندگی اور شاعری دونوں کا رنگ ہی بدل گیا ۔ زندگی میں درویشی آ گئی ۔ شاعری مدح کی جگہ پند و حکمت سے مملو ہو گئی ۔

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا کہ سنائی کی زندگی میں فوری انقلاب ان کی مدح گوئی پر کسی مجذوب کے طعنے کا نتیجہ تھی ۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خراسان کے درویشوں کے ساتھ سنائی کے تعلقات قائم تھے ۔ ممکن ہے ان کے ساتھ مسلسل ملاقاتوں کے بعد انہوں نے قصیدہ گوئی ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہو ۔ سنائی ابو یوسف ہمدانی کے مرید تھے کسی خاص مجذوب کا قصہ ان کے کلام میں موجود نہیں ہے ۔ سنائی نے چند سال بلخ ، سرخس ، ہرات اور نیشاپور میں گزارے اور وہیں سے وہ حج کے لئے ارض مقدس روانہ ہو گئے ۔ ان کے قصائد میں اس کشمکش کا ذکر ملتا ہے ۔ حج سے واپسی پر سنائی کچھ

عرصے تک، سرخس میں رہے اور ۵۱۰ھ کے لگ بھگ وہ غزنین واپس آ گئے۔ اور اس حال میں آ گئے کہ غزنی میں ان کا اپنا گھر بھی نہیں تھا۔ خواجہ عبید احمد بن مسعود نے ان کے لئے ایک گھر اور اخراجات کا بندوبست کیا۔ خواجہ عبید کے کہنے پر ہی سنائی نے اپنا دیوان جمع کیا اور باقی زندگی گوشہ تنہائی میں گزار دی۔ دربارِ غزنین نے انہیں دوبارہ قبول کرنے پر رضامند تھا لیکن اس کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ اسی مدت میں سنائی نے اپنی شاہکار مثنوی "حدیقۃ الحقیقۃ" مکمل کی۔ آقائے مدرس رضوی نے بڑی تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ سنائی نے ۵۲۵ھ میں وفات پائی اور غزنین میں مدفون ہوئے۔ جہاں آج بھی ان کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔

سنائی کا دیوان بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں قصائد، غزلیات، رباعیات کے علاوہ ترکیب بند و ترجیع بھی موجود ہیں اور تہران سے آقائے مدرس رضوی کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ حدیقۃ الحقیقۃ کے علاوہ طریق التحقیق، سیر العباد، کارنامہ، عشق نامہ، عقل نامہ اور غربت نامہ ان کی مثنویات ہیں۔

سنائی اپنے اولین قصائد میں فرخی اور منوچہری سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں ان دونوں شاعروں کے اشعار کی تضمینیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن ان کا اصل سرمایہ ان کے ذہنی انقلاب کے بعد شاعری کی ہے۔ اس کلام میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور خیالات کی وسعت بھی۔ اس دور کی شاعری میں تزکیۂ نفس اور ترکِ ظاہر پرستی کی تلقین زیادہ ہے۔ یہاں سنائی زندگی کی ارفع حقیقتیں بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی زندگی میں خودشناسی اور خود آگاہی کی ایک ایسی منزل بھی آتی ہے جہاں انسان کو نظامِ کائنات اپنے تابع نظر آتا ہے۔

سنائی فارسی کے پہلے شاعر ہیں۔ جنہوں نے اس شان سے تصوف کے اسرار و رموز کو شاعری کی زبان میں بیان کیا۔ ان سے پہلے ابوسعید ابوالخیر کی رباعیات میں عارفانہ موضوعات ملتے ضرور ہیں۔ لیکن انہوں نے سنائی کی طرح تصوف کو شاعری کا ایک باقاعدہ اور مستقل موضوع نہیں بنایا۔ ابوسعید ابوالخیر کے ہاں چند رباعیات تصوف میں پائی جاتی ہیں لیکن ان میں صرف جوش و عشق کو پُر زور طریقے سے ادا کیا ہے۔ تصوف کے مسائل اسرار و معارف کو نہیں۔ سنائی کی مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ تصوف، و اخلاق کے کے موضوع پر سنائی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس مثنوی کے دس ابواب ہیں اور یہ خدا کی حمد و ثنا، رسولؐ اور صحابۂ رسولؐ کی نعت و منقبت، عقل و دانش اور علم کی فضیلت، بے پروائی اور اس کے نقصانات، سیاروں اور آسمانوں کے احوال، فلسفہ و حکمت، عشق و محبت، شاعر کے ذاتی حالات

اور بہرام شاہ کی تعریف پر مشتمل ہیں۔ بہریات میں موضوع کی وضاحت حکایتوں اور تمثیلوں سے کی گئی ہے۔ فارسی شاعری میں معمولی بات کو انوکھے پیرائے میں ادا کرنے یا معمولی واقعے سے فلسفیانہ استدلال پیدا کرنے کی روایت سنائی ہی سے شروع ہوتی ہے جسے عطار اور رومی نے کمال تک پہنچایا۔ شبلی نے سنائی کو فارسی کی اخلاقی شاعری کا بانی قرار دیا ہے۔ سنائی کی حدیقہ کے بعض مطالب پر علمائے وقت نے گرفت بھی کی لیکن علمائے بغداد نے فتویٰ دیا کہ اس میں کوئی بات خلاف اسلام نہیں ہے۔ ؎

مسلمانان مسلمانان مسلمانی مسلمانی — ازین آئین بی دینان پشیمانی پشیمانی
مسلمانی کنون اصیست برخرف وعاداتی — دریغا کو مسلمانی دریغا کو مسلمانی
فرو شد آفتاب دین برآمد روز بیدینان — کجا شد درد بودردا و آن اسلام سلمانی
جہان یکسر ہمہ پر دیو در غو شد دست را — کہ یارد کرد جز اسلام وجز سنت نگہبانی
شراب حکمت شرعی خورید اندر حریم دین — کہ محرومند ازین عشرت ہوس گویان یونانی

انوری

اوحدالدین محمد بن محمد انوری ابیورد کے ایک گاؤں بدنہ میں پیدا ہوا۔ اس نے جوانی کا زمانہ طوس میں تحصیل علم میں گزارا۔ منطق، فلسفہ، ہیئت، موسیقی اور نجوم میں اسے مہارت حاصل تھی۔ انوری کو ابن سینا سے اتنی عقیدت تھی کہ اس کی بعض کتابوں کو اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ حصول علم کے ساتھ ساتھ اس نے شعرگوئی کے فن میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے ایک درباری شاعر کو بڑی شان وشوکت سے جاتے دیکھا۔ تو اتنا متاثر ہوا کہ پڑھنا لکھنا ترک کر دیا۔ راتوں رات ایک شاندار قصیدہ کہا اور صبح سلطان سنجر کے حضور پیش کیا۔ سلطان نے اسے انعام واکرام دے کر شعرائے دربار میں شامل کر لیا لیکن یہ روایت درست نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جس قصیدے کا حوالہ دیا جاتا ہے

وہ فارسی کے شاہکار قصائد میں شامل ہے۔ کسی شاعر کی اولین کوشش اتنی شاندار نہیں ہو سکتی اس کے کلام کے اندر بعض داخلی شہادتیں بھی ملتی ہیں جن سے اس واقعہ کی تردید ہوتی ہے۔

انوری کا مولد بدنہ ابیورد، دشت خاوران کے علاقے میں واقع ہے۔ اس لئے شروع شروع میں انوری خاوری تخلص کرتا تھا اور اس نے اپنے استاد عمارہ مروزی کے کہنے پر یہ تخلص ترک کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ انوری کا لقب اس نے خود اپنے لئے اختیار نہیں کیا بلکہ لوگوں نے اس لقب سے اس کو پکارا اور اس نے اسے بطور تخلص استعمال کیا۔ سلطان سنجر کے علاوہ اس نے خراسان کی دیگر

کئی ممتاز شخصیتوں کے قصیدے بھی لکھے۔

انوری کو اہل بلخ کے ہاتھوں بڑی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بیان کی گئی کہ انوری نے ایک بار "قران کواکب" کے پیش نظر زبردست طوفان کی پیشین گوئی کی جس سے لوگ بہت خوفزدہ ہوئے لیکن اس کی یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی اور کچھ بھی نہ ہوا۔ اہل بلخ نے انوری کو بہت ذلیل کیا لیکن یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے درست نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ بلخ کی ہجو کسی اور شاعر نے کہی لیکن وہ انوری کے نام سے مشہور ہو گئی۔ انوری جب ایک بار وہاں گیا تو اہل بلخ نے اس کی خوب خبر لی۔ قاضی حمید الدین صاحب مقامات حمیدی کی مداخلت سے اس کی جان بچی۔ قاضی حمید الدین کی مدح میں انوری نے جو قصیدہ کہا اس میں اس واقعہ کی جانب بھی اشارے موجود ہیں۔ انوری کی وفات کے بارے میں محققین کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بہرحال اس کا انتقال ۵۸۱ – ۵۸۶ کے درمیان ہوا۔

انوری کا شمار فارسی کے صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ اس کی عظمت کا اعتراف اس کے زمانے میں بھی کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد بھی۔ مجد ہمگر کے زمانے میں جب لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا کہ انوری بڑا شاعر ہے یا ظہیر فاریابی؟ تو اس نے انوری ہی کو ترجیح دی۔ انوری کا نام فارسی کے پیغمبران سخن میں فردوسی اور سعدی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

انوری کو فارسی شعراء میں ابوالفرج رونی کے ساتھ بڑی وابستگی تھی اس کا دیوان ہمیشہ زیر مطالعہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کی قصیدہ گوئی پر رونی کے اثرات بڑے نمایاں ہیں۔ قصیدے میں انوری کا سب سے بڑا کمال یہ ہے۔ کہ وہ انتہائی دقیق معانی بے حد سادہ زبان میں بیان کر دیتا ہے۔ فلسفہ و نجوم کے رموز اس کی شاعری میں آئے ہیں لیکن اس نے زبان گفتگو کی استعمال کی ہے بلکہ اسے اکثر قصائد میں مکالمہ کا لطف آتا ہے۔ فلسفہ، نجوم اور ہیئت کے مسائل سے کبھی کبھی اس کے اشعار گراں بار ہو جاتے ہیں اور ان کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔

انوری کے دیوان میں غزلوں کا تناسب بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کے ہاں سادہ رواں زبان میں فنائی خیالات غزل بن جاتے ہیں۔ انوری اور ظہیر فاریابی نے سعدی سے پہلے غزل کی زمین ہموار کی۔ قطعہ گوئی میں بھی انوری کا جواب نہیں۔ اس نے قطعات میں مدح و ہجو سے لے کر حکمت و موعظت اور اجتماعی تنقید تک ہر قسم کے مضامین بڑے سلیقے سے نظم کئے ہیں۔ سلطان سنجر کی غزوں کے ہاتھوں اسیری پر اس کا قصیدہ "اشک ہائے خراسان" جذبات نگاری کی اعلیٰ مثال ہے۔

بازاین چہ جوانی و جمالست جہان را — وین حال کہ نو گشت زمین را و زمان را
مقدار شب از روز فزون بود و بدل شد — ناقص ہمہ این را شد و زاید ہمہ آن را

در باغ چمن ضامن گل گشت ز بلبل — آن روز کہ آوازہ در افگند خزان را
اکنون چمن باغ گرفتار تقاضاست — آری بدل خصم بگیرند ضمان را
بلبل ز نوا ہیچ ہمی کم نزند دم — زان حال ہمی کم نشود سرو نوا را
ابر سپر سبزہ مگر نافہ چینا خت — کز خاک چمن آب بشد عنبر و بان را

در لالۂ نورستہ نہ افروختہ شمعیست — صد روشنی زچہ دارد ہمہ اطراف مکان را
فی تیغ بہادرست کہ در معرکہ کردست — از خون دل دشمن شدہ لعل سنان را
پیروز شہ عادل منصور مظفر — کز عدل دگر بارہ بنا کرد جہان را
آن شاہ سبک حملہ کہ در کف جودش — بی وزن کند رغبت او حمل گران را

خاقانی

خاقانی کا نام بدیل اور لقب افضل الدین تھا چیکوسلواکی مستشرق پروفیسر ریپکا[1] کی تحقیق کے مطابق ۵۱۵ھ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ علی ایک بڑھئی تھا۔ اس کی ماں ایک عیسائی کنیز تھی جو بعد میں مسلمان ہو گئی۔ خاقانی کا چچا مرزا کافی عثمان ایک فاضل شخص تھا۔ الٰہیات، طب اور فلسفے سے خصوصی دلچسپی تھی۔ خاقانی ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کا یہ زمانہ بڑی تنگدستی میں بسر ہوا لیکن اس کے چچا مرزا کافی عثمان نے اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ طب، ہیئت، الٰہیات اور عربی زبان کی تحصیل کے ساتھ ساتھ خاقانی نے شعر گوئی بھی شروع کر دی تھی۔ اور ابوالعلا گنجوی سے اصلاح لیا کرتا تھا۔

ابوالعلا نے پہلے اسے شاگردی میں اور پھر فرزندی میں قبول کیا اور اسی کی وساطت سے وہ خاقان اکبر منوچہر بن فریدون شیروانشاہ کے دربار میں پہنچا۔ اسی خاقان کی نسبت سے اس نے پہلا تخلص حقائقی ترک کر کے خاقانی تخلص اختیار کیا۔ دربار میں اسے بڑی قدر و منزلت نصیب ہوئی اور اس نے گراں بہا صلے پائے۔ استاد گنجوی اور شاگرد میں زیادہ دیر تک اچھے تعلقات

---

[1] مجلہ دانشکدہ ادبیات شمارہ ۳ سال دہم

قائم نہ رہ سکے اور دونوں نے ایک دوسرے کی ہجو کی۔ خاقانی نے جو سلوک اپنے استاد سے کیا اس کو اپنے شاگرد مجیر بیلقانی کے ہاتھوں ویسا ہی سلوک برداشت کرنا پڑا۔

خاقانی کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا لیکن خاقان اسے اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس بات کا اظہار اس کے کئی قصیدوں میں ملتا ہے۔ ایک بار سفر کی اجازت ملی تو رَے تک پہنچا تھا کہ اسے خراسان پر غزوں کے حملے کی خبر ملی اور وہ واپس آگیا۔ دوسری دفعہ ۵۵۱ھ میں خاقانی حج بیت اللہ کے لئے گیا اور اس کی مثنوی تحفۃ العراقین اسی حج کے تاثرات پر مبنی ہے اور فارسی میں یہ پہلا منظوم سفرنامہ ہے۔ اسی سفر کے دوران خاقانی نے قدیم ایرانی شہر مدائن کے کھنڈروں سے متاثر ہو کر ایوان مدائن کے بارے میں ایک قصیدہ لکھا جو فارسی شاعری کے شاہکاروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ خاقانی کی ایران قدیم کے ساتھ عقیدت کا مظہر ہے لیکن پروفیسر ریپکا کے خیال میں یہ قصیدہ خاقانی نے سفر سے واپسی کے کچھ سال بعد لکھا اور یہ کہ اس کا موضوع ایوان مدائن نہیں بلکہ ان کے حوالے سے بے ثباتی عالم کا نقشہ کھینچا ہے۔ قصیدہ پڑھ کر بھی یہی محسوس ہوتا ہے خاقانی اسی سفر کے دوران اصفہان بھی گیا جہاں لوگوں کے ہاتھوں ایک ہجو کی وجہ سے ذلیل ہونا پڑا جو اس کے شاگرد مجیر بیلقانی نے اصفہان کے بارے میں کہہ کر خاقانی کے نام سے مشہور کر دی تھی لیکن اہل اصفہان نے اس سلسلہ میں خاقانی کی صفائی کو قبول کر لیا۔

اس سفر سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد ۵۵۳ھ میں درباری ریشہ دوانیوں کی وجہ سے خاقانی کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ قید میں خاقانی نے بڑے اعلیٰ پائے کے قصیدے لکھے۔ خاقانی کی ساری زندگی تلخیوں میں گزری۔ وہ اس دربار سے مطمئن نہیں تھا لیکن وہ یہاں رہنے پر مجبور تھا۔ اس نے خوارزم شاہیوں کے ہاں جانے کی کوشش کی تو ان کے درباری شاعر رشید وطواط نے اس کی پیش نہ چلنے دی۔ سلجوقی دربار کی تمنا کی تو سلجوقیوں کی سلطنت غزوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئی۔ شروان شاہ میں رہتے ہوئے وہ مختلف بادشاہوں کو قصائد بھیجتا رہا لیکن اسے اس کی خواہش کے مطابق کوئی ممدوح نہ ملا۔ ۵۷۱ھ میں اس کا جوان بیٹا اس دنیا سے چل بسا پھر اس کی رفیقہ حیات بھی انتقال کر گئی۔ ان صدمات سے خاقانی گوشہ نشین ہو گیا اور ۵۹۵ھ میں اس نے تبریز میں وفات پائی۔ اور سرخاب میں مزار الشعرا تبریز میں مدفون ہوا۔

خاقانی کا شمار فارسی کے صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ حکمت علمی کو شعر کے دلکش پیکر میں بڑی خوبی سے سمو دیتا ہے۔ وہ طب، فلسفہ اور الٰہیات میں دسترس رکھتا تھا۔ اپنی عیسائی ماں کی وجہ سے وہ مسیحی روایات سے آشنا ہوا۔ اس کے کلام میں اس کی علمی

فضیلت کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے قصائد میں مسیحی روایات و اسلامی تعلیمات کے حوالے عام ملتے ہیں۔ پروفیسر ریپکا کے خیال میں بعض عیسائی دعاؤں کے متن کے تراجم بھی ملتے ہیں۔
خاقانی نے اپنے کلام میں مختلف علوم کی اصطلاحات کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کیا ہے۔ ان علوم سے واقفیت کے بغیر اس کے کلام کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس کے باوجود اس کے دیوان میں سادہ و رواں قصائد بھی موجود ہیں جو اس کی قلبی واردات کے آئینہ دار ہیں۔ بعض قصیدے واقعہ نگاری کا عمل نمونہ ہیں۔ کچھ قصیدوں میں ردیف تو ہے لیکن قافیہ نہیں اور اس کی ردیفیں کافی مشکل ہیں۔ بعض قصیدوں کی تشبیب میں مناظر فطرت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔
خاقانی کو ساری عمر مدح سرائی کرنی پڑی اور اس نے اس کا حق ادا کیا لیکن اس کی طبیعت میں ایک حکیمانہ رجحان بھی موجود تھا۔ قصائد میں وہ کہیں کہیں حکیمانہ باتیں بھی کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ سنائی سے بہت متاثر تھا۔ اس نے چھوٹی بحروں میں طویل قصیدے لکھے۔ ترکی کے محقق احمد آتش مرحوم کا خیال ہے کہ خاقانی پہلا شخص ہے جس کے ہاتھوں فارسی کی غزل کلاسیکی اپنے کمال کو پہنچی لیکن اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ خاقانی کے کلام پر تصوف کے بھی گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔

صبحدم چون کلہ بندد آہ دود آسای من	چون شفق در خون نشیند چشم شب پیمای من
مجلس غم ساختہ است و من چو بید سوختہ	تا بمن راوق کند مژگان می پالای من
تیرباران سحر دارم سپر چون نفگند	این کہن گرگ خشن بارانی زرغوای من
این خراس گردون کہ چون ریم آہنم پالود سخت	شد کلاہی پر تنش از دود دل دروای من

نظامی گنجوی حکیم ابو محمد نظام الدین الیاس بن یوسف روسی آذربائیجان کے شہر گنجہ کے نواحی علاقے اران (موجودہ کیرف آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت ۵۳۰ ھ-۵۴۰ ھ کے درمیان ہوئی۔ والدین بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ تعلیم و تربیت ماموں کے زیر سایہ ہوئی۔ شعر و شاعری سے فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ اپنے شہر گنجہ میں ہی گزارا۔ صرف ایک بار آذربائیجان کے حکمران اتابک قزل ارسلان کے بلاوے پر گئے۔ نظامی کی زندگی ہی میں ان کی شاعری کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ تمام معاصر حکمران ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے لئے گرانقدر صلے بھیجتے رہتے تھے لیکن یہ کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔ نظامی بڑے متقی، پرہیزگار اور عبادت گزار شخص تھے۔ جوانی

میں علم نجوم اور ہیئت سے بھی دلچسپی رہی لیکن آخری عمر گوشہ نشینی میں گزاری۔ ان کا انتقال گنجہ ہی میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ سالِ وفات کے بارے میں شدید اختلافات ہے مرحوم سعید نفیسی کے خیال میں نظامی کا انتقال ۵۹۸ھ میں ہوا۔ ڈاکٹر صفا ۶۱۴ھ کو اقرب قرار دیتے ہیں۔

نظامی نے قصائد اور غزلیں بھی کہیں۔ قصائد میں سنائی کی پیروی کرتے ہوئے وعظ و نصیحت پر زیادہ زور دیا لیکن ان کی شاعرانہ عظمت اس کی پانچ مثنویوں پر مبنی ہے جو خمسہ نظامی یا پنج گنج کے نام سے بھی مشہور ہیں اور نظامی کے بعد آنے والے بہت سے شعراء نے ان کا جواب لکھا ان میں امیر خسرو دہلوی، جامی اور فیضی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان مثنویوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) مخزن اسرار: یہ نظامی کی پہلی مثنوی ہے۔ اس کے بیس مقالے ہیں اور اس کا موضوع پند و موعظت ہے۔ یہ مثنوی ۵۵۲ھ میں مکمل ہوئی۔ ۲۳۰۰ اشعار پر مشتمل ہے اور فخرالدین بہرام شاہ حکمران ارزنجان کے نام معنون کی گئی ہے۔

(۲) خسرو شیریں: ۷۰۰۰ اشعار پر مشتمل یہ عشقیہ مثنوی قزل ارسلان کے نام سے لکھی اور یہ ۵۷۶ھ میں مکمل ہوئی۔

(۳) لیلیٰ مجنوں: یہ بھی ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ ۵۱۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اور خاقان ابوالمظفر اخستان بن منوچہر کے نام منسوب ہے۔ یہ مثنوی ۵۸۴ھ میں تکمیل کو پہنچی۔

(۴) ہفت پیکر یا ہفت گنبد یا بہرام نامہ: یہ مثنوی ساسانی بادشاہ بہرام گور کے واقعاتِ زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ ۵۹۳ھ میں مراغہ کے بادشاہ علاؤالدین کرپ ارسلان کے نام منسوب ہے۔

(۵) اسکندر نامہ: یہ مثنوی دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے کا نام شرف نامہ ہے جو اس کی کی ولادت سے فتح ممالک اور وطن کو واپسی کے واقعات پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے کا نام اقبال نامہ ہے یہ اسکندر کے انجام سے تعلق رکھتا ہے۔

نظامی پہلے داستان سرا تو نہیں ہیں لیکن انہوں نے اس فن کو کمال تک ضرور پہنچایا۔ یہ داستان کی مختلف کڑیاں کو بڑی ہنرمندی سے مثنوی پیش کرتے ہیں۔ اور واقعات کی تصویر کشی میں اس کی تمام جزئیات سے کام لیتے ہیں۔ جذبات نگاری میں ان کی نظر جذبات کے ان عمیق پہلوؤں پر رہتی ہے جو عام نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ واقعات کے ضمن میں پند و موعظت کا موقع

بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ طرز بیان میں انہیں ہمیشہ ترکیب تازہ کی تلاش رہتی ہے۔ ان کی تراکیب میں جدت اور تشبیہ و استعارات میں ندرت پائی جاتی ہے۔

نظامی اپنے کلام کی جامعیت کے اعتبار سے بھی فارسی کے منفرد شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں رزم بزم، عشق، فلسفہ و اخلاق سبھی کچھ موجود ہے۔

خداوندا در توفیق بگشای   نظامی را رہ تحقیق بنمای
دلی دہ کو یقینت را بشاید   زبانی کآفرینت را سراید
مدہ ناخوب را بر خاطرم راہ   بدار از ناپسندم دست کوتاہ
درونم را بنور خود برافروز   زبانم را ثنای خود در آموز
بداودی دلم را تازہ گردان   زبورم را ثنای خود در آموز

ظہیر فاریابی

ظہیر الدین ابوالفضل طاہر بن محمد فاریابی اپنے عہد کا ممتاز شاعر تھا۔ اسکی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا دیوان کعبہ میں بھی پڑا ہو تو اس کو چرا لینا خوش ذوقی کی دلیل بتایا گیا ہے۔ ظہیر بلخ کے نزدیک جوزجان کے ایک قصبے فاریاب میں چھٹی صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوا۔ اس کی جوانی کا زمانہ فاریاب اور نیشاپور میں تحصیل علم میں بسر ہوا۔ نیشاپور میں اس کا قیام تقریباً چھ سال رہا۔ انوری نے ۵۸۲ھ کے قرآن کواکب اور اس کے نتیجے میں طوفان کی جو پیشین گوئی کی تھی۔ ظہیر نے اسکی تردید میں ایک رسالہ لکھا اور اسے طغانشاہ ابن موید کے حضور پیش کیا لیکن بادشاہ نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ظہیر ۵۸۲ھ میں بادشاہ کی سرد مہری سے دل برداشتہ ہو کر اصفہان چلا آیا۔ یہاں اس نے دو سال قیام کیا اور صدر الدین خجندی کی مدح کی۔ اصفہان میں بھی اسے سکون و اطمینان حاصل نہ ہوا۔ وہاں سے اس نے آذربائیجان کا رخ کیا۔ اس کے ممدوحین میں طغرل بن ارسلان (۵۷۳ھ – ۵۹۰ھ) قزل ارسلان (۵۸۱ – ۵۸۷ھ) اور اتابک نصرۃ الدین ابوبکر قابل ذکر ہیں۔ آخری زمانے میں ظہیر نے دربار سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بقیہ عمر یاد الہی میں گزار دی۔ وفات ۵۹۸ھ میں ہوئی اور مدفن مزار الشعراء تبریز میں ہے۔

ظہیر کو اپنے علم و فضل اور قدرت کلام پر بڑا ناز تھا۔ اور وہ اپنے معاصرین مثلاً جمال الدین اصفہانی، مجیر بیلقانی، خاقانی شروانی اور نظامی وغیرہ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ نقادوں نے بھی اس کے بارے میں مبالغے سے کام لیا اور بعض نے تو اسے انوری سے بھی بڑھا دیا لیکن اس میں حقیقت نہیں ہے۔ انوری کے ساتھ اس کے مقابلے کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے قصیدہ گوئی

میں انوری کے اسلوب کو کمال تک پہنچایا۔ اس کا کلام انوری کی طرح رواں اور معانی کی تہوں سے پُر ہے۔ اس کے ہاں مشکل ردیفیں بھی ملتی ہیں لیکن روانی کلام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ قصیدہ گوئی میں ظہیر کا مبالغہ فارسی شاعری میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ قزل ارسلان کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ "اندیشہ نو آسمانوں کو زیر رکھتا ہے تاکہ قزل کی رکاب کو بوسہ دے سکے۔ اس مبالغے پر سعدی اور جامی نے گرفت کی ہے۔

ظہیر نے غزل کی جانب بھی خاص توجہ دی۔ وہ ان شعراء میں شامل ہے جنہوں نے غزل کیلئے زمین ہموار کی۔ اس کے دیوان میں قصائد اور غزلیات ہیں اس کی غزلیات لطیف معانی اور نرم و ہموار الفاظ کا بہترین امتزاج ہیں۔ ظہیر کو فارسی غزل کے ارتقاء میں انوری اور سعدی کی درمیانی کڑی کہا گیا ہے۔

سپیدہ دم کہ شدم محرم سرای سرور	شنیدم آیۂ قرآنی اللہ از لب حور
نگاہش جان من آمد از حضرت قدس	کہ ای خلاصۂ تقدیر و زبدۂ مقدور
جہان رباط خرابیست برگذرگہ سیل	گمان مبر کہ یک مشت گل شود معمور
مگر تو بی خبری کاندرین مقام ترا	چہ دشمنان حسودند و دوستان غیور
نگہش یا بسلامت بجا منی برسی	کہ راہ سخت مخوف است و منزلت بس دور
ببین کہ چند فراز و نشیب در راہ است	ز آستان عدم تا بہ پیشگاہ نشور
ترا مسافت دور و دراز در پیش است	بدین دو روزہ اقامت چرا شوی مغرور

شیخ عطار نیشاپوری

شیخ فریدالدین محمد عطار چھٹی صدی ہجری کے وسط میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابوبکر ابراہیم عطار (دوا فروش) تھے۔ فریدالدین نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا۔ عطار نے اپنی جوانی کا زمانہ تحصیل علم میں گزارا۔ سیر و سیاحت بھی کی اور اس کے دوران میں اس زمانے کے معروف صوفیوں سے ان کی ملاقات بھی ہوئی۔ شیخ عطار مجدالدین بغدادی کے مرید تھے۔ انہوں نے شیخ الشیوخ رکن الدین سے بھی کسب فیض کیا۔

عطار دوا فروشی کے ساتھ ساتھ طبابت بھی کرتے تھے اور ہر روز پانچ سو آدمی انہیں نبض دکھاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑی فراغت کی زندگی گزار رہے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی حالت میں انقلاب آگیا۔ اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر درویشوں کے حلقے میں شامل ہو گئے شیخ کی اس تبدیلی حالت کے بارے میں ایک حکایت بیان کی گئی ہے کہ ایک دن شیخ اپنی

دکان میں کام میں مشغول تھے کہ ایک فقیر اس جگہ آیا اور اس نے کئی بار سوال کیا۔ شیخ متوجہ نہ ہوئے تو فقیر نے کہا اے خواجہ تو کس طرح مرے گا۔ عطار نے کہا جس طرح تو مرے گا۔ فقیر نے کہا تو میری طرح مر سکتا ہے۔ عطار نے کہا ہاں۔ فقیر نے اپنا کشکول سر کے نیچے رکھا اور اللہ کہہ کر وہیں جان دے دی۔ اس واقعہ نے عطار کی زندگی بدل کے رکھ دی۔ شیخ نے کھڑے کھڑے اپنی دکان لٹا دی۔ محققین اس واقعہ کو درست تسلیم نہیں کرتے۔

شیخ نے طویل عمر پائی۔ ساٹھ سال تک کے اشارات قران کے شمار میں ملتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مولانا روم کے والد بہاؤالدین محمدؒ بغداد جاتے ہوئے نیشاپور میں عطار سے ملے۔ شیخ نے جلال الدین رومی کو جو ابھی چھوٹے ہی تھے۔ اپنی مثنوی اسرار نامہ پیش کی۔ عطار کی تاریخ وفات کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ کسی تاتاری کے ہاتھوں ٦١٨ میں شہید ہوئے اور نیشاپور میں مدفون ہوئے۔

عطار کا شمار فارسی کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ١١٤ تک بتائی گئی ہے لیکن یہ مبالغہ ہے۔ تذکرۃ الاولیا (نثر) قصائد، اسرار نامہ، جواہر نامہ، مختار نامہ اور منطق الطیر قابل ذکر ہیں۔ عطار کے قصائد کا موضوع مدح کی بجائے الفت، پند و موعظت ہے۔ تشبیب اور تغزل سے بغیر ہیں۔ بعض نقادوں نے سوز و دلکشی میں عطار کی غزل کو سنائی کی غزل پر ترجیح دی ہے۔ منطق الطیر ٤٦٠٠ اشعار اور ٤٥ مقالوں پر مشتمل ایک تمثیلی مثنوی ہے۔ اس میں پرندے سی مرغ کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ طلب، عشق، معرفت، استغنا، توحید، حیرت اور فنا کی سات وادیوں سے گزرتے ہیں۔ آخری منزل پر صرف ٣٠ پرندے پہنچ پاتے ہیں۔ سیمرغ کا مسکن بھی وادی ہے۔ یہاں پہنچ کر ان پرندوں کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ سیمرغ اور ان تیس مرغ میں کوئی فرق نہیں اور وہ اپنی حقیقت کو پا لیتے ہیں جو خود ان کے اندر ہی موجود تھی۔

صوفیانہ مطالب بیان کرنے کے لئے عطار حکایتوں اور تمثیلوں سے کام لیتے ہیں۔ عطار کے اس طریقے کو مولانا روم نے کمال تک پہنچایا۔ رومی عطار کا نام بڑی عقیدت سے لیتے ہیں۔ عطار بڑی سادہ زبان میں تصوف کے معارف بیان کر جاتے ہیں۔ یہ سہولت اور سادگی کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ عطار کا کلام سادگی کے ساتھ ساتھ سوز و مستی اور ذوق و شوق سے بھرا ہوا ہے

یافت مرد گورکن عمرے دراز   سائلی گفتش کہ چیزے گوی باز
تا چو عمری گور کندی در مغاک   از عجائب ہیچ دیدی زیر خاک
گفت این دیدم عجائب حسب حال   کاین سگ نفسم ہمی ہفتاد سال

گر کند آن دید دیگ طاعت خرد   یک دم فرمان کی طاعت برد

اس دور کے دیگر شعراء

اسدی م ۴۶۵ھ

ابو نصر علی بن احمد اسدی طوسی نے شاہنامہ فردوسی کی تقلید میں رزمیہ مثنویاں لکھیں۔ ان میں گرشاسپ نامہ قابل ذکر ہے۔ یہ مثنوی اپنے دلچسپ قصے، ایران قدیم کے ماحول کی منظر کشی اور پند و نصائح کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لغت فرس بھی اسدی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

قطران تبریزی م ۴۶۵ھ

ابو منصور قطران تبریزی آذربائیجان کے حکمرانوں کا قصیدہ سرا تھا۔ قطران فارسی کے ادبی مرکز خراسان سے دور ضرور تھا لیکن غزنوی دور کے ممتاز شعراء کا کلام اس کے پیش نظر رہا۔ ناصر خسرو جب تبریز آیا تو وہ قطران سے بھی ملا اور اس نے فارسی کے بارے میں اپنی مشکلات ناصر خسرو سے پوچھیں۔ قطران مکتب خراسانی کا پیرو تھا لیکن اس کی تراکیب و تشبیہات میں خاصی تازگی اور جدت ہے۔

رشید الدین وطواط م ۵۷۳ھ

رشید الدین محمد عبد الجلیل عمری دربار خوارزم شاہ کا شاعر تھا۔ بڑا حاضر جواب، تیز زبان اور فاضل شخص تھا۔ کوتاہ قامتی اور دبلے پن کی وجہ سے لوگ اسے وطواط (چڑیا) کہتے تھے۔ اس کے اکثر قصیدے خوارزم شاہ کی جنگوں اور مہموں کے بارے میں ہیں۔ وطواط صنائع بدائع پر جان دیتا تھا۔ اس موضوع پر اس نے ایک کتاب حدائق السحر کے نام سے لکھی۔

شہاب الدین ادیب صابر بن اسمٰعیل ترمذی

سلطان سنجر کے درباری شاعر رشید وطواط کا سب سے بڑا حریف تھا۔ انوری جیسا شخص بھی اس کا نام بڑے احترام سے لیتا ہے۔ اس کے قصائد میں عشق و مستی جھلکتی ہے۔ تشبیب میں تغزل کا رنگ ہے۔ بعض قصیدوں میں پند و موعظت کا رنگ بھی موجود ہے۔ ادیب صابر کی وفات ۵۴۶ھ میں ہوئی۔

مجیر بیلقانی

مجیر الدین آذربائیجان کے ایک قصبے بیلقان کا رہنے والا تھا۔ تعلیم و تربیت شروان شاہ میں پائی۔ شاعری میں خاقانی کا شاگرد تھا لیکن خاقانی سے تعلقات جلد ہی خراب ہو گئے اور شاگرد نے استاد کی ہجو کی۔ مجیر اتابکان آذربائیجان کے دربار سے وابستہ رہا۔ انہی کی طرف سے مالیہ کی وصولی کے لئے اصفہان بھیجا گیا۔ اہل اصفہان کی بدسلوکی سے تنگ آ کر

اس نے اصفہان کی ہجو لکھی۔ اصفہان کے شعراء نے جواباً اس کی ہجو لکھی۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ اصفہانیوں نے اسے ۵۸۶ھ میں قتل کر دیا۔

مجیر کا دیوان اعلیٰ قصائد اور لطیف غزلیات پر مشتمل ہے۔ اشعار کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچتی ہے۔ اس کے کلام پر خاقانی کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔

فلکی شیروانی

ابو النظام نجم الدین محمد فلکی شیروان کے علاقے شماخی کا رہنے والا تھا۔ فلکیات کا زبردست عالم تھا۔ اسی مناسبت سے اس نے اپنا تخلص فلکی رکھا۔ وہ ساری عمر شیروان شاہ سے باہر نہیں گیا اور خاقان اکبر منوچہر بن فریدون کی مدح میں قصیدے لکھتا رہا۔ درباری ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اسے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ فلکی ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کے دیوان میں قصائد و غزلیات کے علاوہ رباعیات اور مسمطات بھی موجود ہیں۔ اس کے اشعار کی تعداد سات ہزار بتائی جاتی ہے لیکن اس کے مطبوعہ دیوان میں بارہ سو سے زیادہ شعر نہیں ملتے۔

فلکی کا قصیدہ اس کے معاصرین خاقانی، ظہیر فاریابی کے مقابلے میں سادہ اور رواں ہے۔ قصیدے کا آغاز تشبیب یا تغزل سے کرتا ہے۔ اس کی وفات ۵۸۷ھ میں ہوئی۔

جمال الدین اصفہانی

جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن عبدالرزاق اصفہانی کا شمار چھٹی صدی کے مشہور شعراء میں ہوتا ہے۔ زرگری اس کا آبائی پیشہ تھا۔ ڈاکٹر صفا کا خیال ہے کہ اس نے آذربائیجان اور مازندران کا سفر کیا لیکن استاد نفیسی کی تحقیق کے مطابق جمال الدین ساری عمر اصفہان میں ہی رہا البتہ آذربائیجان اور مازندران کے حکمرانوں کی خدمت میں مدحیہ قصائد اصفہان ہی سے بھیجتا رہا۔ اصفہان کے ساتھ اسے بڑی محبت تھی اس نے مجیر بیلقانی کی اس ہجو کا جواب لکھا جو غلطی سے خاقانی کے نام سے منسوب ہو گئی تھی۔ جمال الدین کے اپنے معاصر شعراء مثلاً خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی، رشید الدین وطواط سے دوستانہ تعلقات قائم تھے۔

جمال الدین کے قصائد اس کے معاصرین کے مقابلے میں تکلف سے خالی اور سادہ رواں اور سہل ہیں۔ وہ انوری اور سنائی سے بہت متاثر ہے۔ جمال الدین کے اکثر قصیدوں کا موضوع اخلاقی مسائل ہیں۔ اس کے قصیدے کی تشبیب غزل سے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے۔ استاد سعید نفیسی مرحوم نے اس کی وفات ۶۰۰ھ اور ریو نے ۵۸۸ھ میں لکھی ہے۔

شرف الدین شفروہ

شرف الدین اصفہان کا رہنے والا تھا۔ استاد سعید نفیسی مرحوم نے شفروہ کو اس کا خاندانی نام بتایا ہے۔ عربی و فارسی دونوں زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ عربی میں اس نے جار اللہ زمخشری کی کتاب اطواق الذہب کے مقابلے میں اطباق الذہب لکھی۔ یہ پند و موعظت کے موضوع پر ایک خاص اسلوب میں ایک اعلیٰ کتاب ہے۔ اتابک شیرگیر اس کا بڑا ممدوح تھا اور اتابک نے اسے ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا تھا اس نے طغرل بن ارسلان (۵۷۳ - ۵۹۰) کی مدح بھی کی۔ پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری کی تحقیق کے مطابق شفروہ کی وفات ۶۰۰ھ میں ہوئی۔ تقریباً ۸ ہزار اشعار پر مشتمل اس کا دیوان ڈاکٹر جعفری کے مقدمے اور تصحیح کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

نثر سلاجقہ و خوارزمشاہیان

یہ دور فارسی نثر کی ترقی کا اہم ترین دور ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اس عہد کی نثر میں تنوع نظر آتا ہے۔ خالص ادب پاروں کے ساتھ ساتھ تاریخ و تذکرہ، مذہب و تصوف اور علوم و فنون پر بہت سی کتابیں اس زمانے میں تصنیف ہوئیں۔ نثری کتابوں کی کثرت سے قطع نظر اس عہد میں فارسی نثر کے اسلوب نے ارتقاء کے اہم مراحل طے کیے۔ فارسی کی سادہ اور رواں نثر اس عہد میں آہستہ آہستہ پر تکلف ہوتی چلی گئی۔ نثر میں صنائع بدائع، اقوال و امثال اور اشعار کا استعمال شروع ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ عہد سلاجقہ کے مدارس میں عربی فارسی کی تدریس کو فروغ حاصل ہوا۔ ان مدارس کے فارغ التحصیل فضلاء نے فارسی نثر کو عربی نثر کی طرح پر تکلف بنا دیا اور سجع کی حد تک تکلف کے یہ اولین آثار شیخ ابوسعید ابوالخیر کے ملفوظات کشف المحجوب کی عبارات میں ملتے ہیں۔ خواجہ عبداللہ انصاری کے ہاں یہ موزوں نثر اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ ابوالفضل میبدی کی تفسیر عبدالکریم شہرستانی کی ایک مجلس میں بھی یہ اسلوب نظر آتا ہے۔

اس اسلوب کے بعد نثر فنی یا مصنوع کا دور شروع ہوتا ہے۔ بعض نقاد خواجہ عبداللہ انصاری کی نثر فنی یا مصنوع کا پہلا نمونہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صفا کے خیال میں یہ نثر مرسل اور نثر فنی کے بین بین ہے۔ کلیلہ و دمنہ نثر مصنوع کے اسلوب میں پہلی کتاب ہے جو ۵۲۸/۵۳۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ دورۂ مغول میں یہ اسلوب اپنے کمال کو پہنچا۔ زیر بحث دور میں بعض کتابیں مثلاً سفرنامہ، قابوس نامہ، سیاست نامہ، نوروز نامہ سادہ اسلوب میں بھی تصنیف ہوئیں۔

(د) کتب ادبی

سفرنامہ حکیم ناصر خسرو

مشہور شاعر اور اسمٰعیلی مبلغ حکیم ناصر خسرو نے اپنی سات سالہ (۴۳۷ھ - ۴۴۴ھ) سیاحت کے بعد یہ سفرنامہ مرتب کیا وہ اس دوران حجاز مقدس اور ایران کے مختلف شہروں کے علاوہ ایشیائے کوچک، شام، فلسطین اور مصر گیا۔ اس نے اس سفر میں اپنے زمانے کے مشاہیر علماء و شعراء سے ملاقات کی۔ سفرنامہ مختلف مقامات کے جغرافیائی اور معاشرتی حالات کا ایک حسین مرقع ہے۔ اسمٰعیلی ہونے کی وجہ سے وہ مصر اور اس کے فاطمی خلیفہ کے نظم و نسق سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ سفرنامے کی زبان بالکل سادہ اور رواں ہے۔ عربی الفاظ کا استعمال بھی نسبتاً کم ہے۔ یہ سفرنامہ پہلی مرتبہ ۱۲۹۸ء میں فرانسیسی مستشرق شیفر کے اہتمام میں پیرس سے شائع ہوا تھا۔ ۱۲۹۹ء میں مولانا حالی نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ فارسی نثر میں ناصر خسرو کی دوسری تصانیف کے نام یہ ہیں۔ زاد المسافرین، وجہ دین، گشائش و رہائش، جامع الحکمتین۔

قابوس نامہ

یہ کتاب امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن سکندر بن قابوس نے اپنے بیٹے گیلانشاہ کی راہنمائی کے لئے ۴۷۵ھ میں تصنیف کی۔ اس کا اصل نام نصیحت نامہ تھا لیکن بعد میں قابوس نامہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ قابوس نامہ ایک دیباچہ اور چوالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں پچاس کے قریب دلچسپ حکایات موجود ہیں۔ ان میں سے بیشتر مصنف کے ذاتی تجربات کا نچوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں ایک شہزادے کی تربیت کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں پیش کئے گئے افکار عملی افادیت کے حامل ہیں۔ مثلاً ترجمہ :۔ راست گوئی میں شہرت حاصل کرو تاکہ اگر کبھی جھوٹ بھی بولو تو لوگ یہی سمجھیں کہ سچ ہے۔

مصنف نے اپنے بیٹے کو شراب نوشی کے متعلق یہ نصیحت کی:۔

ترجمہ :۔ شراب مذہباً حرام ہے لیکن مجھے خیال ہے کہ میں خواہ تمہیں کچھ بھی کہوں تم شراب ضرور پیو گے لیکن یہ یاد رکھو کہ صبح کے وقت کبھی شراب نہ پینا۔ شراب پینا گناہ ہے لیکن اگر تمہیں یہ گناہ کرنا ہی ہے تو سلیقے سے کرنا۔

قابوس نامہ کی زبان بھی سادہ اور رواں ہے لیکن اس میں قدامت کا احساس زیادہ

ہوتا ہے۔ اس کا طرز بیان شگفتہ ہے۔

سیاست نامہ : سیاست نامہ یا سیر الملوک سید الوزرا ابو علی حسن بن ابوالحسن نظام الملک طوسی کی معروف کتاب ہے۔ یہ شخص عہد سلاجقہ میں تیس سال تک وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہا۔ ۴۸۵ میں حسن بن صباح کے ایک فدائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

یہ کتاب سلطان ملک شاہ کی فرمائش پر تالیف ہوئی۔ اور پچاس ابواب پر مشتمل ہے۔ براؤن کے خیال میں یہ کتاب آئین جہانداری کے موضوع پر مشرق کے عظیم ترین وزیر کے نظریات کی آئینہ دار ہے۔ اس میں انبیا کے قصص اور عادل بادشاہوں کی حکایات بھی ہیں۔ اختصار کے باوجود اپنے اندر گرانقدر مواد رکھتی ہے۔ اس کتاب کے سات ابواب نظام الملک نے غیر اسلامی فرقوں کی تردید میں لکھے ہیں۔ اس نے باطنیوں پر کڑی تنقید کی ہے اور انہیں مزدک کا جانشین بتایا ہے۔

سیاست نامہ کے طرز تحریر میں سادگی اور روانی قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب کی عبارت کی تازگی آج بھی اسی طرح برقرار ہے اس کے جملے مختصر لیکن بہت واضح ہیں تاریخی غلطیوں کے باوجود فارسی نثر کی کتابوں میں سیاست نامہ براؤن کی پسندیدہ ترین کتاب ہے۔ بعض لوگ اسے تالیف کی بجائے نظام الملک کی تدوین کہتے ہیں۔

دستور الوزراء نظام الملک کا اپنے بیٹے کے نام ایک طویل خط ہے اس کا ایک وصیت نامہ بھی استنبول کے ایک کتب خانے میں ملا ہے۔

مقامات حمیدی

مقامہ، عربی و فارسی کی ایک معروف صنف نثر ہے۔ اس میں کوئی بیانیہ یا حکایت آراستہ اور مسجع انداز میں بیان کی جاتی ہے۔

مقامات بدیع الزماں ہمدانی اور مقامات حریری اس سلسلے کی مشہور عربی کتب ہیں۔ بلخ کے قاضی القضاۃ حمیدالدین م ۵۵۹ نے انہیں دو مذکورہ بالا کتابوں کی تقلید میں فارسی زبان میں مقامات لکھ کر فارسی نثر کے پرتکلف اسلوب کو کمال تک پہنچایا۔ قاضی حمیدالدین، انوری کا معاصر و مربی تھا۔ بلخ کے لوگ جب انوری کے درپے آزار ہوئے تو قاضی حمیدالدین نے اس کی جان بچائی۔

یہ کتاب ۵۵۱ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ اس میں مختلف موضوعات پر (۲۳) مقامات ہیں۔ بعض مناظرے کی شکل میں ہیں مثلاً شباب و شیب کچھ مقامات بیانیہ ہیں مثلاً بہار و خزاں، بلخ اور سمرقند وغیرہ۔

انوری، نظامی عروضی (صاحب چہار مقالہ) اور سعدالدین وراوینی (صاحب مرزبان نامہ) نے مقامات حمیدی کی ادبی قدر و قیمت کا اعتراف کیا ہے۔ مقامات نثر فنی (پر تکلف و مصنوع) کا

ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

چہار مقالہ

چہار مقالہ یا مجمع النوادر فارسی نثر کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کا مصنف نجم الدین احمد بن عمر بن علی نظامی عروضی سمرقندی کے نام سے مشہور تھا۔ اور وہ خاندانِ غور کے ایک شاہزادے ابوالحسن حسام الدین علی کی بارگاہ سے وابستہ تھا چہار مقالہ اسی کے نام معنون کی ہے۔ مصنف کے خیال میں بادشاہ کے لئے دبیر، شاعر، منجم اور طبیب بے حد ضروری ہیں۔ نظامی نے ہر فن پر منطقی بحث کی ہے اور اپنے افکار کی وضاحت کیلئے ہر فن سے متعلق حکایات تحریر کی ہیں۔ مقدمہ کی چند فصول میں زمین کی بناوٹ، زندگی کے ظہور اور اس کے ارتقاء، خدا، خلیفہ اور بادشاہ کے بارے میں ٹھوس مباحث ملتے ہیں۔ ان مباحث کا علمی پایہ بے حد بلند ہے اور حکایات بھی دلچسپ ہیں۔ یہ کتاب اپنے دامن میں بعض نادر تاریخی معلومات رکھتی ہیں۔ اس کا دوسرا مقالہ تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چہار مقالہ بعد کے مصنفین کے لئے ایک مستند ماخذ بنی رہی۔ حافظ محمود شیرانی اور ایرانی محقق مرزا محمد قزوینی نے چہار مقالہ کی بعض تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

مقدمہ کا انداز تحریر عالمانہ اور فلسفیانہ ہے۔ اس میں عربی اصطلاحات بھی ہیں لیکن باقی کتاب سادگی اور سلاست کا بہترین نمونہ ہے۔ مقامات حمیدی اور چہار مقالہ کم و بیش ایک ہی زمانے میں لکھی گئیں۔ نظامی نے مقامات حمیدی کی تعریف بھی کی لیکن اس نے اس کے اسلوب تحریر کو اختیار نہیں کیا۔ چہار مقالہ چھٹی صدی کے وسط کی تالیف ہے لیکن اس کا انداز پانچویں صدی ہجری کی کتابوں مثلاً تاریخ بیہقی، قابوس نامہ اور سیاست نامہ سے ملتا جلتا ہے۔

کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی

کلیلہ و دمنہ نوشیرواں کے عہد میں کشمیر سے ایران پہنچی اور پہلوی میں ترجمہ ہوئی۔ عبداللہ بن المقفع نے اسے عربی میں منتقل کیا۔ نصر بن احمد سامانی کے دور میں یہ کتاب پہلے فارسی دری میں ترجمہ ہوئی اور پھر رودکی نے اسے فارسی نظم کا جامہ پہنایا۔ چھٹی صدی کے شروع میں ایک بار پھر اسے بلیغ فارسی نثر میں ابوالمعالی نصراللہ بن محمد نے بہرام شاہ غزنوی کے زمانے میں مرتب کیا۔ یہی کتاب کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی کے نام سے مشہور ہوئی۔

ابوالمعالی نصراللہ غزنی یا شیراز کا رہنے والا تھا۔ اور دربار غزنین سے وابستہ تھا۔ یہ کتاب غزنوی بادشاہ بہرام شاہ کے نام سے منسوب ہے۔ بقول ڈاکٹر صفا یہ کتاب ۵۳۹ - ۵۳۸ کے

درمیان تصنیف ہوئی۔

کلیلہ و دمنہ میں جانوروں کی زبان میں اہم سیاسی اور معاشرتی مسائل کو بیان کیا گیا ہے اس کے دس باب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۳ ابواب کا اضافہ ایرانیوں نے کیا ہے۔ سلاست، انشاء اور دلکشی کلام کے لحاظ سے یہ کتاب فارسی نثر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسے فارسی پُر تکلف نثر کے اولین کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کی نثر کو آیات، ضرب الامثال اور عربی و فارسی اشعار سے سجایا گیا ہے۔ متوازن و مترادف کلمات کے استعمال سے عبارت کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔

مرزبان نامہ

مرزبان نامہ حکایتوں اور داستانوں پر مشتمل ایک کتاب ہے جس میں بیشتر حکایتیں کلیلہ و دمنہ کی طرح حیوانوں کی زبان میں بیان ہوئی ہیں یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے آخر میں طبرستان کے حاکم مرزبان بن رستم نے طبری زبان میں لکھی۔ فارسی میں اس کے دو ترجمے ہوئے۔ ایک ۵۹۸ء میں محمد بن غازی ملطیوی کے قلم سے ہوا۔ اور وہ روضۃ العقول کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ترجمہ بھی پُر تکلف فارسی نثر میں ہے اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

خ بقول استاذ شفیق

۵۳۰ء اور ۵۴۰ کے درمیان

ساتویں صدی کے ابتدائی سالوں میں سعید الدین وراوینی نے طبری سے مرزبان نامہ کو پُر تکلف فارسی میں ترجمہ کیا اور نام بھی مرزبان نامہ ہی رکھا۔ یہ ترجمہ نو ابواب پر مشتمل ہے اصل کتاب کے بعض حصے وراوینی نے ترجمے میں حذف کر دیئے۔ یہ ترجمہ بھی فارسی نثر کے شاہکاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی نثر شعریت سے مملو ہے۔ اسکی عبارتوں میں ایسی تشبیہات ملتی ہیں جو اس سے قبل صرف اشعار ہی سے مخصوص تھیں۔ عربی فارسی اشعار و اقوال بھی کافی استعمال ہوئے ہیں۔

سندباد نامہ

یہ کتاب ہندوستان سے ایران پہنچی اور وہاں پہلوی میں ترجمہ ہوئی پہلوی سے عربی اور عربی سے سامانیوں کے عہد میں فارسی دری میں ترجمہ ہوئی۔ ظہیری سمرقندی نے اس ترجمے کو پُر تکلف انداز سے تحریر کیا اور اس میں اقوال و اشعار کا اضافہ کیا۔

سمک عیار

اس کتاب کا شمار فارسی کی بہترین داستانوں میں ہوتا ہے فرامرز بن خداداد نے اسے ایک داستان گو صدقہ ابوالقاسم سے سن کر تحریر کیا ہے

اس داستان کے ہیرو اپنے ناموں کے اعتبار سے ایرانی الاصل ہیں اور اس میں ایران اور قرب وجوار کے شہروں کے نام ملتے ہیں۔ یہ داستان "کہانی در کہانی" کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ اپنے زمانے کی رائج ترین کہانی تھی۔ اس کی شہرت سے متاثر ہو کر اسے قید تحریر میں لایا گیا اور موقع محل کی نسبت سے اس میں اشعار بھی لائے گئے۔ یہ روزمرہ بول چال کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس کی زبان بڑی سادہ ہے۔ اس کی زبان قواعدی غلطیوں سے پاک ہے۔ دانشگاہ تہران سے یہ کتاب ۵ جلدوں میں بڑے اہتمام سے شائع ہوئے۔

اس دور کی ادبی کتابوں میں سلطان سنجر کے منشی منتجب الدین بدیع کی عتبہ الکتبہ اور علاؤالدین تکش خوارزمشاہ کے منشی بہاء الدین کی التوسل الی الترسل بھی قابلِ ذکر ہیں۔ دونوں کتابیں ان منشیوں کی منشآت ہیں اور ان کی نثر پر تکلف ہے۔

(ب) کتب تاریخی

تاریخ برامکہ یہ کتاب شاید عربی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اس کے مترجم کا نام محمد بن حسین بن عمر ہے۔ مترجم نے یہ کتاب ابوالقاسم بن خاقان کی روایت سے بیان کی ہے۔ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ کتاب کس زمانے میں ترجمہ کی گئی لیکن اس کا انداز نگارش پانچویں صدی ہجری کی نثری خصوصیات کا حامل ہے۔ اس لئے اس کا تعلق اسی صدی سے ہو سکتا ہے۔ یہ تاریخ آقائے مرزا عبدالعظیم قریب کے تفصیلی مقدمے کے ساتھ تہران سے شائع ہوئی۔

فارس نامہ اس کتاب کا موضوع قبل از اسلام کے ایرانی بادشاہوں کی تاریخ اور سرزمین فارس کا جغرافیہ ہے۔ اس کتاب کا مصنف ابن بلخی سلطان محمد بن ملک شاہ کے زمانے میں فارس کا مستوفی (دیوان) تھا۔ اس نے عربی و فارسی کی مستند کتب سے پیشدادیوں، کیانیوں، اشکانیوں اور ساسانیوں کی تاریخ مرتب کی۔ استاد صفا کا خیال ہے کہ یہ کتاب ۵۱۱ھ سے پہلے تصنیف ہوئی کیونکہ اس کا مقدمہ سلطان محمد کے نام ہے۔

مجمل التواریخ والقصص ۲۵ ابواب پر مشتمل یہ کتاب ایران و عرب کے خلفاء و سلاطین کی ایک مستند تاریخ ہے۔ ڈاکٹر صفا کے خیال میں ۵۲۰ھ کے لگ بھگ مکمل ہوئی لیکن مؤلف کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم

ہے کردہ ہمدان یا اسد آباد کا رہنے والا تھا اور اس کے دادا کا نام مہلب بن محمد بن شادی تھا۔ خود اس کا نام معلوم نہیں اس کتاب کی ترتیب میں مؤلف نے مستند کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ایران کی قدیم تاریخ اور داستانوں کے بارے میں یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں ایران قدیم کے بعض نام اور اصطلاحات اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں۔

یہ کتاب اگرچہ چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں لکھی گئی۔ لیکن اس کا انداز نگارش چوتھی صدی ہجری کی نثری کتب سے مشابہ ہے۔ عربی الفاظ اور تراکیب کا استعمال بہت کم ہے۔ مؤلف نے جن قدیم فارسی کتب سے استفادہ کیا وہ ان کے اسلوب سے بھی متاثر ہوا۔

تاریخ بخارا یا مزارات بخارا

ابوبکر محمد بن جعفر نرشخی (م ۳۴۸) نے اس موضوع پر ایک کتاب عربی میں لکھی ۵۲۲ میں ابونصر احمد بن محمد نصر القبادی نے اسے فارسی میں منتقل کیا۔ اسے عربی کتاب کا صرف ترجمہ نہیں کہا جا سکتا القبادی نے اصل کتاب کے بہت سے مطالب حذف کر دیئے۔ بعض کی تلخیص کی اور بعض نئی باتوں کا اضافہ بھی کیا۔ ۵۷۴ میں ایک اور شخص محمد بن زفر بن عمر نے قبادی کے ترجمے کی تلخیص کی اور یہی تلخیص اب تاریخ بخارا کے نام سے مشہور ہے۔ پہلی بار اسے شیفر نے پیرس سے شائع کروایا۔ دوسری بار آقای مدرس رضوی کے اہتمام میں تہران سے شائع ہوئی۔

تاریخ بیہق

یہ کتاب ابوالحسن علی بن ابوالقاسم بیہقی م ۵۶۵ھ کی تصنیف ہے۔ ابوالحسن فنون ادب، حدیث، فقہ، علم الکلام، نجوم، ریاضی اور فلسفے میں امتیاز اور شہرت رکھتا تھا۔ اس کی بیشتر تصانیف عربی زبان میں ہیں۔ مذکورہ بالا تاریخ علاقہ بیہق کی تاریخ، جغرافیہ اور وہاں کی ممتاز شخصیتوں کے احوال پر مشتمل ہے۔ یہ تاریخ مرحوم استاد بہمنیار کی تصحیح اور مرزا احمد قزوینی مرحوم کے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ تہران سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کی نثر سادہ ہے اور عبارت میں پختگی پائی جاتی ہے۔ عربی کلمات کا استعمال اس میں نسبتاً زیادہ ہوا ہے۔

تتمہ صوان الحکمۃ ابوالحسن کی عربی تصنیف ہے جسے ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے اپنے تحقیقی حواشی کے ساتھ لاہور سے شائع کرایا۔

راحۃ الصدور

اعلام الملوک یا راحۃ الصدور و آیۃ السرور نجم الدین ابوبکر محمد بن علی راوندی کی تصنیف ہے۔ راوند کاشان کے قریب ایک قصبہ ہے

مصنف بچپن ہی میں یتیم ہو گیا۔ اس کی تعلیم و تربیت اس کی ننھیال میں ہوئی۔ اس کے ماموں بڑے زبردست خوشنویس تھے۔ خوشنویسی، جلد سازی اور تذہیب کاری کا فن اس نے اپنے ایک ماموں سے سیکھا۔ ۵۹۰ھ میں طغرل بن ارسلان کے قتل، سلجوقی سلطنت کے انقراض کے بعد راوندی ایران سے ایشیائے کوچک کے سلاجقہ کے ہاں چلا گیا۔ اور وہاں پر اس نے ۵۹۹ھ میں راحۃ الصدور مکمل کی اور اسے کیخسرو بن قلج ارسلان کے نام معنون کیا۔ اس کتاب میں سلاجقہ کے آغاز سے لے کر طغرل بن ارسلان تک کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ سلاجقۂ عراق و آذربائیجان کا ذکر بھی تفصیلاً ملتا ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں چند متفرق موضوعات پر کچھ فصلیں بھی ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال کی تحقیق کے مطابق اس کتاب کا ابتدائی حصہ نیشاپوری کے سلجوق نامے سے ماخوذ ہے۔ بعد میں لکھی جانے والی تاریخوں جہانگشای جوینی، جامع التواریخ رشیدی اور تاریخ جہاں آرا میں سلاجقہ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس کتاب سے لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صفا کے خیال میں اس کتاب کے بعض حصے پر تکلف نثر میں ہیں اور بعض سادہ ہیں۔ پر تکلف نثر کے حصوں میں نثر کو اشعار، اقوال، امثال اور صنائع سے آراستہ کیا گیا ہے۔ شاہنامہ کے اشعار زیادہ لائے گئے ہیں۔

ترجمہ تاریخ یمینی

ابو النصر محمد بن عبد الجبار عتبی نے تاریخ یمینی کے نام سے غزنویوں کی ایک تاریخ عربی میں لکھی۔ ابو الشرف ناصح بن ظفر بن سعد منشی جرفادقانی نے اسے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کا اسلوب بھی پر تکلف ہے۔ یہ چھپ چکی ہے۔

تاریخ طبرستان

تاریخ طبرستان بہاء الدین محمد بن حسن بن اسفندیار کاتب کی تصنیف ہے۔ بہاء الدین ملوک آل باوند کے دربار سے وابستہ تھا۔ یہ کتاب اسی موضوع پر ابو الحسن بن محمد کی عربی تصنیف پر مبنی ہے۔ یہ کتاب ۶۱۳ھ میں مکمل ہوئی۔

مذہب، تصوف و فلسفہ

تفسیر سور آبادی

ابوبکر عتیق بن محمد سور آبادی نے فارسی زبان میں قرآن کی تفسیر لکھی۔ یہ شخص الپ ارسلان (۴۵۵ - ۴۶۳ھ) کا معاصر تھا۔ اس تفسیر کے بہت سے قلمی نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں اور یہ تہران سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ اساتذہ نے اسے فارسی نثر کا ایک اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے۔

تاج التراجم

پانچویں صدی ہجری میں تصنیف ہونے والی فارسی زبان میں قرآن مجید کی ایک اہم تفسیر ہے۔ مفسر کا نام عماد الدین ابو المظفر شاہپور شافعی ہے۔ ان کی وفات ۴۷۱ھ میں ہوئی۔ یہ کتاب چند مجالس میں منقسم ہے اور ہر مجلس میں ایک سورت کا ترجمہ اور تفسیر دیا ہوا ہے۔

بیان الادیان

حکیم ناصر خسرو کے ایک معاصر ابو المعالی محمد بن عبید اللہ کی قدیم مذاہب اور فرقوں کے موضوع پر یہ تصنیف بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ سب سے پہلے اسے شیفر نے پیرس میں شائع کرایا تھا۔ کتاب کے پانچ باب ہیں لیکن شیفر اور عباس اقبال کے ایڈیشنوں میں صرف چار ابواب ہیں۔ اس کا پانچواں باب ایران زمین کے ایک شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اور پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے پاس اس کتاب کا ایک نادر نسخہ موجود ہے جس میں پانچوں باب مکمل ہیں۔

روضات الجنان

یہ قرآن حکیم کی ایک تفسیر ہے جسے ابو الفتوح رازی نے لکھا یہ تفسیر پانچ جلدوں میں تہران سے شائع ہو چکی ہے۔ اسلوب نثر قدیم کا ہے۔

کیمیائے سعادت

حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی کی تصنیف ہے۔ امام غزالی ۴۵۰ھ میں طوس کے ایک گاؤں طاہران میں پیدا ہوئے انہوں نے ابو حامد احمد بن محمد رادکانی اور امام الحرمین ابو المعالی جوینی سے علوم متداولہ میں کسب فیض کیا۔ ادب، فقہ، اصول حدیث، درایت اور علم کلام پر انہیں پوری طرح عبور حاصل ہو گیا۔ خواجہ نظام الملک طوسی نے ان کی شہرت سے متاثر ہو کر انہیں نظامیہ بغداد کی مدرسی کا اعزاز بخشا۔ اس منصب پر وہ چار سال تک فائز رہے۔ اس کے بعد ایک ذہنی انقلاب

نے ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ نظامیہ میں درس و تدریس ترک کرکے وہ دس سال تک مختلف اسلامی ممالک میں پھرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے حج بھی کیا۔ ان کی طبیعت زہد و طمینت کی جانب مائل ہوگئی۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف احیاء العلوم الدین مکمل کی۔ انہوں نے مناظرہ کرنے اور دربار شاہی میں حاضر ہونے سے توبہ کرلی تھی۔ انہوں نے ایک مدرسہ اور خانقاہ بنائی تھی۔ لوگوں کی ہدایت اور شاگردوں کی تعلیم کا سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ ان کی وفات ۵۰۵ھ میں طاہران میں ہوئی۔ اور بقول ڈاکٹر صفا وہیں سپرد خاک ہوئے۔ غزالی نے اسلام میں یونانی فلسفے کے بڑھتے ہوئے زور کو توڑا۔ اور اس فلسفے کا رد لکھا۔ عالم ہوتے ہوئے تسکین قلب کے لیے خانقاہی مسلک اختیار کیا۔

کیمیائے سعادت غزالی کی عربی تصنیف احیاء العلوم کی فارسی تلخیص ہے۔ یہ کتاب حسب ذیل چار عنوانات اور چار ارکان پر مشتمل ہے۔

عنوانات : (۱) شناختن نفس خویش (۲) شناختن حق تعالیٰ (۳) شناختن دنیا (۴) شناختن آخرت۔

ارکان : (۱) عبادت (۲) معاملات (۳) مہلکات (۴) منجیات۔

بظاہر اس کتاب کا موضوع اخلاقیات ہے۔ اس کی بنیاد دین پر ہے لیکن اس میں صوفیانہ نقطہ نظر ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو امام غزالی میں انقلاب آنے کے بعد ان کے ذہن میں آئے۔

یہ کتاب فلسفہ و مذہب کا لطیف امتزاج پیش کرتی ہے لیکن اس کا انداز بیان بے حد سادہ ہے۔ اس کی نثر پختگی اور تاثیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ غزالی مشکل سے مشکل بات کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی سہولت سے سمجھا دیتے ہیں۔ ایک اور کتاب نصیحۃ الملوک بھی غزالی نے ۵۰۳ھ میں سلطان سنجر کے لئے فارسی میں لکھی۔ اس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب عربی اور ترکی میں ترجمہ ہوئی ہے۔ فضائل الانام غزالی کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے جو ان کے ایک عزیز نے ان کی وفات کے بعد جمع کئے۔

ترجمہ رسالہ قشیریہ امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری ۴۶۵ھ کا رسالہ قشیری اصول تصوف پر عربی زبان میں ایک اہم تصنیف ہے۔ فارسی میں اس کے دو ترجمے ملتے ہیں۔ پہلا ترجمہ امام کے ایک شاگرد ابوعلی عثمانی نے کیا اور دوسرا عبدالرحمن

بن محمد نیشاپوری نے ۵۰۵ میں مکمل کیا۔ دوسرا ترجمہ پہلے سے بہتر ہے۔ ایک تیسرا ترجمہ استاد بدیع الزمان فیروز انفر کے مقدمے کے ساتھ شائع ہو گیا۔ مگر اس کا مصنف یا زمانہ نامعلوم ہے۔

طبقات صوفیہ یہ کتاب ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین السلمیؒ ۴۱۲ھ نے عربی زبان میں تصنیف کی ہے۔ خواجہ عبداللہ انصاری اپنی مجالس میں اس کتاب کے مطالب فارسی میں اضافے کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ اور ان کا ایک مرید ساتھ ساتھ لکھتا جاتا تھا۔ یہ احوال صوفیہ کی ایک مستند ترین کتاب ہے۔ خواجہ عبداللہ انصاری میزبان رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد میں سے تھے۔ یہ ہرات میں ۳۹۶ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ادبی و دینی علوم میں انہیں شہرت حاصل تھی۔ عربی اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے ۴۸۱ھ میں ہرات ہی میں انتقال فرمایا۔ طبقات صوفیہ ہراتی فارسی میں ہے جو فارسی دری سے بہت قریب ہے۔

طبقات صوفیہ کے علاوہ خواجہ عبداللہ انصاری نے بہت سے رسائل تصنیف کئے ان میں مناجات نامہ، الٰہی نامہ، محبت نامہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی نثر مسجع ہے اور عبارات اعلیٰ ادبی اوصاف کی حامل ہیں۔ خواجہ عبداللہ انصاری فارسی کے صاحب طرز اہل قلم تھے فارسی کے نثر اسلوب کے ارتقا میں وہ ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید تصوف کی اہم اور فارسی نثر کی فصیح کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ شیخ ابو سعید کے ایک نواسے محمد بن منور کی تالیف ہے۔ اس میں شیخ کے سوانح و کرامات کا ذکر ہے۔ ژوکوفسکی کے خیال میں اسرار التوحید ۵۵۲ اور ۵۹۹ کے درمیان لکھی گئی اور یہ غیاث الدین غوری کے نام معنون ہے۔ روسی محقق ژوکوفسکی نے ۱۸۹۹ء میں پیٹرز برگ سے اسے شائع کرایا اور دو دفعہ تہران سے شائع ہو چکی ہے۔ اسرار التوحید کا شمار فارسی نثر کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب نثر کے پر تکلف دور میں لکھی گئی۔ لیکن مقدمے کے سوا اس میں تصنع کے آثار نہیں ملتے۔ واقعات و حکایات کا بیان انتہائی موثر انداز میں ہوا ہے۔ یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا باب خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں شیخ کے بہت سے اشعار و اقوال درج ہیں۔

تذکرۃ الاولیاء فارسی زبان میں تصوف کے موضوع پر داتا گنج بخشؒ کی کشف المحجوب اور خواجہ عبداللہ انصاری کے ترجمۂ طبقات صوفیہ کے بعد تذکرۃ الاولیاء

کا نمبر آتا ہے۔ یہ فرید الدین عطار نیشاپوری کی تصنیف ہے۔ اس میں ۹۶ اولیاء اور مشائخ کا ذکر موجود ہے۔ ان اولیاء کے احوال و اقوال اور کرامات و مقامات کا ایک مفصل بیان اس کتاب میں ملتا ہے۔ اس کا انداز بیان سادگی اور شیرینی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ہر بزرگ کے حالات لکھتے وقت شروع کے چند جملے عطار نے مسجع اور مقفیٰ لکھے ہیں۔ باقی عبارت سادہ اور دلنشین ہے۔ یہ چھٹی صدی ہجری کے اخیر یا ساتویں صدی ہجری کے اوائل کی تصنیف ہے۔ مرزا محمد خان قزوینی کے نزدیک یہ کتاب تاریخی اغلاط سے خالی نہیں ہے۔

علوم و فنون و متفرقات

روضۃ المنجمین اور نزہت نامہ علائی

شہمردان بن ابی الخیر کی تصانیف ہیں۔ نزہت نامہ علاؤ الدولہ کے نام معنون کی گئی ہے۔ ان دونوں کتابوں کی نثر کا انداز قدیم ہے۔ ایسی خالص فارسی لکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو عربی سے بھی دشوار معلوم ہوتی ہے۔

نوروز نامہ

حکیم عمر خیام نیشاپوری کی تصنیف ہے۔ اس کا موضوع جشن نوروز، اسکی حقیقت اور تاریخ ہے۔ اس موضوع کے تعلق سے قدیم ایرانی تمدن کی بہت سی باتیں اس میں آگئی ہیں۔ اس کا انداز بیان سادہ اور رواں ہے۔ یہ کتاب آقای مجتبیٰ مینوی کے فاضلانہ مقدمے اور حواشی کے ساتھ تہران سے شائع ہو چکی ہے۔ رسالۂ علم کلیات بھی فارسی میں خیام کی ایک اور تالیف ہے۔

ذخیرہ خوارزم شاہی

طب کے موضوع پر ایرانی طبیب سید اسمٰعیل جرجانی (م ۵۳۱ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب جرجانی نے ۵۰۴ ہجری میں قطب الدین خوارزم شاہ کے لئے لکھی۔ ذخیرہ کا شمار طب مشرق کی اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ جرجانی نے طب کے موضوع پر یہ کتاب لکھ کر اس دور میں فارسی کے علمی زبان ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ ذخیرہ اس عہد کی رائج زبان میں لکھی ہے۔ عربی اصطلاحات کے استعمال سے جرجانی کو گریز نہیں ہے۔ خفی علائی ذخیرہ کی تلخیص ہے جو جرجانی نے ہی کی۔

اس دور کی مندرجہ ذیل نثری کتب بھی قابل ذکر ہیں۔

لغت فرس

ابو منصور علی ابن احمد اسدی طوسی کی یہ تصنیف فارسی زبان کی قدیم ترین لغت ہے جو دستیاب ہوئی ہے۔ اسدی نے یہ لغت آذربائیجان کے ان شعرا و ادبا

کی راہنمائی کے لئے لکھی جو خراسان کی فارسی سے آشنا نہیں تھے۔ ہر لفظ کے لئے شعر کی مثال دی ہے۔ یہ لغت عباس اقبال کے اہتمام سے تہران میں شائع ہو چکی ہے۔

ترجمان البلاغۃ اس کتاب کا موضوع معانی، بدیع اور بیان ہے۔ صدیوں تک اسے فرخی سیستانی کی تصنیف سمجھا رہا ہے۔ ترکی محقق احمد آتش مرحوم کو استانبول کے کتاب خانے سے ایک قلمی نسخہ ملا جس میں مصنف کا نام محمد بن عمر الرادویانی لکھا ہوا تھا۔ یہ کتاب استانبول سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بے شمار شعراء کے اشعار بطورِ مثال پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں بہت سے شعراء گمنام بھی ہیں۔ رشید وطواط کو یہ کتاب پسند نہیں تھی۔ اس لئے اس نے اس موضوع پر ایک کتاب حدائق السحر فی دقائق الشعر کے نام سے مرتب کی۔ یہ بھی تہران سے شائع ہو چکی ہے۔

تصانیف احمد غزالی (م ۵۲۰ ھ) برادر امام محمد غزالی

(۱) لباب الاحیاء:۔ امام غزالی کی کتاب احیائے العلوم کا خلاصہ۔

(۲) بحر الحقیقۃ:۔ فنا کے لئے جن مراحل سے گزرنا ضروری ہے اس کی تفصیل۔

(۳) سوانح العشاق:۔ عشق کی صوفیانہ تفسیر خوبصورت حکایات و تمثیلات ہیں۔ ایک رسالہ ہے جو مجلہ دانشکدہ ادبیات مشہد میں شائع ہو چکا ہے۔

تصانیف عین القضاۃ مقتول م ۵۲۵ ھ۔

(۱) یزداں شناخت:۔ الٰہیات، طبیعیات اور فلسفہ پر اہم کتاب۔

(۲) رسالہ جمالی:۔ سلف صالح کے مذہب پر رسالہ۔

(۳) تمہیدات:۔ اس کا موضوع تصوف ہے۔

ان رسائل کا انگریزی ترجمہ اقبال اکادمی کراچی نے چھپوایا ہے۔

شیخ شہاب الدین مقتول کی فارسی تصانیف:۔

(۱) رسالہ آواز پر جبرئیل۔

(۲) رسالۃ العشق۔

(۳) صفیر مرغ۔

(۴) رسالہ فی حالۃ الطفولیہ۔

(۵) روزی با جماعت صوفیاں۔

(۶) رسالۂ عقل سرخ۔

المعارف:۔ مولانا روم کے والد سلطان العلماء بہاء الدین ولد کے خطبات و مواعظ کا مجموعہ ہے جسے استاد فروزانفر نے شائع کروایا ہے۔

ایلخانی و تیموریوں کے ادوار

ایلخانی و تیموری حکام، چنگیز خاں منگولی کے خانماں سوز حملے کے باقیات تھے۔ ان کی سفاکیاں مسلّم، مگر بعد میں بقول علامہ اقبال ؎

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اس عہد کے بہت سے ذیلی ادوار بنتے ہیں۔ طوائف الملوکی کے دور میں چوپانیوں (۷۲۱ – ۷۵۸ھ)، آلِ اینجو (۷۰۳ – ۷۵۸ھ)، آلِ مظفر (۷۱۳ – ۷۹۵ھ)، ملوکِ کرت (۶۴۳ – ۷۹۱ھ)، سربداروں (۷۳۷ – ۷۸۳ھ)، قراختائیوں (۶۱۹ – ۷۰۳ھ)، اتابکانِ یزد (۵۹۰ – ۷۱۸ھ)، اتابکانِ لرستان (۵۴۳ – ۷۴۰ھ) اور اتابکانِ فارس (۵۴۳ – ۷۴۰ھ) وغیرہم کی علیحدہ خود مختار حکومتیں قائم رہی ہیں۔

مجموعی لحاظ سے یہ دور فارسی ادب کا ممتاز دور ہے۔ طرزِ نگارش کی کئی خامیوں کے باوجود اس عہد میں باکمال استادوں کی تابناکی محورِ روشنی نظر آتی ہے۔ تاریخ نویسی اس دور کا طرۂ امتیاز ہے۔ سیاسی حوادث اور جنگ و جدال کا ذکر کئے بغیر، اس عہد کے شعراء اور دیگر مصنفین کا مختصر حال درج ذیل ہے۔

امامی ہروی کرمانی (م ۶۶۷ھ/۱۲۶۸ء)

نام رضی الدین ابو عبداللہ محمد ہے۔ معاصر امراء و وزراء کی مدح کرتا رہا۔ غزل اور قصیدہ کا استاد تھے اور اس کا کلام تصوف کی چاشنی سے بھی خالی نہیں۔ رہا کرمان میں، لیکن آبائی نسبت کی بناء پر ہروی بھی کہلاتا ہے۔ مجد الدین ہمگر، سعدی اور امامی کا ذکر یوں کرتا ہے۔

ما گرچہ بہ نطق طوطی خوش نفسیم | بر شکر گفتہ ہای سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری بہ اجماع امم | ہرگز من و سعدی بہ امامی نرسیم

ہمگر نے از راہِ حسد اپنے ساتھ سعدی کو بھی ملا لیا حالانکہ کجا سعدی و کجا امامی۔ امامی کی

ایک غزل کا انتخاب درج ذیل ہے۔

با عشق دلی کہ آشنا نیست ‌‌‌ — جا است دل جہان نما نیست
دل آئنہ خدا نما نیست — گر زان کہ بہ غیر مبتلا نیست
رو ز آئنہ زنگ غیر بزدائی — پس نیک ببین کہ جز خدا نیست
ای دل کہ نظرہ گر خدائی — بر غیر وی است نظرہ روا نیست
ہر دل کہ نہ چون دل امامی است — با دوست ز غیر او جدا نیست

حضرت رومی (م ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء)

مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی، مولانائے معنوی، مولوی، ملائی رومی، پیر رومی پیر روم یا رومی کے القاب سے یاد کئے جاتے رہے، بہت بڑے صوفی متکلم اور مفکر تھے۔ ان کی ۲۶ ہزار ابیات کی حامل مثنوی شریف، استاد بدیع الزمان فیروز انفر مرحوم کے الفاظ میں "خداداد فکر انسانی کے بلند ترین چند نمونوں میں سے ایک ہے"۔ دیوان کبیر یا دیوان شمس تبریزی کے مجموعی اشعار ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہیں۔ اور فارسی ادب ان پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔ رومی نے اپنے لئے کوئی تخلص نہ رکھا۔

حضرت رومی ۶۰۴ھ میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں اپنے والد بہاء الدین محمد بہاولد کے ساتھ وہاں سے ہجرت کی۔ نیشاپور آئے، وہاں سے بغداد اور دمشق گئے اور واپسی پر قونیہ میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ تصوف میں طریقہ "مولویہ" آپ سے منسوب ہے۔

رومی متداول نقلی اور عقلی علوم میں ماہر تھے۔ بڑے طمطراق سے تدریس فرماتے رہے مگر ۶۴۲ھ میں ایک درویش حقانی، حضرت شمس الدین تبریزی کی ملاقات سے آپ کی کایا پلٹ گئی اور آپ "عقلا" کا گروہ ترک کر کے "عشاق" کے زمرہ میں آ شامل ہوئے۔ آتشیں جذبات کے اسی طویل دور میں آپ نے اشعار کہے، وعظ فرمایا اور غیر رسمی درس دیئے اور اس طرح آپ نے حقائق و معارف کے ایسے دریا بہائے جن میں مد تو ہوتا رہے گا مگر جزر نہیں۔ علامہ اقبال کے کئی افکار ان ہی دریا ہائے معارف کا مد ہیں۔ آپ نے بیسیوں اشعار میں رومی کو خراج تحسین پیش کیا اور اپنے آپ کو ان کا معنوی مرید اور شاگرد قرار دیا ہے۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" کا آغاز ہے ؎

پیر رومی، مرشد روشن ضمیر — کاروان عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب — خیمہ را از کہکشاں سازد طناب

سوز قرآن درمیان سینۂ اش   جام جم شرمندہ از آئینۂ اش
از نی آن نی نواز پاک زاد   باز شوری در نہاد من فتاد

مولانا رومی کے اردات مندوں میں سے فریدون بن احمد سپہ سالار اور شمس الدین احمد افلاکی نے بالترتیب 'رسالہ' اور 'مناقب العارفین' میں ان کے احوال و مناقب جمع کئے ہیں۔ پروفیسر نکلسن آن جبانی، مولانا بحر العلوی، احمد آتش، علامہ شبلی نعمانی، قاضی تلمذ حسین اور پروفیسر بدیع الزماں اور فیروز انفر مرحومین نے مولانائے محترم کے حالات زندگی اور ارشادات و افکارات کے بارے میں گرانقدر تحقیقات کی ہیں۔ یہاں آپ کی مثنوی معنوی اور دیوان شمس تبریزی کے چند اشعار بطور تبرک پیش کئے جاتے ہیں ؎

ہر کرا جامہ ز عشقی چاک شد   او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش ای عشق پر سودای ما   ای طبیب جملہ علتہای ما
جسم خاک از عشق بر افلاک شد   کوہ در رقص آمد و چالاک شد

من مست و تو دیوانہ، ما را کہ برد خانہ   صد بار ترا گفتم کم خور دو سہ پیمانہ
در شہر یکی کس را ہشیار نمی بینم   ہر یک بتر از دیگر، شوریدہ و دیوانہ
جانا بخرابات آ، تا لذت جان بینی   جان را چہ خوشی باشد بی صحبت جانانہ
تو وقف خراباتی خرجت می و دخلت می   زین دخل بہشیاران مسپار یکی دانہ
از خانہ برون رفتم، مستیم بہ پیش آمد   در ہر نظرش مضمر صد گلشن و کاشانہ
گفتم ز کجائی تو، تسخر زد و گفت ای جان   نیمیم ز ترکستان، نیمیم ز فرغانہ
نیمیم ز آب و گل نیمیم ز جان و دل   نیمیم لب دریا، باقی ہمہ دُردانہ
من بی سر و دستارم، در خانۂ خمارم   یک سینہ سخن دارم، آن شرح دہم یا نہ

مجد ہمگر (م ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء)

مجد الدین ہمگر کا سلسلہ نسب ساسانی بادشاہوں سے ملتا تھا۔ شاعر بیشتر شیراز میں رہا اور سلغری اتابک حکمرانوں کی مدح سرائی کی۔ اس خاندان کے زوال کے بعد وہ کرمان، اصفہان، خراسان اور بغداد گیا اور آخر کار شیراز لوٹ آیا۔ اس کے دیوان میں زوردار قصائد، رباعیات اور غزلیات ملتی ہیں۔ شاعر، شیخ سعدی سے ہمسری کا دعویٰ رکھتا ہے۔ اور قوامی کے ذکر میں اس دعوی کا ثبوت

دیکھا جا سکتا ہے مگر ظاہر ہے کہ سعدی کا مرتبہ کم شعراء کو ملا ہے۔ مجد ہمگر کے اشعار سہل، دلآویز اور رواں ہیں۔ ایک نمونہ یہ ہے ؎

آخر شبی زلف بپایان بما فرست — روزی بدست باد سلامی بما فرست
در تشنگی وصل تو جانم بلب رسید — از وصل آبدار تو جامی بما فرست
در روزۂ فراق تو شد شام صبح من — از خوان وصل لقمۂ شامی بما فرست
آن مرغ نادرم کہ غلطت دانہ خست — چون دانہ ام بخوری، دامی بما فرست

عراقی ہمدانی (م ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء)

شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی، نامور عارف اور شاعر تھے۔ مولد ہمدان تھا۔ ۱۲ سال کی عمر میں ملتان آئے اور حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے دامن سے متوسل ہوئے۔ ملتان میں چند سال قیام کے بعد آپ نے ایشیائے کوچک اور ممالک کا سفر اختیار کیا۔ قونیہ میں آپ نے شیخ صدر الدین قونوی کی صحبت سے استفادہ کیا۔ شیخ ابن عربی کی تالیف فصوص الحکم کے زیر اثر "لمعات" لکھی۔ مولانا جامی نے "اشعۃ اللمعات" کے نام سے اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔

کلیاتِ عراقی میں جملہ اصنافِ سخن موجود ہیں۔ مثنوی میں آپ نے غزل درج کر کے ایک بے نظیر جدت دکھائی ہے۔ آپ سوختہ دل عاشق اور صوفی صافی تھے۔ مشہور ہے کہ آپ عشقِ مجازی سے گزر کر عشقِ حقیقی کے کوچے میں پہنچے ہیں۔ اسی خاطر آپ کے اکثر اشعار مجاز و حقیقت کا آمیزہ معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر سعید نفیسی مرحوم، جنہوں نے عراقی کا کلیات مرتب کیا، لکھتے ہیں کہ سوز و سازِ عشق کے لحاظ سے فارسی کا کوئی شاعر عراقی کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ ہمارے خیال میں اس کیفیت کے ضمن میں پہلا نام رومی کا آنا چاہیے اور دوسرا عراقی کا۔ عراقی کے اشعار کی دلآویزی اور استادانہ پختگی مسلّم ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ہیں۔

در کوی خرابات کسی را کہ نیاز است — ہشیاری و مستیش ہمہ عین نماز است
آنجا نپذیرند صلاح و ورع امروز — آنچہ از تو پذیرند در آن کوی نیاز است
اسرار خرابات بجز مست نداند — ہشیار چہ داند کہ درین کوی چہ راز است
خواہی کہ درون حرم عشق خرامی — در میکدہ بنشین کہ رہ کعبہ دراز است
از میکدہ ہا نالۂ دلسوز برآمد — در زمزمۂ عشق ندانم کہ چہ ساز است
چون بر در میخانہ مرا بار ندادند — رفتم بدر صومعہ دیدم کہ فراز است
آواز ز میخانہ برآمد کہ عراقی — دروازہ تو خود را کہ در میکدہ باز است

شیخ سعدی شیرازی (م تقریباً ۶۹۱ھ / ۱۲۹۱ء)

شیخ سعدی کے نام کے بارے میں اختلاف ہے: مشرف بن مصلح، مشرف الدین مصلح اور مشرف الدین بن مصلح الدین لکھا جاتا رہا ہے۔ سعدی کی ولادت و وفات کی تاریخیں مختلف فیہ ہیں۔ ولادت بہر حال ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں ہوئی اور وفات ۶۹۰ تا ۶۹۵ھ / ۱۲۹۱ تا ۱۲۹۶ء کے کسی سال میں۔ پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے ۲۷ رمضان المبارک ۶۹۵ھ کے بارے میں قوی تر دلائل دیئے ہیں۔

سعدی، عالمان دین کے ایک خاندان کے فرد تھے۔ پروفیسر سید محمد محیط طباطبائی نے ماہنامہ "وحید" تہران میں مطبوعہ ایک مقالے کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ آپ حضرت سعدؓ بن عبادہ کی اولاد میں سے تھے، اس لئے شیراز اور دمشق کے کئی دیگر افراد کی مانند 'سعدی' کہلاتے تھے اور اسی نسبت کو اپنا تخلص بنالیا مگر عام طور پر سعدی کا تخلص، حاکم شیراز اتابک سلغری ابوبکر بن سعد بن زنگی (۶۲۳ - ۶۵۸ھ) سے منسوب بتایا جاتا رہا ہے۔ شاہزادہ سعد کے نام سعدی کی بوستان اور گلستان معنون ہیں۔

سعدی نے بچپن شیراز میں گزارا۔ جوانی میں بغداد گئے اور مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی۔ ان کے ایک استاد عبدالرحمٰن ابن جوزی دوم (م ۶۳۶ھ) تھے۔ تعلیم و تربیت کے بعد، سعدی نے عراق، عرب، شام، حجاز اور کئی دوسرے مقامات کے سفر کئے۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط کے لگ بھگ آپ شیراز لوٹ آئے اور باقی عمر بظاہر وہیں گزاری ہے۔ شیراز میں آپ کے مزار کے وسیع مقام کو اب "سعدیہ" کہا جاتا ہے۔

سعدی نثر و نظم دونوں کے بے نظیر و بے بدل استاد مانے جاتے ہیں۔ ان کی تالیفات ہر طبقۂ خیال کے لوگوں میں مقبول رہی ہیں اور دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ گلستان نثر و نظم کا حسین امتزاج ہے۔ مجالس پنجگانہ، نصیحۃ الملوک، تقریرات ثلاثہ اور رسالہ عقل و عشق آپکی نثری تالیفات ہیں۔ نظم میں مثنوی، قصیدے، مرثیے (عربی و فارسی)، قطعات، رباعیات، ترجیع و ترکیب بند اور غزلیات کے چند مجموعے (غزلیات قدیم، صاحبیہ اور طیبات) نیز بعض دیگر اصناف سخن موجود ہیں۔

سعدی شاعر عشق ہے۔ ان کا کلام انتہائی پُر تکلف اور فصیح و بلیغ ہے خطاب بہ محبوب فرماتے ہیں۔ ؎

بر حسن تو و سخن من نغز ایدکس ع ہمیں است سخندانی و زیبائی را

آپ نے تصوف کے مضامین بھی نظم کیے۔ اخلاق و پندیات کا دلپذیر مجموعہ جمع کیا۔ مگر نہ لفظ گراں ہیں نہ معانی ادق۔ مثنوی 'بوستان' اگرچہ شاہنامۂ فردوسی کی رزمیہ بحر میں لکھی گئی مگر درس اخلاق اس قدر حکیمانہ دیا ہے کہ شاید و باید۔ غزل میں آپ کے سامنے امیر معزی، خاقانی، انوری وغیرہم کے نمونے تھے، مگر آپ نے اپنی راہ خود متعین کی اور ایک ایسے پیرائے میں غزل سرائی کی جو آج تک سب کا مسرور و مقصود ہے۔ ؎

زمین بہ تیغ بلاغت گرفتہ ای سعدی — سپاس دار کہ جز فیض آسمانی نیست
چنانکہ صیت شہرت رفتہ است چار سو — نرفتہ است دجلہ کہ آبش بدین روانی نیست

اپنی نثری تالیفات، خصوصاً 'گلستان' میں سعدی نے جو اشعار درج فرمائے وہ بھی ادب فارسی کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ یہاں اس استاد اجل کی ایک غزل کے انتخاب درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ؎

یک روز بشیدائی در زلف تو آویزم — زان دو لب شیرین صد شور برانگیزم
گر قصد جفا داری اینک من و اینک سر — ور راہ وفا داری جان در قدمت ریزم
بس توبہ و پرہیزم کز عشق تو باطل شد — من بعد بدان شرطم کز توبہ بپرہیزم
سیم دل مسکینم در خاک درت گم شد — خاک سر ہر کوئی بی فائدہ می بیزم
مجنون رخ لیلی، چون قیس بنی عامر — فرہاد لب شیرین، چون خسرو پرویزم
گفتی بغم بنشین یا از سر جان برخیز — فرمان برمت جانا بنشینم و برخیزم
با یاد تو گر سعدی در شعر نمی گنجد — چون دوست یگانہ شد با غیر نیامیزم

ہمام تبریزی (م ۷۱۴ھ / ۱۳۱۴ء)

خواجہ ہمام الدین تبریزی، تبریز اور آذربائیجان کے تھے۔ وہ امیر شرف الدین ہارون بن صاحب دیوان جوینی شمس الدین محمد کے دربار سے منسلک تھے۔ قصیدہ اور غزل کے استاد تھے اور رشید یاسمی کے مقدمے کے ساتھ ان کا دیوان ۱۳۳۲ھ / ۱۹۵۳ء میں تہران سے طبع ہو چکا ہے۔ ہمام، غزل میں سعدی کے غیر معمولی معتقد تھے۔ ان کی بہت کم غزلیں ایسی ہوں گی جو سعدی کی زمین میں نہ ہوں۔ تقلید سعدی پر انہیں ناز تھا۔ زمین سعدی میں ان کی ایک غزل کا انتخاب دیکھیے۔

ایشان کہ آرزوی دل و نور دیدہ اند | نقشان مگر زجان لطیف آفریدہ اند
در کرجیستان کہ جان بجلت ازل نقش | جانی دگرز نور الہٰی رسیدہ اند
از چشم مست دروی ولب بادہ رنگشان | جانہا بذوق ساغری درکشیدہ اند
آب حیات بود و نبات و شکر بہم | آن شیرہا دران کہ بطفلی مکیدہ اند
در حیرتم ازاین ہمہ گلہای دلفریب | تادر کدام آب و زمین پرورید اند

شیخ محمود شبستری (م ۷۲۰ھ/۱۳۲۱ء)

شیخ سعد الدین محمود تبریز کے ایک قصبہ شبستر کے رہنے والے تھے۔ آپ اپنے وقت کے نامور علماء فضلا اور متکلمین میں شمار ہوتے تھے۔ شاعری میں ان کی شہرت مثنوی "گلشن راز" پر ہے جسے پہلے "گلشن" بھی کہتے رہے ہیں۔ یہ مثنوی ان ۱۵ یا ۱۷ سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے جو سید امیر الحسینی خراسانی نامی ایک عالم و صوفی نے (آپ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے خلیفہ مجاز تھے) آپ سے پوچھے تھے۔ اقبال نے مثنوی "گلشن راز جدید" کے ذریعے جو زبور عجم کا ایک حصہ ہے۔ اس مثنوی کے ۱۱ سوالات کا جدید علم کلام کی رو سے جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بطرز دیگر از مقصود گفتم | جواب نامہ محمود گفتم

شیخ محمود کی ایک دوسری مثنوی "سعادت نامہ" بھی معروف ہے۔ یہاں ہم صاحب سلوک و عرفان کی توصیف میں "گلشن راز" کے چند شعر نقل کرتے ہیں۔

مسافر آن بود کو بگذرد زود | زخود صافی شود چون آتش از دود
سلوکش سیر کشفی دان ز امکان | سوی واجب بترک شین و نقصان
شریعت پوست مغز آن حقیقت | میان این و آن باشد طریقت
خلل در راہ عارف نقص مغز است | چو مغزش پختہ شد بی پوست نغز است
دل عارف شناسای وجود است | وجود مطلق او را چو شہود است

اوحدی مراغی اصفہانی (م ۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء)

رکن الدین اوحدی، مراغہ (آذربائیجان) کے رہنے والے تھے مگر مدتوں اصفہان میں رہے۔ صوفی تھے اور شیخ ابوحامد اوحد الدین احمد کرمانی (م ۶۳۵ھ) کی نسبت کی بناء پر "اوحدی" تخلص اختیار کیا ہے۔ آپ کے دیوان میں رباعیات قصائد اور غزلیات ملتی ہیں۔ "جام جم" آپ کی عرفانی مثنوی ہے جس میں معاشرتی حالات پر بے لاگ تبصرہ ملتا ہے۔

آپ کا دیوان اور مثنوی چھپ چکے ہیں۔ یہاں ہم مثنوی سے چند اشعار نقل کرتے ہیں۔ ان اشعار میں نام نہاد صوفیہ اور جوانمردوں کی بداعمالی پر طنز کیا گیا ہے۔

پیش ازیں مردی چنیں بودہ است؟ رسم اہل فتوت ایں بودہ است؟
ہرکجا قاضی است چند انداز چند نکری مجتہدیدہ ایست باز
از دو رو راست کردہ سبلت و ریش وز پی جو مردان و حشیش
روز در کار سخت بی خورد و خفت در عجز بخانہ بردہ شب زرمعت
سفرہ پر نان و دیگ پر خوردی قالب و قلب خالی از مردی
کند از شہر چند سفلہ بکف بنشاند برابر اندر صف
ہر کی یار کردہ در بوتی ... سال و مہ در خیال معشوق ...

خواجو کرمانی (م ۷۵۳ھ/ ۱۳۵۲ء)

نام کمال الدین، لقب ابوالعطا اور تخلص خواجو تھا۔ نامور عارف اور شاعر تھے۔ ان کا مولد کرمان تھا مگر عمر کا بیشتر حصہ شیراز میں گزارا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ خواجو سفر حج پر حرمین شریفین گئے تھے اور کچھ عرصہ تبریز میں بھی رہے۔ آخری عمر میں خواجہ حافظ شیرازی آپ کے ہم صحبت رہے ہیں۔

خواجو حضرت سید علاؤالدولہ سمنانی (م ۷۳۶ھ) کے حلقہ مریدین میں شامل تھے۔ آپ کے دیوان میں قصیدہ، غزل، قطعہ اور رباعی وغیرہ ہے۔ آپ کی مثنویاں ہمائے ہمایوں، کمال نامہ، گل و نوروز، روضۃ الانوار، سام نامہ اور گوہرنامہ معروف ہیں۔ ان مثنویوں میں آپ نظامی کے مقلد ہیں۔ غزل میں آپ سعدی کے پیرو ہیں یہ پیروی اس حد تک ہے کہ آپ کی بعض غزلیں سعدی سے منسوب ہو گئیں اور سعدی کی بعض آپ کے نام۔ مثلاً جس غزل کا شعر ذیل مطلع ہے۔ یہ سعدی کی ہے مگر ڈاکٹر صفا کے پائے کے محقق نے بھی گنج سخن میں اسے خواجو کے نام سے منسوب کیا ہے۔

خوبرویان جفا پیشہ وفا نیز کنند بکسان درد فرستند و دوا نیز کنند

آپ کی ایک غزل کا انتخاب درج ذیل ہے۔

پیش صاحب نظران ملک سلیمان باد است　　بلکه آنست سلیمان که ز ملک آزاد است

آنکه گویند که بر آب نهاد است جهان　　مشنو ای خواجه، که چون درنگری بر باد است

هر نفس مهر فلک بر دگری می افتد　　چه توان کرد چو این سفله چنین افتاد است

دل درین پیرزن عشوه گر دهر مبند　　کاین عروسی است که در عقد بسی داماد است

گر پر از لالهٔ سیراب بود دامن کوه　　مرو از راه که آن خون دل فرهاد است

حاصلی نیست بجز غم ز جهان خواجه را　　شادی جان کسی کو ز جهان آزاد است

ابن یمین (م ۷۶۹ھ/۱۳۶۷ء)

امیر محمود ابن یمین، خراسان کے ایک قصبہ فریومد کے رہنے والے تھے۔ کئی ایلخانی اُمراء کی مدح کی ہے آپ کے قصیدے اچھے ہیں، مگر بنیادی طور پر آپ 'قطعات' کے شاعر ہیں۔ انوری کے بعد 'قطعہ نویسی' میں آپ کا کوئی معاصر نہیں ہے۔ آپ کے قطعات میں مفید اخلاقی باتیں ہیں اور معاشرتی مسائل پر اظہار رائے ہے۔ ان قطعات میں آپ کی بے باکی قابل داد ہے۔ یہاں مثال کے طور پر ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔ اس کا ابتدائی مضمون انوری سے ماخوذ ہے اور اقبال نے اسے اردو میں منتقل کر کے 'بال جبریل' میں "گدائی" کے عنوان سے درج کیا ہے ؎

هر کرا در جهان همی بینی　　گر گدائی و گر شهنشاهی است

طالب لقمهٔ ایست در پی آن　　در تگ چاه یا سر گاهی است

مقصد خلق جمله یک چیز ست　　لیک هر یک فتاده در راهی است

اہل عالم به نان چو محتاجند　　پس به نزدیک هر که آگاهی است

شاه را بر گدا چه ناز رسد　　چون گدا شاه نیز نان خواهی است

عبید زاکانی (م ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء)

خواجہ نظام الدین محمد، قزوین کے رہنے والے تھے۔ مگر اپنے خاندان 'زاکانیان' کی نسبت سے زاکانی کہلاتے تھے۔ تخلص عبید تھا۔ آپ نے نثر میں اخلاق اشراف، دہ فصل، صد پند اور دلکشا نامی رسالے لکھے۔ موش و گربہ اور عشاق نامہ آپ کی مثنویاں ہیں۔ آپ نے غزل اور قصیدہ بھی خوب لکھا۔ مگر جس بات نے انہیں اپنے عصر میں ممتاز کر دیا وہ ان کے معاشرتی اُنتقادات ہیں۔ ایلخانیوں کے مظالم اور تاخت و تاراج کو آپ نے ہزل اور بذلہ سنجی سے بیان کیا ہے۔ نظم و نثر میں آپ سعدی کے پیرو ہیں مگر مطائبہ اور انتقادات میں امام فن مانے جاتے ہیں۔ استاد اقبال عباس مرحوم نے آپ کے کلیات کو مدتوں پہلے طبع کروا دیا تھا۔ رندوں اور قلندروں

کے حالات پر مبنی آپ کی غزل ملاحظہ ہو۔

چون قلندر مانیم بر ما قلم نباشد | بر در وجود ما را باک از عدم نباشد
سلطان وقت خویشیم گرچه زری ظاہر | لشکر کشان ما را طبل و علم نباشد
مشتی مجردانیم بر فقر دل نہادہ | گر ہیچ مان نباشد از ہیچ غم نباشد
در دست و کیسۂ ما دینار کس نبیند | بر سکۂ دل ما نقش درم نباشد
چون ما بہیچ حالی آزار کس نخواہیم | آزاد خاطر ما شرط کرم نباشد
در راه پاک بازان گو لاف فقر کم زن | ہمچو عقیدہ، ہر کو ثابت قدم نباشد

سلمان ساوجی (م ۷۷۸ھ/۱۳۷۶ء)

جلال الدین سلمان، ساوہ (نزد کاشان) کے رہنے والے تھے۔ ساوہ سے ہی ساوجی کی نسبت بتائی گئی ہے۔ آپ غزل اور قصیدہ کے استاد تھے۔ 'جمشید و خورشید' اور 'فراق نامہ' آپ کی داستانی مثنویاں ہیں۔ غزل میں آپ کی استادی کا یہ عالم ہے کہ مدتوں آپ کی کئی غزلیں دیوان حافظ میں شامل ہیں اور حافظ کی غزلیں آپ کے دیوان میں۔ لیکن 'سبک شناس' امتیاز نہ کر سکے۔ آخر پرانے مخطوطے مل جانے سے یہ عقدہ حل ہوئے۔

سلمان نے بغداد میں امرائے جلائری کے دربار میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔ غزل میں آپ استادِ سخن سعدی کے پیرو ہیں۔ اور قصیدہ میں سبک خراسانی کے بڑے شعراء مثلاً انوری، عنصری، خاقانی اور کمال اصفہانی وغیرہم کے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ ادبی بازگشت کے دور، (عہد قاجاریہ) سے قبل، سلمان کے پائے کا کوئی قصیدہ نگار پیدا نہیں ہوا۔ مگر چونکہ آپ کے قصائد کی زبان بالعموم مشکل ہے۔ اس لئے ہم نمونۂ شعر کے طور پر ان کی ایک غزل کا انتخاب نقل کرتے ہیں؎

در ازل عکس می لعل تو در جام افتاد | عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد
جام ما از شکر لعل لبت نقل کرد | راز سر بستۂ غم در دہن عام افتاد
خال مشکین تو در عارض گندم گون دید | آدم آمد ز پی دانہ و در دام افتاد
عشق بر کشتن عشاق تفاول می کرد | اولین قرعہ کہ زد بر من بدنام افتاد
دوش سلمان بقلم شرح غم دل می داد | آتش اندر ورق و دود در اقلام افتاد

خواجہ حافظ شیرازی (م ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء)

لسان الغیب خواجہ شمس الدین محمد حافظ ایران کے نامور ترین شعرا میں سے ایک ہیں۔ حافظ قرآن تھے اور اسی صفت کو اپنا تخلص بنائے رکھا۔ آپ کی زندگی شیراز میں بسر ہوئی

اور وہیں دفن ہیں۔ ایک دفعہ یزد گئے۔ دوسری بار شاہان دکن کی دعوت پر برصغیر کے عازم ہوئے مگر نہ آسکے۔

خواجہ صاحب نے کمال ایجاز سے عاشقانہ اور عارفانہ مضامین نظم کئے ہیں۔ ان کے ہاں مولانائے روم کا حکمت و تصوف اور سعدی کا درس عشق ایک ساتھ نظر آتا ہے۔ آپ کے دیوان میں غزلیں ملتی ہیں۔ دو مختصر مثنویاں، ایک ساقی نامہ، چند قصیدے رباعیاں اس پر مستزاد ہیں۔ آپ نے سعدی اور خواجو کی پیروی کی۔ دیوان میں کم از کم ۴۰ غزلیں سعدی کی بحر و زمین میں ہیں اور چند خواجو کے زیر اثر، مگر الفاظ، تراکیب، معانی آفرینی اور دل آویزی میں آپ کا کلام از اول تا آخر منفرد ہے۔ دیوان حافظ کی اشاعتوں، تراجم اور شرحوں کی داستان بڑی طویل ہے۔ فارسی ادب کا ہر طالب علم چند معروف کتابوں کو پڑھنے کا ضرور آرزومند ہوتا ہے۔ اور ان میں ایک دیوان حافظ ہے۔ دیوان لوگ سے لوگ فالیں نکالتے رہے۔ اور اسی خاطر شاعر کا ایک لقب "لسان الغیب" ہے۔ حافظ اپنے زمانے میں کافی محترم تھے۔ شیراز کے اینجو خاندان اور آل مظفر کے بادشاہوں نے ان کی کافی قدردانی کی ہے۔

حافظ شیرازی نے غزل کو اس مقام تک پہنچایا جس سے فراز مقام تصور میں نہیں آتا۔ آپ کی زبان اس قدر شستہ ہے کہ آج تک پورے دیوان کا ایک لفظ بھی متروک نہیں مانا گیا۔ واقعی ان کی شاعری کو دیکھ کر 'خداداد نعمتیں' دعوت نظارہ دیتی ہیں۔

حسد چہ می بری ای سست نظم بر حافظ — قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

آپ کی ایک غزل کا انتخاب درج ذیل ہے۔

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند — گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
ساکنان حرم ستر و عفاف ملکوت — با من راہ نشین بادہ مستانہ زدند
آسمان بار امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند
شکر ایزد کہ میان من و او صلح افتاد — صوفیان رقص کنان ساغر شکرانہ زدند
جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چون ندیدند حقیقت، رہ افسانہ زدند
آتش آن نیست کہ از شعلۂ او خندد شمع — آتش آن است کہ در خرمن پروانہ زدند
کس چو حافظ نگشاد از رخ اندیشہ نقاب — تا سر زلف سخن را بہ قلم شانہ زدند

کمال خجندی (م ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء)

خجند، ماوراء النہر کا ایک علاقہ ہے۔ کمال الدین مسعود وہیں کے رہنے والے تھے۔ زندگی کا زیادہ

حصہ تبریز میں بسر کیا۔ سلطان حسین بایقرا (۸۷۲ - ۹۱۲ھ) کی مدح کی۔ ان کے عارفانہ مقام کے پیش نظر سلطان نے ان کی خاطر ایک خانقاہ بنوائی اور ایک وظیفے کے ساتھ انہیں اس خانقاہ میں فروکش ہونے کی اجازت دی۔ کمال وہیں رہنے لگے۔ اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے آپ کی تاریخ وفات اوپر لکھی ہوئی تاریخ کے علاوہ ۷۹۲ھ/ ۱۳۹۰ء بھی بتائی جاتی ہے۔ کمال غزل کے شاعر ہیں۔ آپ کی بیشتر غزلیں عرفانی اور عارفانہ ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

زاهدان کمتر شناسند آنچه ما را در سر است ... فکر زاهد دیگر و سودای عاشق دیگر است
زاهدا دعوت مکن ما را به فردوس برین ... کاشنای همت ما جیفه‌ای زان بر تر است
می به رندی گل رخان خوردن خوش است اگر سود ... این سعادت زاهدان شهر ما را کمتر است
ما به رندی در بساط قرب نقیم و هنوز ... همچنان پیر طریقت بر پای منبر است
داشت آن سودا کز سر دو پایت انداز دو کمال ... سر نهاد و همچنانش این تمنا در سر است

حضرت شاہ ولی کرمانی (م ۸۳۴ھ/ ۱۴۳۱ء)

سید نعمت اللہ شاہ کرمانی آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے بہت بڑے عارف تھے۔ آپ نے سو برس سے زیادہ عمر پائی ہے۔ آپ کا مولد حلب و شام ہے لیکن آپ کی عمر سمرقند، ہرات، یزد اور کرمان (علاقہ ماہان) میں بسر ہوئی ہے۔ آپ کا سلسلہ تصوف "نعمت اللہی" اب بھی ایران میں خاصا متداول ہے۔

حضرت شاہ ولی ۷۷۵ھ میں ماہان (کرمان) آئے اور ارشاد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا آپ عربی و فارسی میں سو سے زیادہ کتب و رسائل کے مصنف ہیں۔ ڈاکٹر وحید فرزانم، استاد دانشگاہ اصفہان نے شاہ صاحب پر بڑی تحقیقات کی ہیں۔

منزل جان جهان بر در جانانهٔ ماست ... مسکن اهل دلان، گوشهٔ میخانهٔ ماست
خلوتی بر در دو سرای خانه گرفتیم ولی ... حرم قدس یکی گوشهٔ کاشانهٔ ماست
تا ز شمع رخ او مجلس جان روشن شد ... نور شمع فلک از پرتو پروانهٔ ماست
دیده‌ای لؤلؤ لالا که ز دریا آرند ... حاصل اشک جگر گوشهٔ جانانهٔ ماست
تا ابد گنج خوشی در دو دل ما خواهد بود ... زانکه گنجش ز ازل در دل ویرانهٔ ماست
ساقیانه ساغر و پیاده می سوی من آر ... که مراد دو جهان یک لب پیمانهٔ ماست

قاسم انوار آذربائیجانی (م ۸۳۷ھ/ ۱۴۳۳ء)

سید معین الدین علی کا تخلص قاسم تھا مگر قاسم انوار کے لقب

سے معروف تھے۔ آذربائیجان اور گیلان میں تعلیم پائی اور طریقت سیکھی۔ بعد میں آپ خراسان گئے اور وہاں سے ہرات۔ ہرات میں آپ کے مریدوں کی کافی تعداد تھی۔ امیر تیمور اور امیر شاہرخ آپ کا احترام کرتے تھے۔ مولانا قاسم انوار نے آخری عمر سمرقند اور خرجرد (جام) میں گزاری انیس العاشقین اور انیس العارفین آپ کی معروف مثنویاں ہیں۔ گیلانی لہجے اور ترکی زبان میں بھی آپ نے شعر کہے ہیں۔ آپ کا دیوان اشعار، استاد سعید نفیسی مرحوم کے مقدمے کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے۔

آن یار چو ناگاہ بہ بازار بر آمد — از ہر طرفی مشرق انوار بر آمد
ناگاہ تجلی جلال اثری کرد — از روز نہ روزِ، شب تار بر آمد
وصفش نتوان گفت کہ از دیدہ نہان شد — باخرقہ برون رفت و بہ زنار بر آمد
ما منتظر دولت دیدار تو بودیم — ناگہ علم وصل ز کہسار بر آمد
قاسم نتوانی کہ دگر گوشہ گزینی — چون نور رخش از در و دیوار بر آمد

کاتبی ترشیزی نیشاپوری (م ۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء)

محمد کاتبی نے تجنیسات، ذوبحرین مثنویاں لکھیں۔ یہ فنی کلام ہے۔ حسن و عشق ناظر و منظور اور بہرام و گل اندام کے نام سے آپ کی طویل نظمیں ملتی ہیں۔ دیوان میں دو بیتیاں، غزلیں اور قصیدے ہیں۔ شاعر کے مفصل حالات زندگی ابھی معلوم نہیں۔ کلام ہموار ہے اور نمونہ درج ذیل ہے۔

بیا کہ عمر چو باد بہار می گزرد — بکار باش کہ ہنگام کار می گزرد
تو غافلی و ز شوق خون دیدہ می بارد — کہ روز می رود و روزگار می گزرد
ز چشم اہل نظر کسب کن حیات ابد — کہ آب خضر درین جویبار می گزرد
مرا تو رفتہ چو کمان زیر خاک رفت و ہنوز — خدنگ آہ ز سنگ مزار می گزرد
ز جان کاتبی از تیر غم گذشت گذشت — درین دیار ازین بی شمار می گزرد

شاہی سبزواری (م ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء)

امیر آقا ملک شاہی خاندان سربداران کا فرد تھا۔ وہ بایسنقر میرزا ابن سلطان شاہرخ کے دربار سے منسوب تھا۔ آخری عمر میں وہ اپنے مولد سبزوار میں رہا۔ شاہی کی غزل دلآویز اور لطیف خیالات کی حامل ہوتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اشک چو پردہ می درد خلوتیان راز را — چند بدل فرو خورم نالۂ جانگداز را

ہر سحری ز خونِ دل آب زنم براہِ تو | رُفتہ بدان مژہ سجدہ گہ نیاز را
دیدہ شب نخفتہ را وصفت دو زلف تُگن | با دلِ پاسبان نگر حال شب دراز را
ای طلبم با آرزو صحبتِ عافیت دلی | تہمت عقل چون نہم این دلِ عشقباز را
شاہی از این سرود غم طرز جنون گرفت دل | رخصت گفت و گو مدہ طبع سخن طراز را

ابن حسام خراسانی (م ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء)

محمد ابن حسام، کاشت کاری کرتے تھے منطقہ قہستان میں ان کی کافی زمین تھی اس لئے انہیں درباروں کا رُخ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ خوددار اور پرہیزگار شخص تھے۔ مذہباً شیعہ تھے۔ اہل بیتؑ کے مناقب میں زورِ قلم صرف کیا ہے۔ خاوران نامہ آپ کی معروف مثنوی ہے جس میں حضرت علیؓ کی ان جنگوں کا بیان ہے جو عوام الناس میں معروف ہیں مثلاً قباد، تہماسپ دیو اور اژدہا کے ساتھ جنگ۔ آپ کے مذہبی قصائد بھی معروف ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے مناظرِ فطرت کی توصیف میں بھی اشعار کہے ہیں۔ نمونہ یہ ہے:

چو زلف نگار و سمن بر بر زد | چو برگ گل سنبل تر بر زد
ز خطش نیارم نوشتن کہ ترسم | سر خامہ بر روی دفتر بر زد
ز قدش اگر در چمن راست گویم | چو سرو سہی قد سر بر زد
چو رویش کہ یاد آرد کہ صورت نگارد | کہ در بتکدہ، دست آزر بر زد
گر آن سر بتابد بر ایوان خورشید | ز تابش دل زہرہ در بر بر زد
بر رخ دلم دانۂ خال مشتاق | کہ چون نیم بسمل کبوتر بر زد

مولانا جامی (م ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء)

مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی صوفی صافی اور بڑے شاعر تھے۔ حافظ شیرازی کے بعد مسند شعرو سخن کی بے نظیر استادی آپ کو ہی میسر رہی اور صدیوں بعد آپ جیسے باکمال منصۂ شہود پر آئے ہیں اسی لئے خاتم الشعراء کہلاتے ہیں۔ آپ خراسان کے علاقہ جام میں قصبہ خرجرد کے رہنے والے تھے۔ جامی نے سمرقند اور ہرات میں تعلیم حاصل کی۔ سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی اور مولانا سعدالدین کاشغری کی وفات کے بعد آپ اس سلسلے کے بڑے روحانی پیشوا قرار پائے۔ سلطان حسین بائیقرا اور اس کا فاضل وزیر امیر علی شیر نوائی مولانا جامی کا بیحد احترام کرتے تھے۔

جامی نثرو نظم کی جامع شخصیت تھے۔ نفحات الانس، سوانح بہارستان اور اشعۃ اللمعات

نثر میں آپ کی معروف کتابیں ہیں۔ ہفت اورنگ یا سبعہ آپ کی سات مثنویاں ہیں سلسلۃ الذہب سلامان و ابسال، تحفۃ الاحرار، سبحۃ الابرار، یوسف و زلیخا، لیلیٰ مجنوں اور خرد نامہ سکندری۔ ان مثنویوں میں آپ نظامی اور خسرو کے مقلد ہیں۔ آپ کے ضخیم دیوان میں سب اصناف سخن موجود ہیں۔ اور امیر خسرو کی تقلید میں آپ نے اسے فاتحۃ الشباب، واسطۃ العقد اور خاتمۃ الحیات نام کے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ امیر خسرو کے دیوان کے پانچ حصے ہیں، تحفۃ الصغر، وسط الحیاۃ، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایۃ الکمال۔

مولانا جامی کے بارے استاد ڈاکٹر علی اصغر حکمت کی کتاب "جامی" (تہران ۱۳۲۰ھ ش/ ۱۹۴۱ء) خاصی جامع ہے۔ آپ کے اشعار میں زور بیان ہے، دلآویزی، ایجاز، عرفان و تصوف اور جدت ایک ساتھ نظر آتی ہے۔ آپ سماع کے قائل نہ تھے مگر کلام میں بلا کی موسیقیت اور رقصیہ شان موجود ہے۔ اس کے باوجود یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جامی۔ نظامی، رومی، سعدی امیر خسرو اور حافظ وغیرہم کے مقلد ہیں۔ اور اکثر ان کے اشعار کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے۔ ایک غزل کا انتخاب ہے۔

ریزیم ز مژہ کوکب بی ماہ رخت شبہا — تاریک شبی دارم با این ہمہ کوکبہا
چون از دل گرم من بگذشت خدنگ تو — از بوسۂ پیکانش شد آبلہ ام لبہا
از بسکہ گرفتاران مردند بہ کوی تو — بادش ہمہ جان باشد خاکش ہمہ قالبہا
از تاب و تب ہجران گفتم سخن وصلت — بود این ہذیان آری، خاصیت آن تبہا
تا دست برآوردی زان غمزہ بہ خونریزی — بر چرخ رود ہر دم از دست تو یاربہا

آپ کا ایک معروف قطعہ ہے۔

بہ دندان رخنہ در فولاد کردن — بہ ناخن راہ در خارا بریدن
فرو رفتن بہ آتشدان نگونسار — بہ پلک دیدہ آتش پارہ چیدن
بہ فرق سر نہادن صد شتر بار — ز مشرق جانب مغرب دویدن
بسی بر جامی آسان تر نماید — کہ بار منت دونان کشیدن

ایلخانی نثر

اس عہد میں فارسی نثر کو بڑا فروغ ہوا۔ ہلاکو خاں کے ہاتھوں عباسی خلافت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ بغداد کی سیاسی، دینی اور ادبی مرکزیت بھی ختم ہو گئی۔ اور اس کا اثر عربی زبان پر

بھی پڑا۔ مسلم ممالک میں عربی میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری تو رہا لیکن ایران میں عربی کا رواج ذرا کم ہوگیا۔ اور ایرانی اہل قلم کی توجہ فارسی کی جانب زیادہ ہوگئی۔ زیر نظر عہد میں سب سے زیادہ کتابیں تاریخ کے موضوع پر لکھی گئیں کیونکہ تاتاریوں کو اپنی بقائے نام سے بڑی دلچسپی تھی ان کتب میں جہانگشائے جوینی یا تاریخ وصاف جیسی تاتاریوں سے متعلق خصوصی اور جامع التواریخ یا تاریخ گزیدہ عمومی تواریخ شامل ہیں۔ پر تکلف نثر کا رواج اس دور میں اپنے انتہائے کمال کو پہنچ گیا۔ جہانگشائے جوینی اور تاریخ وصاف نثر فنی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان کتابوں میں اسلوب کی ادبیت غالب نظر آتی ہے۔ لیکن بے تکلف اور سادہ اسلوب میں بھی اسی عہد کے اندر جامع التواریخ، تاریخ گزیدہ اور تجارب السلف جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ اس دور کی زبان میں تاتاریوں کی حکومت کے سبب ان کی زبان ترکی مغولی کے بہت سے الفاظ فارسی میں شامل ہو گئے۔ اور نثر میں استعمال ہونے لگے۔ مثلاً اردو، چپاول، قراول، یلغار، قزاول وغیرہ۔

کتب تاریخ

تاریخ جہانگشائے جوینی: یہ تاریخ عطا ملک جوینی کی تالیف ہے۔ خاندان جوینی کو عہد مغول میں دہی اقتدار حاصل رہا ہے جو برمکیوں کو خلافت عباسیہ میں حاصل تھا۔ عطا ملک تاتاریوں کا دبیر رہا اور ان کی طرف سے ۲۴ سال تک بغداد کا حاکم رہا۔ حاسدوں کی بدگوئی کی وجہ سے اس نے اذیتیں بھی برداشت کیں لیکن تاتاریوں کے دوسرے وزرا کے مقابلے میں اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ ۱۲۸۲ء/ ۶۸۱ھ میں طبعی موت مرا۔

تاریخ جہانگشا میں جہانگشا سے مراد چنگیز خاں ہے اور یہ اسی کے اسلاف واخلاف کی تاریخ ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ چنگیز خاں، اس کے خاندان اور اولاد کے بارے میں چغتائی کے زمانے تک ہے۔ دوسرے حصے میں خوارزمشاہیوں کی تاریخ جلال الدین منکبرنی تک ہے۔ تیسرا حصہ اسمٰعیلیوں، حسن بن صباح اور قلعہ الموت کے بارے میں ہے یہ کتاب تین جلدوں میں مرزا محمد قزوینی کے فاضلانہ مقدمے اور حواشی کے ساتھ گیب میموریل کے اہتمام میں شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر بوئل نے دو جلدوں میں اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور وہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ یہ اپنے موضوع پر مستند ترین تاریخ ہے۔ جوینی نے تاتاریوں کے حملے کا جواز پیدا کر کے ان کا حق نمک ادا کیا ہے لیکن تاتاریوں کے بدترین دشمن جلال الدین محمد خوارزمشاہ کا ذکر وہ ایک ہیرو کی طرح کرتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے قتل عام پر بھی کہیں کہیں اس کی مسلمانی جاگ

پڑتی ہے۔ کتاب کا طرز تحریر انتہائی پُر تکلف ہے۔ عبارت میں عربی الفاظ اقوال و آیات اور اشعار کا استعمال عام ملتا ہے۔

تاریخ وصاف

اس کتاب کا اصل نام "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" ہے مصنف کا نام عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی ۱۸ا۷ھ تھا لیکن وہ دربار سے وابستہ ہونے کی بنا پر وصاف یا وصاف الحضرت کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے اپنی تاریخ سلطانیہ کے شہر میں ۱۳۱۲ء/۷۱۲ھ سلطان اولجائتو کے حضور میں پیش کی۔ تاریخ وصاف ایک لحاظ سے تاریخ جہانگشای جوینی کا تکملہ ہے۔ ہلاکو خاں اور اس کے جانشینوں کی تاریخ ہے اس میں ۱۲۵۸ء/۶۵۶ھ سے ۱۳۲۸ء/۷۲۸ھ تک یعنی سقوط بغداد سے سلطان ابوسعید کے عہد تک کے واقعات ہیں۔ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کا اسلوب کتاب کے اصل نام کی طرح مشکل اور پُر تکلف ہے۔ تاریخ وصاف پُر تکلف اور فنی نثر کا نقطۂ کمال ہے۔ اس کے باوجود تاریخی صحت کے اعتبار سے ایک امتیاز کی مالک ہے۔ تاریخ وصاف ۱۸۵۳ء/۱۲۶۹ھ میں شائع ہو چکی ہے۔

کم و بیش ایک صفحہ سے ایک سطر کا مطلب نکلتا ہے۔ حالیہ سالوں میں عام فہم فارسی میں اس کا خلاصہ چھپ گیا ہے۔

تاریخ گزیدہ

حمداللہ مستوفی قزوینی کی یہ تاریخ ۷۳۰ھ میں مکمل ہوئی اس کتاب میں ابتدائے آفرینش سے لے کر مصنف کے زمانے تک کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ یہ تمہید اور خاتمے کے علاوہ چھ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب انبیاء و حکماء، دوسرے میں قدیم ایرانی بادشاہوں تیسرے باب میں پیغمبر اسلام صلعم ان کے خلفاء، اولاد چوتھے باب ایران کے مسلمان بادشاہوں پانچویں باب میں ائمہ، قراء، محدثین، مشائخ، علماء اور شعراء کے حالات بیان ہوئے ہیں چھٹا باب قزوین کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ یہ تاریخ ایک طویل زمانے پر محیط ہے اس لئے اس میں واقعات کی تفاصیل تو نہیں ملتیں لیکن اختصار کے باوجود یہ کتاب ایرانی تاریخ کے معتبر ماخذوں میں شامل ہے۔ یہ براؤن کے اہتمام میں ۱۹۱۰ء میں گیب میموریل کے سلسلہ مطبوعات میں شائع ہو چکی ہے اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا ڈاکٹر محمود دبیر سیاقی نے کتاب کے جغرافیائی مطالب اور ایران سے متعلقہ حصے کو الگ الگ دو جلدوں میں شائع کرایا ہے۔

ظفرنامہ

حمداللہ مستوفی کی ۷۵ ہزار اشعار پر مبنی منظوم تاریخ ہے جو /۷۳۵ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ آغاز اسلام سے عہد مغول تک محیط ہے۔ یہ ایک لحاظ سے شاہنامہ فردوسی کا تکملہ ہے۔ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

تجارب السلف

ہندوشاہ بن سنجر نخجوانی نے ۷۲۴ھ میں صفی الدین محمد طقطقی کی عربی کتاب منیۃ الفضلاء فی تواریخ الخلفاء والوزراء کا سلیس اور رواں فارسی میں تجارب السلف کے نام سے ترجمہ کیا۔

تاریخ بناکتی

کتاب کا اصل نام "روضۃ اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب" ہے۔ یہ ابوسلیمان داؤد بناکتی کے قلم سے ۱۳۱۷/۷۱۷ء میں اختتام کو پہنچی۔ بناکتی نے جامع التواریخ کو پیش نظر رکھ کر اپنی تاریخ مکمل کی۔ یہ مندرجہ ذیل نو حصوں پر مشتمل ہے۔

(۱) انبیاء و اولیاء (۲) قدیم ایرانی بادشاہ (۳) پیغمبر اسلام صلعم، خلفاء (۴) سلاطین ایران (۵) یہودیان (۶) مسیحیان و فرنگیان (۷) ہندیان (۸) چینیان (۹) مغولان۔

یہ کتاب دوسری اقوام کے بارے میں قیمتی معلومات کی حامل ہے۔ اس سے مصنف کی وسعت علم ظاہر ہوتی ہے۔

کتاب مجمع الانساب

یہ مختصر کتاب ۱۳۳۲/۷۳۳ھ میں مکمل ہوئی۔ مصنف کا نام محمد بن علی شبانکارہ ہے۔ یہ تاریخ ابتدائے آفرینش سے مصنف کے زمانے تک کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

نظام التواریخ بیضاوی

مشہور مفسر ناصرالدین بیضاوی نے یہ تاریخ ۱۲۷۴/۶۷۴ میں لکھی۔ یہ حضرت آدم سے لے کر کتاب کے زمانہ تالیف کے تاریخی واقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔

اس عہد میں لکھی جانے والی ایک اور کتاب نفثۃ المصدور ہے جسے نورالدین محمد نسوی نے انتہائی پر تکلف میں ۶۳۲ھ میں لکھا۔ اس میں سلطان جلال الدین منکبرنی کے ۶۲۰ھ کے بعد کے وقائع ہیں۔ یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے۔

جامع التواریخ رشیدی

جامع التواریخ فارسی زبان میں لکھی جانے والی اہم کتب تاریخ میں شمار ہوتی ہے۔ تاریخ نویسی میں یہ ایلخانی عہد کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس کا مصنف ایلخانی دور کا ایک فاضل وزیر رشیدالدین فضل اللہ ہمدانی

ہے۔ رشید الدین نے حدیث، فقہ، فلسفہ اور طب کی تعلیم پائی۔ طب میں مہارت کی وجہ سے اس کو غازان کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ اپنی خدا داد قابلیت کی بدولت طبیب سے وزیر بنا۔ غازان کی فرمائش پر اس نے یہ تاریخ لکھی۔ غازان کا جانشین اولجائیتو بھی اس کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اور اس نے بھی تاریخ نویسی کے کام کو جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ اولجائیتو کے بعد سلطان ابوسعید کے عہد میں رشید الدین فضل اللہ کو اس عہد کے دیگر نامور وزراء کی طرح ۱۳۱۸/۷۱۹ھ ذلت و رسوائی کے ساتھ قتل کرا دیا گیا۔

رشید الدین نے تاتاریوں کی تاریخ لکھنے کے لئے ان کی زبان سیکھی۔ ان کے دارالحکومت میں دوسرے ممالک کے جو سفیر موجود تھے ان کی معلومات سے بھی فائدہ اٹھایا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں لکھی گئی۔ پہلی جلد میں تاتاری قبائل، ان کی روایات و رسومات کے علاوہ چنگیز خاں سے غازان کے زمانے کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ دوسری جلد انبیاء، قدیم ایرانی شہنشاہوں، خلفائے اسلام، غزنویوں، سلجوقیوں، خوارزمشاہیوں، اتابکوں، ترکوں، چینیوں، عبرانیوں، فرنگیوں، ہندوستانیوں اور بدھ مذہب کے بارے میں ہے۔ اس کی تیسری جلد چین، تاتار اور ہمسایہ ممالک کے جغرافیے پر مشتمل تھی۔ لیکن جامع التواریخ کے جو نسخے اب تک ملے ہیں ان میں تیسری موجود نہیں ہے۔ اس کی پہلی جلد تاریخ غازانی کے نام سے مشہور ہے۔ اس تاریخ کے مختلف حصے ایران، ترکیہ اور فرانس سے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن پوری کتاب اب تک شائع نہیں ہو سکی۔ چونکہ یہ ایک عالمی تاریخ ہے اس لئے مختلف اقوام نے اس کے مختلف حصے شائع کئے ہیں۔

جامعیت کے اعتبار سے کوئی فارسی تاریخ جامع التواریخ کے پائے کو نہیں پہنچی۔ مختلف اقوام کے بارے میں اتنی معلومات اس سے پہلے کسی کتاب میں نہیں ملتیں۔ ڈاکٹر بویل نے رشید الدین فضل اللہ کو پہلا مورخ قرار دیا ہے جس نے ایک عالمی تاریخ لکھی۔ ۱۹۷۰ء میں تہران میں رشید الدین کے بارے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا بھر کے فضلاء نے اس مورخ کو خراج تحسین پیش کیا۔

(کتاب کی زبان سادہ و رواں ہے)

گلستان ایران کے نادر الکلام شاعر اور سحر طراز ادیب شیخ مشرف الدین کا نثری شاہکار ہے۔ فارسی نثر کی کسی دوسری کتاب کو اس کے برابر مقبولیت ان ممالک میں حاصل نہیں ہوئی۔ جہاں فارسی بولی یا لکھی جاتی ہے۔ اس کی تقلیدیں لکھی گئیں لیکن کوئی کتاب اس کی عظمت کو نہیں پہنچ سکی۔ شیخ نے گلستان ۶۵۶ھ میں تصنیف کی۔ اور اسے سعد

بن ابی سعد زنگی ۶۵۶ھ کے نام معنون کیا ہے۔ گلستان کا موضوع اخلاقیات ہے۔ لیکن سعدی نے نصیحت کی کڑوی گولی ظرافت کے شہد میں ملاکر پیش کی ہے، اور اپنے مقصد کو چھوٹی چھوٹی حکایات کے ذریعے۔ خاطر نشان کرایا ہے کتاب سیرت پادشاہان، اخلاق درویشان فضیلت قناعت، فضیلت خاموشی، عشق و جوانی، ضعف و پیری، تاثیر تربیت، اور آداب صحبت کے عنوانات کے تحت آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، تمہید اور خاتمہ اس کے علاوہ ہیں۔

گلستان، ابواب کے حسن ترتیب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ سیرت پادشاہان کے بعد اخلاق درویشان اور عشق و جوانی کے بعد ضعف و پیری سے کتاب میں ایک معنوی توازن قائم ہو گیا ہے بہت سی حکایات میں سعدی نے اپنی ذات کو داخل کر کے ان کی تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔ سعدی نے اس دور میں انسانی عظمت کا پرچم بلند کیا، جب حملہ مغول کے بعد انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ شیخ نے اس دور جبر و استبداد کے جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر قلم کی آبرو رکھ لی۔ سعدی نے ظالم حاکموں اور ریاکار درویشوں دونوں کو معاف نہیں کیا۔ معلم اخلاق کی حیثیت سے سعدی کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس کے باوجود ان کے بعض اخلاقی نظریات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

سعدی نے گلستان کی نثر میں جا بجا شعر کے پیوند لگا کر نثر کی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک معجز بیان نثر نگار اور جادو نگار شاعر کی نثر و نظم کا ایک دلکش امتزاج ہے۔ سعدی کا انداز بیان سادہ نہیں ہے گلستان کی نثر مقفیٰ اور مسجع ہے۔ اس میں صنائع بدائع کا استعمال بھی ملتا ہے۔ لیکن سعدی نے لفظوں کی خاطر معانی کا خون کبھی نہیں کیا۔ ان کے ہاں تکلف و تصنع کی گرانباری محسوس نہیں ہوتی چھوٹے چھوٹے جملے ریشم کے لچھوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کا ایجاز اعجاز بن جاتا ہے۔ موزوں متناسب اور ہم آہنگ الفاظ ان کی نثر کا حسن نکھار جاتے ہیں۔

بعض محققین نے گلستان کا شمار مقامات حمیدی جیسی کتابوں میں کیا ہے اور اسے بھی مقامہ نویسی ہی قرار دیا ہے۔ لیکن گلستان، مقامات حمیدی کی طرح خشک اور بے جان نہیں ہے۔

کتب فلسفہ و تصوف

اخلاق ناصری علم اخلاق پر یہ گراں مایہ کتاب خواجہ نصیر الدین طوسی کی ۶۳۳ھ کی تصنیف ہے۔ خواجہ کو اپنی زندگی کا ایک حصہ قہستان میں اسماعیلیوں کے ہاں گزارنا پڑا۔ اور اخلاق ناصری اسی زمانے میں ۶۳۳ھ میں حاکم قہستان ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور کی فرمائش اور اسی کے نام پر لکھی گئی۔ ابن مسکویہ کی کتاب طہارۃ الاعراق خواجہ کے پیش نظر تھی۔ تہذیب الاخلاق کا باب اسی کتاب سے ماخوذ ہے طوسی نے تدبیر منزل اور سیاست مدن کے ابواب بوعلی سینا کے رسالہ تدبیر منزل اور فارابی کی السیاست المدنیہ سے اخذ و اقتباس کر کے اخلاق ناصری میں شامل کیا۔ ان تین مقالوں کے علاوہ اخلاق ناصری ایک مقدمہ اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں اسماعیلی عقائد کی جھلک موجود تھی۔ ہلاکو خان کے حملوں سے اسماعیلیوں کی قوت ختم ہوئی تو طوسی ہلاکو کے مقربین میں شامل ہو گیا۔ اور اس نے کتاب کے ان حصوں پر نظر ثانی کی جن میں اسماعیلی عقائد کا اثر تھا۔ استاد جلال ہمائی نے بڑی تحقیق و کاوش کے بعد اخلاق ناصری کا قدیم مقدمہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ موجودہ مقدمے سے بالکل مختلف ہے۔ کتاب کی نثر تو سادہ و بے تکلف ہے لیکن موضوع چونکہ فلسفیانہ ہے اس لئے اس کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ عربی الفاظ و اصطلاحات کے علاوہ جملے بھی طویل ہیں۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

اساس الاقتباس: منطق کے موضوع پر طوسی کی مشہور کتاب ہے۔

اوصاف الاشراف: اخلاق و تصوف پر خواجہ نصیر الدین طوسی کا رسالہ ہے۔ مشہور شاعر عبید زاکانی نے اخلاق الاشراف کے نام سے اس کی تحریف (پیروڈی) لکھی ہے۔

مدارج کمال
عرض نامہ
جاوداں نامہ
راہ انجام نامہ

یہ تمام رسائل افضل الدین محمد بن حسین جو بابا افضل کاشانی کے نام سے مشہور تھے کی تصانیف ہیں۔ ان کا موضوع فلسفہ و عرفان ہے۔ نثر بڑی سادہ و رواں ہے۔ افضل کاشانی کی وفات کے بارے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے استاد (رک: مجلہ دانشکدہ ادبیات شمارہ ۳ سال سوم)

مبادی موجودات

سعید نفیسی نے ۷۰۲ھ اور ڈاکٹر صفا نے ۶۰۰ھ کو ان کا سال وفات قرار دیا ہے۔

درۃ التاج علامہ قطب الدین محمود بن مسعود شیرازی م ۷۱۰ھ کی تصنیف ہے۔ یہ ایک طرح سے علوم فلسفی کا دائرۃ المعارف ہے۔ درس نظامی میں مدتوں سے شامل چلی آرہی ہے۔ تحفہ شاہی اور نہایت الادراک بھی علامہ قطب کی فارسی تصانیف ہیں۔

مرصاد العباد تصوف کے موضوع پر نجم الدین ابوبکر عبداللہ رازی کی تصنیف ہے۔ ابوبکر رازی شہور صوفی نجم الدین کبریٰ کے مرید تھے۔ اور ان کی عمر کا ایک حصہ قونیہ میں گزرا۔ اور مولانا جلال الدین رومی سے بھی ان کے روابط تھے ان کی وفات استاد سعید نفیسی مرحوم نے ۶۵۴ھ میں لکھی ہے۔ مرصاد العباد من المبدا الی المعاد ان کی معروف کتاب ہے۔ جو ۶۲۰ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کے علاوہ ابوبکر رازی نے فارسی میں رسالہ عشق و عقل بھی لکھا۔ ان دونوں کی نثر بہت فصیح ہے مرصاد العباد شیراز سے شائع ہو چکی ہے

فیہ ما فیہ مولانا جلال الدین رومی کی یہ تالیف ایک عرصہ تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی ہے۔ نکلسن اسے رومی کا ایسا نثر پارہ سمجھتا رہا جو تین ہزار پر مشتمل ہے۔ مولانا شبلی اسے معین الدین پروانہ کے نام رومی کے خطوط کا مجموعہ سمجھتے رہے۔ اس گمنام کتاب کی دریافت اور اشاعت کا سہرا مولانا عبدالماجد دریا بادی کے سر ہے انہوں نے ۱۹۲۸ء میں اسے اعظم گڑھ سے شائع کیا۔ ایران میں یہ کتاب استاد بدیع الزمان فروزانفر کے اہتمام میں ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب مولانا کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے مجالس وعظ میں ارشاد فرمائے۔ اور انہیں سلطان بہاؤ الدین نے ۷۱۱ھ میں مرتب کیا۔ "ملفوظات رومی" کے نام سے عبدالرشید تبسم نے فیہ ما فیہ کا ترجمہ اردو میں کیا ہے

فیہ ما فیہ کے علاوہ مجالس اور مولانا کے فارسی مکتوبات بھی قابل ذکر ہیں۔

مناقب العارفین یہ کتاب شمس الدین احمد افلاکی نے ۷۲۰ء میں مولانا رومی اور ان کے اہل خاندان کے بارے میں دو جلدوں میں تحریر کی۔ پہلی جلد میں مولانا کے اجداد کا بیان ہے۔ مناقب ۷۴۲ء میں مکمل ہوئی۔ مولانا رومی کے بارے میں یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ دونوں جلدیں ترکی محقق ڈاکٹر احمد آتش کے مقدمے و تصحیح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں انقرہ سے شائع ہو چکی ہیں۔

خلاصۃ المناقب مؤلف مولانا نور الدین جعفر بدخشی (م۔ ۷۹۱ھ) ہیں۔ یہ حضرت میر سید علی ہمدانی شاہ ہمدان کے مناقب کی کتاب ہے۔ مؤلف آپ کا مرید تھا۔ اور اس نے یہ کتاب ۷۸۴ھ میں لکھی ہے۔ وہ آپ کے مزار واقع ختلان (کولاب) پر معتکف رہا۔ اور اس کتاب کو لکھ کر وہاں سے رخصت ہوا ہے۔ کتاب کی زبان متین اور عربی عبارات سے مخلوط ہے۔ تصوف کے بارے میں ضمنی بحثیں بھی قابل قدر ہیں۔ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

تیموری دور کی نثر

ڈاکٹر صفا کا خیال ہے کہ تیموری دور میں فارسی زبان فضا انحطاط پذیر ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی پہلی وجہ اس عہد میں ترکی زبان کا رواج تھا۔ امیر علی شیر نوائی فارسی ادب کا سرپرست ہوتے ہوئے بھی ترکی زبان کی فضیلت کا قائل تھا۔ اس عہد کی فارسی کتب میں ترکی الفاظ عام ملتے ہیں خراسان و عراق کے وہ ادبی مراکز بھی نہ رہے جن سے فارسی ادب کی ترقی وابستہ تھی۔ اس کے باوجود تیموری عہد میں فارسی نثر کو ایک سازگار ماحول میسر رہا۔ اس عہد میں فارسی نثر چھٹی ساتویں ہجری کے پرتکلف انداز سے کم و بیش آزاد ہو چکی تھی۔ فارسی تحریروں میں صنائع بدایع کا استعمال بہت کم نظر آتا ہے۔ پرتکلف انداز زیادہ تر نثری کتابوں کے مقدمات یا امراء کے نام کتب کو منسوب کرتے وقت نظر آتا ہے۔ بہر حال تکلف کا زور اس عہد میں ٹوٹ چکا تھا۔ تاریخ و تذکرہ نویسی اس دور میں بھی نثر کا بڑا موضوع رہا۔ فارسی میں علمی موضوعات پر تصنیف کتب کا جو سلسلہ عہد مغول میں شروع ہو چکا تھا۔ اس دور میں بھی جاری رہا۔ سلطان بایقرا اور امیر علیشیر نوائی کی سرپرستی میں ہرات میں ترکی زبان میں بھی کئی کتابیں لکھی گئیں۔

کتب ادبی

رسالہ اخلاق الاشراف یہ رسالہ نظام الدین عبید اللہ معروف بہ عبید زاکانی (م۔ ۷۷۲ھ) کی تصنیف ہے۔ عبید زاکانی ایران کا سب سے بڑا ہجو گو اور طنز نگار ہے۔ یہ شخص قزوین کا رہنے والا تھا۔ لیکن قزوینی بھی اس کے تیرو نشتر سے نہیں بچ سکے۔ اس نے اپنا بیشتر وقت شیراز میں گزارا۔ رسالہ اخلاق الاشراف خواجہ نصیر الدین طوسی کے رسالہ اوصاف الاشراف کی تحریف (ریپیروڈی) ہے۔ عبید نے اپنے رسالہ میں اپنے زمانے کے لوگوں کے اخلاق یا بداخلاق کا مذاق اڑایا ہے۔ اس کے لئے

اس نے بڑا دلچسپ طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ پہلے مستند علمائے اخلاق کے نظریات کے مطابق فضائل نفسانی مثلاً حکمت، عفت، شجاعت، عدالت وغیرہ کی وضاحت کرتا ہے۔ لیکن ان فضیلتوں کو مذہب منسوخ کا عنوان دیتا ہے۔ اس کے بعد اپنے زمانے کے لوگوں کی اخلاقیات بیان کرتا ہے۔ اور انہیں مذہب مختار قرار دیتا ہے۔ یہ رسالہ حکمت، شجاعت، عفت، عدالت سخاوت، حلم و وفا اور حیا و وفا کے عنوانات کے تحت سات ابواب میں منقسم ہے۔ اور ۱۳۴۰/۷۴۰ ہجری کی تصنیف ہے۔ اس میں عربی عبارات و الفاظ کافی استعمال ہوئے ہیں۔

رسالہ اخلاق الاشراف کے علاوہ عبید زاکانی کی حسب ذیل نثری تصانیف بھی قابل ذکر ہیں۔

۱۔ ریش نامہ:۔ یہ عبید زاکانی اور اس کی داڑھی کے درمیان مکالمہ ہے۔ عبید داڑھی کو جوانی کے حسن و جمال کے زوال کا سبب سمجھتا ہے۔

۲۔ رسالہ صد پند:۔ طنزیہ انداز میں سو نصیحتوں پر مشتمل ہے۔ ۱۳۴۹/۷۵۰ھ کی تصنیف ہے۔

رسالہ تعریفات:۔ اس کو دہ فصل بھی کہتے ہیں۔ اس میں عبید نے مختلف قسموں کی اصطلاحات کی پیروڈی کی ہے۔ مثلاً

۳۔ الدانشمند:۔ آنکہ عقل معاش ندارد۔

الوکیل:۔ آنکہ حق باطل گرداند۔

القاضی:۔ آنکہ ہمہ او را نفرین کنند

۴۔ رسالہ دلگشا:۔ عربی و فارسی کی طنزیہ و مزاحیہ حکایات کا مجموعہ ہے۔

۵۔ مقامات۔ مقامات حمیدی کی طرح یہ مقامات فارسی میں ہیں۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔

۶۔ مکتوبات قلندران:۔ قلندروں کی اپنی زبان و محاورے میں ان کے دو خط ہیں۔ یہ بھی دراصل ان کے اسلوب کی پیروڈی ہے۔

بہارستان مولانا جامی نے گلستان سعدی کے طرز و اسلوب پر بہارستان کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اپنے بیٹے یوسف ضیاء الدین کو گلستان پڑھاتے وقت مولانا کو اس کتاب کی تصنیف کا خیال آیا۔ اور بہارستان ۸۹۲ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ گلستان کی طرح آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں درویشوں اور صوفیوں، دانشمندوں، عدل سلاطین سخاوت، عشق و محبت، مزاح، شعراء اور جانوروں کی حکایات ہیں۔ اس کا پہلا اور ساتواں باب تاریخی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان میں صوفیا اور شعرا کا ذکر آیا ہے۔

اس کتاب کے تراجم انگریزی اور جرمنی میں ہو چکے ہیں۔ بہارستان اپنی جگہ فصاحت و بلاغت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن جو بات گلستان سعدی میں ہے وہ اس میں نہیں ہے۔

انوار سہیلی حسین واعظ کاشفی م ۹۱۰ء کی تصنیف ہے۔ مصنف کے خیال میں کلیلہ و دمنہ پرانا ہی زبان و اسلوب کے اعتبار سے مشکل تھی۔ کاشفی نے اسے آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کی۔ انوار السہیلی ان کی اسی ادبی کاوش کا نام ہے۔ لیکن اس کا انداز بیان یہاں بھی کافی پر تکلف اور منشیانہ ہے۔ اس کتاب میں جانوروں کی زبانی اصول اخلاق و سیاسیات بیان کئے گئے ہیں۔ انوار السہیلی برصغیر پاک و ہند میں بڑی مقبول رہی ہے۔ یہ کتاب دربار سلطان حسین کے ایک امیر شیخ احمد سہیلی کے نام معنون کی گئی ہے۔

لطائف الطوائف حسین واعظ کاشفی کے بیٹے فخر الدین علی م ۹۳۹ھ کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دلچسپ مزاحیہ حکایات پر مشتمل ہے جو معاشرہ کے اہم طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ انداز بیان سادہ ہے۔ آقامی احمد گلچین معانی کے اہتمام میں یہ کتاب تہران سے شائع ہو چکی ہے۔

کتب تواریخ

زبدۃ التواریخ خواجہ نور الدین رشہاب الدین) معروف بہ حافظ ابرو نے یہ تاریخ بالسنقر مرزا کی فرمائش پر ۸۲۶ھ/۲۳ ۱۴ء میں مکمل کی۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس کی تیسری اور چوتھی جلد مولف کے زمانے تک کے ایرانی مسلمان فرمانرواؤں کے بارے میں ہے۔ زبدۃ التواریخ کے قلمی نسخے ویسے بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن مذکورہ بالا دونوں جلدوں کا تو کہیں پتہ نہیں ملتا تھا۔ خوش قسمتی سے تہران اور استنبول میں اس تاریخ کے دو ایسے نسخے ملے ہیں جن میں یہ جلدیں بھی موجود ہیں۔ دوسری جلد پیغمبر اسلام صلعم سے لے کر خاتمہ خلافت تک ہے۔

حافظ ابرو نے ایک کتاب جغرافیہ کے موضوع پر بھی لکھی۔ لیکن ابھی تک اس کی صرف ایک جلد شائع ہو سکی ہے۔ حافظ ابرو نے ۸۳۴ھ میں وفات پائی۔

مجمل التواریخ یہ کتاب فصیحی خوافی کی تصنیف ہے۔ ابتدائے آفرینش سے مولف کے اپنے زمانے تک کے واقعات پر محیط ہے۔ مقدمہ اور خاتمہ کے علاوہ دو مقالات پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں ابتدائے آفرینش سے پیغمبر اسلام صلعم تک اور مقالہ اول

میں ہجرت نبوی تک کی تاریخ ہے۔ دوسرے مقالے میں سال اول ہجری سے ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء تک کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ کتاب کا خاتمہ فصیحی کے مولد ہرات سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کتاب میں ہر سال کے وقائع ترتیب وار لکھے گئے ہیں۔ شعراء، ادبا اور علما کے حالات کے لئے بھی یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا انداز بیان سادہ ہے۔ اس کی تاریخی صحت مسلم نہیں ہے۔ مشہد سے استاد محمود فرخ کے اہتمام میں تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے

مطلع السعدین

مصنف کا نام کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی ہے۔ یہ شخص شاہرخ اور سلطان ابوسعید کے زمانے میں اہم سفارت خانوں پر بھیجا گیا اور اعلیٰ مناصب پر فائز رہا۔ مطلع السعدین ابوسعید مغول کے سال پیدائش ۷۰۴ھ/۱۳۰۴ء سے لے کر اسی کے ہمنام میرزا ابوسعید گورکانی کی وفات ۸۷۳ھ/۱۴۶۹ء تک ایک سو ستر سالہ دور کی تاریخ ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ دونوں ابوسعید سعد ستارے تھے اور ان کے ناموں پر اس نے کتاب کا نام رکھا۔ اس کی دوسری جلد کا پہلا حصہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کے مفید حواشی کے ساتھ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ زبدۃ التواریخ اس کتاب ماخذوں میں شامل ہے۔ قلمی نسخے بکثرت ملتے ہیں۔ یہ کتاب تہران سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی کی وفات ۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء میں ہوئی۔ کمال الدین نے اس کا ضمیمہ بھی لکھا، جس میں ۸۷۳ھ/ سے ۸۸۰ کے وقائع بھی آگئے ہیں۔

اس کا اسلوب سادہ و رواں ہے۔

ظفرنامہ یزدی

یہ دو جلدوں میں تیموری عہد کی مفصل تاریخ ہے۔ اس میں تیمور کی ولادت سے اس کی وفات ۸۰۷ تک کے واقعات آگئے ہیں۔ مصنف کا نام شرف الدین علی یزدی ہے۔ یہ کتاب اس نے ۸۲۸ھ میں شہزادہ ابراہیم سلطان بن شاہرخ بن تیمور کی فرمائش پر لکھی۔ یزدی نے ۸۵۸ھ میں وفات پائی۔ کتاب کا انداز بیان تکلف سے پر تکلف ہے۔ مطالب میں خوشامد جھلکتی ہے۔

ظفرنامہ شامی نظام الدین شامی کی تالیف ہے۔ یہ شخص تیمور کا معاصر تھا۔ ۸۰۴ھ/۱۴۰۱ء میں تیمور نے اسے ظفرنامہ لکھنے کی فرمائش کی۔ یہ کتاب تیمور کی زندگی ہی میں مکمل ہو گئی تھی۔ حافظ ابرو نے ۸۱۴ھ میں ظفرنامہ میں تیمور کی وفات تک کے واقعات کا اضافہ کیا۔ یہ کتاب پراگ سے ۱۹۳۷ء میں چیکوسلواکی مشرق فلیکس تاور کے اہتمام میں شائع ہو چکی ہے۔

روضۃ الصفا: تیموریوں کے عہد کی ایک اہم تاریخ ہے۔ یہ ضخیم تاریخ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد قبل از اسلام کے انبیا، بادشاہوں کے بارے میں ہے۔ دوسری جلد میں رسول اکرم صلعم خلفائے راشدین اور تیسری جلد میں ائمہ اطہار، بنو امیہ اور بنی عباس کی تاریخ بیان کی گئی ہے چوتھی جلد میں ایران کے مسلمان بادشاہوں اور پانچویں جلد میں منگول حکمرانوں کا ذکر ہے۔ چھٹی جلد تیمور اور اس کے جانشینوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ساتویں جلد میں ابوالغازی سلطان حسین م۱۵۰۶/۹۱۲ھ کے وقائع سلطنت بیان ہوئے ہیں

اس تاریخ کے مصنف کا نام محمد بن خاوند شاہ بلخی ہے۔ جو میر خواند کے نام سے مشہور تھا۔ یہ شخص ہرات میں میر علیشیر نوائی کی بارگاہ سے وابستہ تھا۔ میر خواند نے ۱۴۹۸/۹۰۳ھ میں ہرات ہی میں وفات پائی۔ یہ کتاب کی صرف چھ جلدیں ہی لکھ سکا تھا کہ موت نے آ لیا۔ ساتویں جلد اس کے بھانجے خواند میر نے مکمل کی۔ خواند میر نے ۹۰۵ھ میں خلاصۃ الاخبار کے نام سے روضۃ الصفا کی تلخیص بھی کی۔ روضۃ الصفا کا اسلوب منشیانہ اور پر تکلف ہے۔ یہ کتاب بمبئی اور تہران سے شائع ہو چکی ہے۔

روضات الجنات فی تاریخ مدینہ ہرات معین الدین محمد اسفزاری کی تالیف ہے۔ جو اس نے ابوالغازی سلطان حسین کے نام معنون کی ہے۔ یہ شہر ہرات کی تاریخ ہے اور اس میں ۱۴۷۰/۸۷۵ھ تک وقائع بیان ہوئے ہیں۔ یہ کتاب کلکتہ اور تہران سے شائع ہو چکی ہے

اسفزاری اگرچہ منشی اور دبیر تھا، لیکن اس کتاب کا اسلوب بیان نسبۃً سادہ اور رواں ہے۔ اشعار و اقوال کا استعمال کافی کیا گیا ہے۔

تذکرے

نفحات الانس من حضرات القدس مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی م ۸۹۸ھ کی یہ تالیف ۶۱۱ صوفیا کا تذکرہ ہے۔ نفحات ۱۴۷۶/۸۸۱ھ میں مکمل ہوئی۔ مقدمے میں تصوف اور اعمال صوفیا سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا انداز بیان تکلف و تصنع سے بالکل پاک ہے۔ نفحات، کلکتہ، لکھنؤ اور تہران سے شائع ہو چکی ہے۔

تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی م ۹۰۰/۱۴۹۴ء کی تالیف ہے۔ دولت شاہ نے پچاس برس کی عمر میں ۸۹۲/۱۴۸۷ء میں اسے مکمل کیا۔ کتاب کی تمہید میں فن شعرگوئی پر ایک مقالہ موجود ہے۔ یہ تذکرہ ۱۰۵ شعرا کے احوال و اشعار کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔ لیکن تاریخی لحاظ سے ایک ناقابل اعتبار دستاویز ہے۔ جس سے بڑے بڑے محقق گمراہ ہوئے ہیں۔ تذکرہ میر علی شیر نوائی کے نام معنون ہے۔ خاتمے میں نوائی ابوالغازی سلطان حسین اور مولانا جامی کا ذکر دولت شاہ نے انتہائی عقیدت و احترام سے کیا ہے تذکرہ اب تک براؤن اور استاد سعید نفیسی مرحوم کے اہتمام میں شائع ہو چکا ہے۔ استاد نفیسی مرحوم نے اس پر محققانہ حواشی تحریر فرمائے۔ اس کا جرمنی میں ترجمہ فان ہیمر نے کیا۔

مجالس النفائس ابوالغازی سلطان حسین کے علم دوست اور ادب پرور وزیر، امیر علی شیر نوائی کی ترکی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے فارسی میں دو ترجمے ملتے ہیں۔ ۹۲۰ھ میں ایک ترجمہ فخری ہراتی نے لطائف نامہ کے نام سے کیا اور دوسرا اسی زمانے میں حکیم شاہ محمد قزوینی نے کیا جو مجالس النفائس کے نام سے ہی مشہور ہے۔ دونوں ترجمے استاد علی اصغر حکمت کے فاضلانہ مقدمے و حواشی کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ اصل کتاب ایک مقدمہ اور آٹھ مجالس پر مشتمل تھی۔ لیکن فارسی مترجمین نے اپنے اپنے ترجموں میں ایک ایک مجلس کا اضافہ کیا ہے۔ ان مجالس میں شعرا، فضلا، سلاطین اور شاہزادگان کا تذکرہ ملتا ہے۔

مجالس العشاق یہ کتاب بقول ریو ۵۵ مقالات یا مجالس پر مشتمل ہے۔ ہر مجلس میں کسی بڑے صوفی یا سلطان کی زندگی اور اس کے عشق کا تذکرہ ہے۔ مقدمے میں عشق حقیقی و مجازی کی بحث ہے۔ صوفیانہ اشعار بھی عبارتوں میں ملتے ہیں۔ شخصیات کے حالات تاریخی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ کتاب امام جعفر صادق رض کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور آخر میں مولانا جامی کا تذکرہ ہے۔ مجالس العشاق ابوالغازی سلطان حسین کی تالیف بتائی جاتی ہے۔ مغل بادشاہ ظہیرالدین محمد بابر نے اس کتاب پر کڑی تنقید کی ہے اور اسے جھوٹ کی پوٹ قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں یہ کتاب دراصل میر علی شیر نوائی کی بارگاہ سے وابستہ ایک صوفی عالم کمال الدین حسین گازرگاہی کی تصنیف ہے۔ مجالس العشاق ۱۸۹۰ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

روضۃ الشہدا: مولانا کمال الدین حسین واعظ کاشفی م ۱۵۰۴/۹۱۰ھ کی تالیف ہے یہ کتاب انبیاء و ائمہ کرام خصوصاً حضرت امام حسینؑ کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب ۱۵۰۲/۹۰۸ھ کی تالیف ہے، اور تاریخی اعتبار سے کسی اہمیت کی حامل نہیں ہے، اسلوب بیان پر تکلف اور شیانہ ہے روضۃ الشہداء ۱۸۸۰ء میں لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔

رشحات عین الحیاۃ: حسین واعظ کاشفی کے بیٹے فخر الدین علی کی تالیف ہے۔ یہ شیخ عبیداللہ احرار کے اسلاف، ان کی تعلیمات و کرامات اور شاگردوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس کا سال تالیف ۱۵۰۴/۹۰۹ھ ہے۔

کتب دینی وعرفانی و فلسفی

مواہب علیہ: حسین واعظ کاشفی کی تفسیر قرآن ہے۔ جو انہوں نے میر علی شیر نوائی کے لئے ۱۴۹۴/۸۹۹ھ میں لکھی۔ یہ قرآن کے ابتدائی حصے یعنی سورہ فاتحہ سے سورہ نسا کی آیت ۸۴ تک کی تفسیر ہے۔ کلکتہ، بمبئی اور لکھنؤ سے کئی بار چھپ چکی ہے تہران سے سید محمد رضا جلالی کے نا ضلانہ مقدمے کے ساتھ ۱۳۲۹/۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔

جواہر الاسرار و زواہر الانوار: مثنوی مولانا روم کی شرح ہے، جسے کمال الدین حسین بن حسین خوارزمی م ۸۳۵ھ-۸۴۰ھ نے لکھا۔ یہ مثنوی کی مفصل شرح ہے، اور ہندوستان میں شائع ہو چکی ہے۔

لوائح: تصوف کے موضوع پر رباعیات سے آراستہ مولانا جامی م ۸۹۸ھ کی تصنیف ہے۔ تیس فصلوں پر مشتمل ہے۔ جامی نے فصل کی بجائے لائحہ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مولانا جامی جیسے فاضل صوفی ادیب اور شاعر کی کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ ورین فیلڈ نے مقدمہ و حواشی کے ساتھ فرانس سے شائع کیا اردو ترجمہ پروفیسر محمد عبدالرشید فاضل نے کراچی سے شائع کروایا۔

اشعۃ اللمعات: یہ کتاب بھی مولانا جامی کی تصنیف ہے، اور اس میں انہوں نے فخر الدین عراقی کی کتاب لمعات کی شرح کی ہے۔ یہ شرح ۸۸۵ھ میں مکمل ہوئی۔

اخلاق جلالی: کتاب کا اصل نام لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق ہے۔ لیکن اپنے مصنف علامہ جلال الدین دوانی کی نسبت سے اخلاق جلالی کے نام سے زیادہ مشہور ہوئی۔ علامہ دوانی کازرون کے علاقے دوان کے رہنے والے تھے، انہوں نے شیراز میں تعلیم پائی قاضی

اور مسلم ہے۔ آق قویونلو ترکمان آپ کی بے حد عزت کرتے تھے۔ علامہ کا انتقال ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء میں ہوا۔

اخلاق جلالی فارسی میں اپنے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔ دوانی نے اسے آق قویونلو ترکمان امیر حسن بہادر خاں کے نام معنون کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن کے عنوانات کے تحت تین حصوں میں منقسم ہے۔ تہذیب اخلاق کے موضوع پر لامع اول کتاب کا طویل ترین حصہ ہے۔ کتاب کی تصنیف کے وقت نصیر الدین طوسی کی کتاب علامہ دوانی کے پیش نظر رہی ہے۔ کیونکہ ان کی کتاب کا خاکہ بھی اخلاق ناصری سے ملتا ہے۔ علم اخلاق فلسفے کی ایک شاخ ہے اس لئے اس کتاب کا اسلوب فلسفیانہ موضوع کے باعث کہیں کہیں مشکل اور ادق نظر آتا ہے۔ عربی کے مشکل الفاظ علامہ نے بہت استعمال کئے ہیں۔ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے۔ اور صدیوں سے شامل نصاب چلی آ رہی ہے

اخلاق محسنی

اخلاق محسنی حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔ کتاب کے نام کے اعداد سے اس کا سال تصنیف ۹۰۰ھ/۱۴۹۴ء نکلتا ہے۔ یہ کتاب ایک دیباچہ اور چالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع بھی اخلاق ہے۔ مصنف نے اخلاقی مسائل کو دلچسپ حکایات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ دلچسپی کے باوجود اخلاق محسنی کا علمی پایہ اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی سے بہت پائین ہے۔ کتاب کا انداز بیان عالمانہ اور زبان مشکل ہے۔ اس کتاب کا چونتیسواں باب میر سید علی ہمدانی کی تصنیف ذخیرۃ الملوک کے ساتویں باب سے ماخوذ ہے

فتوت نامہ سلطانی

یہ بھی حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔ اس کا موضوع فتوت و جوانمردی ہے۔ کتاب ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر جعفر محجوب کے مقدمے کے ساتھ تہران سے شائع ہو چکی ہے۔

علوم ادبی

المعجم

کتاب کا پورا نام المعجم فی معاییر اشعار العجم ہے اور یہ شمس الدین محمد بن قیس رازی کی تصنیف ہے۔ شمس قیس رے کا رہنے والا تھا۔ لیکن ایک عرصہ خوارزم شاہیوں کے دربار سے وابستہ رہا۔ یہ سلطان علاؤ الدین خوارزم شاہ کے فتح و فرار میں اس کا ہمرکاب رہا۔ خوارزم شاہ جب مغلوں کے ڈر سے بھاگ نکلا تو شمس قیس نے فارس میں پناہ لی کیونکہ یہ خطہ مغلوں کی تاخت و تاراج سے محفوظ تھا۔ مصنف نے المعجم ۶۱۴ھ میں شروع کی۔ لیکن اپنی پریشان حالی کی وجہ سے اسے ۶۳۰ھ سے پہلے مکمل نہ کر سکا۔ کہتے ہیں کہ اصل کتاب

[illegible] میں شمس فخری [illegible] کتاب [illegible] میں منظوم [illegible] [illegible] ۷۴۵ھ [illegible] اور لغت شعر کے [illegible] [illegible] کتاب [illegible] [illegible] کتاب [illegible]

ہے۔ [illegible] کتاب [illegible] اشعار [illegible] ہے۔

[illegible] کے [illegible] خوبصورت [illegible] ہو جاتا ہے۔ یہ نسخہ [illegible] قزوینی کے تصحیح شدہ نسخے پر مبنی ہے۔

معیار الاشعار — عروض پر یہ رسالہ خواجہ نصیر الدین طوسی م ۶۷۲ھ کی تصنیف ہے۔ [illegible] شرح مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی (م ۱۲۹۴ھ) [illegible] میزان الافکار [illegible] ہے۔

بعض محققین نے [illegible] کے ساتھ اس کے انتساب کو درست تسلیم نہیں کیا ہے [illegible] خواجہ طوسی کی فہرست کتب میں [illegible] رسالہ کا ذکر [illegible] [illegible] دولت نے دیوان [illegible] کی شرح [illegible] نے تجربۃ الشعراء [illegible] میں معیار الاشعار کو خواجہ طوسی کی تصنیف قرار دیا ہے۔

شمس فخری کی حسب ذیل تالیفات بھی علوم ادبی میں قابل ذکر ہیں۔

(۱) معیار نصرتی — در علم عروض و قوافی — سال تالیف [illegible]ھ

(۲) میزان المعجم / مجمع الصنائع — عروض و بدیع کے ایک مخطوطہ پر ایک مستقل [illegible] — سال تالیف [illegible]ھ

(۳) معیار جمالی / (۴) مفتاح ابو اسحٰقی — عروض، قافیہ، بدیع اور لغت پر — سال تالیف [illegible]ھ

صفوی عہد

خاندان صفویہ کی نسبت شیخ صفی الدین اردبیلی (م [illegible]) سے ہے۔ اس سلسلے کا بانی شاہ اسماعیل اول (م [illegible]) ان کی چھٹی پشت میں تھا۔ اس عہد کے سلاطین نے تقریباً سوا دو سو سال ([illegible]) حکومت کی ہے۔

مذہب سے زورِ سیاست صفوی خاندان، مریدوں کے زور پر برسرِ اقتدار آیا۔

وہ قزلباش "در سرخ ٹوپیاں پہننے والے" جانباز صوفیہ کا ایک بڑا جتھا تھا۔ جو ان مذہبیان سیاست پر جان چھڑکتے تھے۔ انہوں نے ایرانی حکام سے جنگ کی اور انہیں شکست دی اور اس طرح شاہ اسماعیل برسرِ اقتدار آیا۔ شاہ نے شیعہ مذہب سے متعصبانہ وابستگی ظاہر کی، اور سنیوں پر بے پناہ مظالم شروع کئے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ مذہب کی وحدت سے ایرانی قومیت کو قوت ملے گی۔ سنی صوفیہ اور علما کا با اثر طبقہ سدِ راہ بنا۔ اور ظلم و ستم کا نشانہ بنا۔ ان حالات میں ترک عثمانی سلطانوں نے سنیوں کی حمایت میں ایران سے جنگ کرنے کی ٹھان لی۔ سلطان سلیم نے شاہ اسماعیل سے کئی جنگیں کیں۔ مگر آخر کار مؤخرالذکر کا پلہ بھاری رہا۔ شاہ اسماعیل شیعہ مذہب کی بنیاد پر ایران میں ایک وطن پرست قوت وجود میں لے آیا جو صدیوں تک متعصب رہی۔ شیعیت اگرچہ اب بھی ایران کا سرکاری مذہب ہے۔ مگر تعصب کے وہ بادل دھیرے دھیرے کافور ہو چکے ہیں۔

تعین دارالحکومت صفوی بادشاہوں نے تبریز کو دارالحکومت بنایا۔ کچھ عرصے کے لئے قزوین کو مرکزیت حاصل رہی۔ اور آخرکار نظرِ انتخاب اصفہان پر پڑی۔ اصفہان نے اس عہد میں بے حد ترقی اور وسعت حاصل کی۔ اب بھی جہاں صفوی عہد کی عظیم مساجد اور دیگر عمارات دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس عہد میں اصفہان کو "نصف جہاں" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

شاہنشاہ ہمایوں کی آمد شاہ اسماعیل اوّل کے جانشین، شاہ طہماسپ کے عہدِ حکومت ۱۵۲۴ء - ۱۵۷۶ء میں ہندوستان کا جلاوطن شاہنشاہ، نصیر الدین ہمایوں ایران آیا۔ اور تقریباً پندرہ برس تک وہیں رہا۔ وہ شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران میں پناہ گیر رہا۔ اور شاہ طہماسپ کی بھیجی ہوئی فوجوں کی مدد سے اس نے دہلی کا تخت و تاج دوبارہ حاصل کیا۔ ہمایوں کے ساتھ کئی ایرانی برصغیر میں وارد ہوئے، اور بعض نے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ یہ امر یہاں مذہب شیعہ کی ترویج اور عہد میں ایرانی علماء و شعرا کی ہجرت کا موجب بنا۔ مؤرخین ایران اور برصغیر کے روابط کے سلسلے میں ہمایوں کے ایران میں طویل قیام کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

عہدِ انحطاط؟ ایک ضمنی بحث

صفوی عہد کو عام طور پر ادب و شعر کے انحطاط کا دور کہا جاتا ہے، حالانکہ ایسے بیان میں جزوی صداقت نظر آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس خاندان کے سلاطین اپنی شان میں قصیدے لکھوانا پسند نہ کرتے تھے۔ اور شعرا کو شہدائے کربلاؑ کے مناقب لکھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ انہوں نے ایک خاص مذہبی وحدت کا ماحول پیدا کیا اور اپنی زیادہ توجہ سیاسی استحکام، استحکام مذہب کی تشہیر اور مساجد و عمارات کی تعمیر پر مبذول رکھی، اس کے باوجود اس عہد میں شعر و ادب اور علوم مذہبی و فنون نے اپنا سیر تکامل جاری رکھا۔ تغزل و قصیدہ کے دلدادہ شعراء کی اکثریت نے البتہ برصغیر کی راہ لی، اس عہد کے ایرانی شعرا میں بعض بڑے ممتاز اور قادر کلام تھے۔ انہوں نے غزل و قصیدہ لکھنے کی روش کو اپنائے رکھا۔ دوسرے شعرا نے مراثی اور مذہبیات کو موضوع گفتگو بنایا۔ محتشم کاشانی کے مراثی فارسی ادب کا قابل قدر سرمایہ ہیں۔ بہر طور اس دور میں شعر و ادب کا اسلوب بدلا اور مقاصد تحریر میں فرق پڑ گیا۔ مگر اس دور کو علم و ادب کے انحطاط کا عہد قرار دینا باصواب نہیں۔ اس عہد کے شعر و ادب اور علم و فن کے بارے میں ہمارا پیش کیا ہوا خاکہ صداقت واقعی کو نمایاں کر دے گا۔

شعراء — تیموری عہد کے بعض نامور شعرا صفوی عہد کے اوائل میں بھی زندہ تھے۔ اس عہد کے چند شعراء مندرجہ ذیل ہیں۔

بابا فغانی شیرازی (۹۲۵ھ/۱۵۱۹ء) — بابا فغانی نے زندگی کے ایام ہرات تبریز اور شیراز میں بسر کئے۔ آپ ایک خاص انداز شعر کے بانی مانے جاتے ہیں۔ معاصرین (جیسے مولانا جامی) نے انداز فغانی کو قابل توجہ نہ مانا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ انداز ہمہ گیر ہو گیا۔ والہ داغستانی نے تذکرہ ریاض الشعراء، مرزا غالب نے اپنے کئی خطوط اور شبلی نعمانی نے شعر العجم میں فغانی کی سادگی، دلآویزی، ندرت بیان۔ اور ان کی استعمال کردہ تشبیہات و استعارات کے بارے میں کافی توصیف کی ہے۔ عطیہ بیگم مرحومہ نے اپنی کتاب 'اقبال' میں واضح کیا ہے کہ علامہ اقبال، فغانی کے انداز کے بے حد دلدادہ تھے۔ معاصر ایرانی فضلا نے اب فغانی کا لوہا ماننا شروع کیا ہے۔ ان کا دیوان ایک بار لاہور میں اور دو بار تہران میں چھپ چکا ہے۔ دسویں اور گیارہویں صدی ہجری کے اکثر نامور شعرا مثلاً وحشی بافقی عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، طالب آملی، کلیم کاشانی، صائب اور جویا تبریزی وغیرہ بابا فغانی کے مقلد رہے ہیں۔

بابا فغانی کے مفصل حالات نامعلوم ہیں۔ ان کا اصلی نام بھی مرقوم نہیں البتہ اتنا معلوم ہے

کہ شاعر کی زندگی بالعموم تلخ رہی اور وہ بادہ و جام کے شغل سے غم غلط کرتا رہا ہے۔ تبریز میں صفویہ کے پیشرو حکام آذربائیجان نے اس کی قدردانی کی۔ آخری عمر میں شاعر مشہد آیا۔ وہاں اسے توبہ کی سعادت ملی۔ اور تقویٰ و ورع کی زندگی بسر کرنے لگا۔ شاعر کی ازدواجی زندگی کے بارے میں ہمیں علم نہیں۔ اس کا مدفن شیراز میں ہے۔

خیالی فارسی کا صفِ اول کا شاعر ہے۔ اس کی رباعیات، نظمیں اور قصائد لائق توجہ ہیں مگر اس کی غزل اہم تر ہے۔ ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

ز خیالِ غنچہ سبِ دم ہمہ دم بگل کنم نظارہ — کہ مرا دلی فگار و جگری است پارہ پارہ
بجفا اگر در دلِ من رقم وفا نگنجد — تو بیا کہ من ز غیرت کنم از میان کنارہ
بجراحت دلِ من کہ نمک زدی خندہ کن — کہ مبادا ز آتشِ آن بفلک رسد شرارہ
تو گذشت باغ دلہا بکرشمہ تو حیران — چہ رود بجان مردم کہ تو جان زدی سوارہ
ہمہ برگِ ناامیدی ز بہار عمر چیدم — کہ بکامِ من نگردد فلک ستیزہ کارہ
ز رشک خیالی دلِ کوہ رخنہ گردد — نفسِ نیاز مندان گذرد ز سنگِ خارہ

ہاتفی خرجردی خراسانی (م ۹۲۷ھ/۱۵۲۱ء)

نام عبداللہ تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے بھانجے تھے اور در قول ان سے استفادہ کیا ہے۔ ہاتفی نے نظامی گنجوی کے مشہور خمسہ کی تقلید میں لیلیٰ و مجنوں، شیریں خسرو، ہفت منظر، سکندر نامہ اور تیمور نامہ کے عنوان سے مثنویاں لکھیں اور خوب زورِ بیان دکھایا۔ تیمور نامہ یا ظفر نامہ میں تیمور لنگ کی فتوحات کو تاریخاً نظم کیا گیا ہے۔ اس نے شاہ اسمٰعیل صفوی کی فتوحات کے بارے میں شاہنامہ حضرت اسمٰعیل لکھنا شروع کیا تھا مگر وہ ناتمام رہا۔ ایک مختصر مثنوی فتوحات نامہ جوانمردوں کے اوصاف پر مشتمل، ہاتفی سے منسوب ہے۔ مگر اسے بظاہر نویں یا دسویں صدی ہجری کے کسی شاعر عطار نے لکھا ہے۔ ہاتفی کا مختصر دیوان غزلیات، کتب خانہ مرکزی دانشگاہ تہران میں موجود ہے۔ برٹش میوزیم کے مخطوطے کا عکس (اس کے ایک ساقی نامہ کے چند اشعار بھی ملتے ہیں۔ ملا عبدالنبی قزوینی کے 'میخانہ' سے ہم اسی صنف کا نمونہ نقل کرتے ہیں۔

بنام خدائی کہ فکر و خرد — نیارد کہ یابند ادای حمد
بساط زمین و بسیط فلک — بر آراست از آدمی و ملک
نی از عشق او در غم افسردہ جوش — ز جیبہ بر آوردہ صوفی خروش

گل دیر و مسجد باہم ساختہ   کلیسا و محراب پرداختہ
مؤذن فرست مناجاتیان   مغنی رسان خراباتیان

امیدی تہرانی رازی م ۹۲۹ھ/۱۵۲۳ء

مولانا ارجاسپ امیدی کم گو شاعر تھے۔ ان کے تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار ملتے ہیں۔ ان اشعار میں غزلیات ساقی نامہ اور قطعات شامل ہیں۔ ان کا کلام منتخب اور ہموار ہے۔

امیدی نے رے (تہران) میں زندگی گزاری۔ سفر کے دوران کاشان، اصفہان اور ہرات گئے ہیں۔ اصفہان والوں کی کسی بدسلوکی کی بنا پر امیدی نے ان کی ہجو لکھی ہے علامہ جلال الدین صدیقی دوانی، امیدی کے استاد تھے۔ تہران کے نواح میں امیدی اور شیخ قوام الدین نوربخشی کا ایک قطعہ زمین کے بارے میں نزاع تھا۔ اس نزاع پر شیخ مذکور کے کسی انتہا پسند شاگرد نے امیدی کو قتل کر دیا۔ امیدی کے ایک شاگرد نے لکھا ہے۔

نادرِ عصر، امیدی مظلوم   کہ بناحق شہید شد ناگاہ

یہاں ہم اس کی ایک غزل کے اشعار کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

ای جنگجو بقلب سپاہ کہ می زنی   دامان ناز برزدہ راہ کہ می زنی
چشم سیہ کردہ ای از بادہ لالگون   آتش بجان و مان سیاہ کہ می زنی
مستی و می زدی پی آزار خلق، آہ   خود را دگر بہ آتش آہ کہ می زنی
زلفت کمند افگن و چشمت کمین گشای   با لشکری چنین بسپاہ کہ می زنی
سلطان حسن اوست امیدی ز دست او   زانوی داد بر سر راہ کہ می زنی

اہلی ترشیزی م ۹۳۴ھ/

آپ سلطان حسین بایقرا اور امیر علی شیر نوائی کے درباروں سے وابستہ رہے۔ قصیدہ اور غزل اچھا کہتے تھے آپ کے اشعار میں جدت اور ندرت پائی جاتی ہے۔

ہلالی چغتائی استر آبادی م ۹۳۶ھ/۱۵۲۹ء

ابتدائی عمر استر آباد گرگان میں بسر کی پھر خراسان گئے۔ وہاں سلطان ابوالغازی حسین بایقرا اور امیر نوائی کی بخشش سے بہرہ مند رہے۔ اس کے بعد آپ نے عبداللہ خان کے دربار سے وابستگی اختیار کی۔ وہیں مخالفوں کی رنجیدہ دوانیوں یا شیعہ ہونے کے جرم میں قتل ہوئے۔ آپ کا نام بدرالدین تھا۔

ہلالی زور دار شاعر تھا۔ دو مثنویاں شاہ و درویش اور صفات العاشقین اور اوسط درجے کا ایک دیوان آپ کی یادگار ہیں۔ دیوان کو استاد سعید نفیسی مرحوم نے طبع کر دیا ہے۔

ہلالی کی ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو۔ یہ غزل فغانی کے رنگ میں ہے۔

بکجا روم ز دست چه دوا کنم چه چاره — که هزار پاره خون شد جگر هزار پاره
منم و ز عشق دردی اگر بگویم، گویم — بخدا که نرم گردد دل سخت سنگ خاره
بدو دیده گر توانم که رخ تو سیر بینم — دو هزار دیده خواهم که ترا کنم نظاره
بر من ز هیچ خوبان بکسی ترا چه نسبت؟ — تو زیاده ای ز ماه دگران کم از ستاره
ز برای کشتن من چو بس است چشم شوخت — ز چه رو کشد خنجر مژه ها ز هر کناره
دل خسته هلالی چو بسوختی حذر کن — که مبادا آتش او برسد بتو شراره

اہلی شیرازی (م ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء)

اہلی غزل قصیدہ اور رباعی کے استاد تھے۔ سحر حلال اور شمع و پروانہ کے نام سے آپ کی دو مثنویاں دستیاب ہیں۔ پہلی مثنوی چھپ چکی ہے۔ رباعیات کے مجموعے کو آپ نے "ساقی نامہ" کا نام دیا ہے۔ اہلی کو اپنے کلام کی صوری و معنوی آرائش کا بے حد خیال رہتا تھا۔ آپ کے مجموعہ کلام کے کئی مخطوطے موجود ہیں۔ ایک دلپذیر مخطوطہ پشاور کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ آپ کی رباعیات نقل کی جاتی ہیں۔

منعم همه کسب مال و زر می داند — زاهد همه اوراد و سحر می داند
عارف همه معرفت آموخته است — خوش بخت کسی که این هنرها داند

عمرم که بگفت و گو درین خانه گذشت — یک چند بوصف چشم مستانه گذشت
یک چند بذکر جام و پیمانه گذشت — القصه شب عمر بافسانه گذشت

فضولی تبریزی بغدادی (م ۹۷۰/ ۱۵۶۲ء)

زیادہ اشعار ترکی زبان میں ہے۔ مگر فارسی اور عربی میں بھی کافی کلام موجود ہے۔ فضولی مدتوں تبریز میں رہے۔ اس کے بعد استنبول گئے ترکی زبان میں آپ نے زور دار "شہر انگیز" لکھے جو "شہر آشوب" کی ایک قسم ہے۔ "شہر آشوب" میں کسی ملک یا شہر اور وہاں کے پیشہ وروں نیز عام باشندوں کے عام حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ آخری عمر میں فضولی بغداد منتقل ہو گئے تھے۔ حدیقۃ السعداء، فضولی کی مذہبی تالیف

ہے۔ جس میں اہلبیتؑ رسولؐ کے مناقب و اوصاف درج ہیں۔ فضولی کی روس آذربائیجان میں بڑی قدر کی جاتی ہے۔ وہاں اس کی زندگی افکار اور شاعری کے بارے میں سیمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

وحشی بافقی یزدی (م ۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ء) کمال الدین آپ کا نام یا لقب تھا۔ زندگی کے ایام بافق اور یزد میں بسر کئے۔ قصائد لکھے مگر وہ دلنواز نہیں۔ مثنوی اور غزل میں آپ نے بڑا مقام پایا ہے۔ آپ کی مثنوی خلد برین بے حد دلآویز ہے۔ اور چھپ چکی ہے۔ فرہاد و شیریں نامی مثنوی کو وحشی نے ناتمام چھوڑا۔ اور مدتوں بعد وصال شیرازی (قاچاری عہد کے شاعر) نے اسے مکمل کیا۔ وحشی نے اپنے مخالفین کی بے حد عریاں ہجویں بھی لکھی ہیں۔ شاعر، شراب و شاہد کا دلدادہ بتایا جاتا ہے۔ اور بظاہر کثرت مے نوشی سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ وحشی کا دیوان بارہا چھپ چکا ہے۔

وحشی اور واسوخت واسوخت، شاعری میں غزل کی ضد واقع ہوا ہے۔ اشعار واسوخت، میں محبوب سے اظہار بیزاری کیا جاتا ہے۔ اردو ادب کے اکثر مورخ، اس صنف شاعری کا موجد وحشی کو قرار دیتے ہیں جب کہ بعض نے فغانی کا نام بھی لیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وحشی کے دیوان میں کئی واسوخت نما غزلیات موجود ہیں۔ (فغانی کے ہاں واسوخت کی مثالیں نادر و شاذ ہیں) مگر وہ اس موضوع سخن کا بانی ہرگز نہیں۔ چھٹی صدی ہجری سے اب تک متعدد ایرانی شعرا نے واسوخت لکھے ہیں۔ اس کے باوجود وحشی کے سوز و گداز کے حامل واسوخت، قدیم شعرا کے ہاں زیادہ نہیں ملتے غالباً اسی خاطر اردو کے واسوخت گو شعرا نے اس دل جلے عاشق شاعر کو اپنا پیشرو مانا ہے۔ یہاں ہم نمونے کی خاطر ایک واسوخت نما غزل کے چند اشعار پیش کر رہے ہیں۔

روم بجای دگر، دل دہم بیار دگر — ہوای یار دگر دارم و دیار دگر
بدیگری دہم این دل کہ خوار کردۂ تست — چرا کہ عاشق تو دارد اعتبار دگر
میان ما و تو، ناز و نیاز برطرف است — بخود تو نیز بدہ بعد ازین قرار دگر
خبر دہید بصیاد ما کہ ما رفتیم — بفکر صید دگر باشد و شکار دگر
خموش وحشی از انکار عشق او کاین حرف — حکایتی است کہ گفتی ہزار بار دگر

محمود قاری یزدی (م ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء) اسے "شاعر البسہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ محمود نے ایران قدیم

کے مختلف علاقوں کے لوگوں کے لباس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اور انہیں زبان شعر میں بیان کیا ہے۔ شاعر کی جزئیات بیانی سادگی اور دلآویزی قابل داد ہے۔ محمود کی شاعری سے لباس و تمدن ایران کے بارے میں سود مند معلومات ملتی ہیں۔

محتشم کاشانی رم ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء شمس الشعرا مولانا محتشم، شاہ طہماسپ صفوی کے دربار سے وابستہ تھے۔ قصیدے اور غزلیں کہی ہیں۔ مگر ان کا اصل میدان مرثیہ اور اہل بیتؑ کے مناقب لکھنا ہے۔ آپ نے حضرت امام حسینؑ اور دیگر شہدائے کربلاؓ کے واقعات شہادت کو بڑے خلوص اور درد و سوز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے مراثی میں اردو کے نامور مراثی نویس انیس و دبیر کی مانند واقعات شہادت کی جزئیات ملتی ہیں۔ اور عزائے محرم میں خاص و عام افراد انہیں پڑھتے اور سنتے ہیں۔ محتشم کا دیوان چھپ چکا۔ یہاں ہم ان کے ایک معروف مرثیے کی تمہید کے چند اشعار درج کرتے ہیں۔

باز این چہ شورش است کہ در خلق عالمست ‏ ‏ باز این چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتمست

باز این چہ رستخیز عظیم است کز زمین ‏ ‏ بی نفخ صور خاستہ تا عرش اعظمست

گویا طلوع می کند از مغرب آفتاب ‏ ‏ کآشوب در تمامی ذرات عالمست

گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست ‏ ‏ این رستخیز عام کہ نامش محرمست

سحابی استر آبادی نجفی رم ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء مولانا ابوسعید سحابی غزل اور رباعی کے شاعر تھے۔ وہ صوفی مشرب، درویش اور خانہ نشین تھے۔ ان کی ولادت استر آباد (گرگان) میں ہوئی مگر مدتوں نجف اشرف میں حضرت علیؓ کے روضے کی جاروب کشی کی۔ اس لئے "استر آبادی نجفی" کہلائے۔ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنا دیوان دریا برد کر دیا تھا۔ کیونکہ اس اثاثے کو وہ اپنی روحانی ترقی میں حارج سمجھتے تھے۔ اب بھی ان کی کوئی آٹھ ہزار رباعیات اور چند غزلیات و قطعات دستیاب ہیں۔

مولانا سحابی کی رباعیات میں فلسفہ، تصوف اور علم کلام کے مسائل بڑی عمدہ زبان میں بیان ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال کی نظر میں (دیکھئے مقالات اقبال) ان کی رباعیات کا مرتبہ الحکیم عمر خیام کی معروف رباعیوں سے کمتر نہیں۔ صائب تبریزی اپنی غزل گوئی کی شاعرانہ تعلی کرتے ہوئے، سحابی کی رباعیات کا اس طرح ذکر کرتا ہے۔

غزل گوئی بہ صائب ختم شد از نکتہ پردازان
رباعی گو مسلم شد ز موزونان سحابی را

جذبۂ محبت کی عالمگیریت کے موضوع پر سحابی کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

عالم ہمہ دوست و طبیبی دارد — یعنی کہ محبت حبیبی دارد
کس نیست کہ از عشق دردمندی نیست — ہر ذرہ ز خورشید نصیبی دارد

زلالی خوانساری مولانا حکیم زلالی خوانساری کی تاریخ وفات ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵م یا ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱م بتائی جاتی ہے۔ آپ شاہ عباس اول (کبیر) صفوی کے دربار کے ملک الشعراء تھے۔ میر داماد آپ کے مرشد تھے اور مولانا نے ان کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں۔ آپ کی شہرت کا دار و مدار "سبع سیارہ" یعنی آپ کی سات مثنویوں پر ہے۔ ان مثنویوں کے نام محمود و ایاز، شعلہ دیدار، ذرہ و مشعلہ، حسن گلو سوز، ذرہ و خورشید، میخانہ اور سلیمان نامہ ہیں۔ پہلی مثنوی (محمود و ایاز) مدتوں سے اشاعت پذیر رہی ہے۔ ان کے دلآویز اسلوب کو دو چیونٹوں کے مکالمے میں ملاحظہ کریں۔

بہ موری گفت عنم نادیدہ موری — کہ مفزم کہ بجوش آورد ہی شوری
بیا تا سوی جنت آریم آہنگ — کہ دل تنگ است و دیدہ تنگ و جا تنگ
جوابش داد مور دل شکستہ — بہ دل تنگی میان را تنگ بستہ
کہ ای دست طراز سینہ تنگ — ہو س پخت هوای جنت و فرہنگ
نخوان افسون صحرا محملم را — کہ دست تنگ دارد و دلم را

شفائی اصفہانی (م ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۸م) نام شرف الدین حسن تھا۔ اور پیشہ حکمت (طبابت)۔ شاہ عباس اول (کبیر) کے دربار سے منسلک تھے۔ آپ مزاح و ظرافت اور ہزل گوئی میں مشہور تھے۔ "دیکدان حقیقت" کے نام سے آپ کی مثنوی موجود ہے۔

اسیر اصفہانی (م ۱۰۴۹ھ/۱۶۵۸م) میرزا سید جلال اسیر اصفہانی، میرزا صائب کے دوست تھے۔ آپ کے اشعار پیچیدہ مطالب اور نازک خیالی کے حامل ہیں۔ اور یہ انداز "اصفہانی" یا "ہندی"

کہلاتا ہے۔ فارسی کے مشہور تذکروں مثلاً ریاض الشعراء، صحف ابراہیم، اور مخزن الغرائب میں اسیر کو نازک خیال اور دقت بیان کے بانیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اسیر کی غزلیات میں بلند خیالی عام ہے۔ آپ کے قصائد بیشتر مذہبی مناقب کے حامل ہیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

بس کہ با حیرت بر آوردیم کام خویش را ۔۔۔ بر جبین ما نوشته عشق نام خویش را
هیچ کس نامہ بس بود از رشک قاصد سوختم ۔۔۔ هم نوشتم نامہ، هم بردم پیام خویش را
داشتم رنگین بہار زخم ها از اشک وآه ۔۔۔ در گل و سنبل گرفتم صبح و شام خویش را
خاطر صیاد چون شد جمع از صید اسیر ۔۔۔ کرد رشک گلستان خیش دام خویش را

طاہر قزوینی (م ۱۱۲۰ھ/ ۱۷۰۹ء)

قزوینی، شاہ سلیمان صفوی کے دو وزیروں مرزا تقی خان اعتماد الدولہ اور خلیفہ سلطان محمد طاہر وحید کا معتمد رہا۔ بعد میں زندگی کے کوئی ۱۰ سال اس نے بحیثیت وزیر کے گزارے جس کے بعد اس نے تجرد، اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ طاہر کی شاعری بالعموم پھیکی اور بے کیف ہے۔ شاعر پرگو تھا اور اس نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کا دیوان ۲ سال قبل ڈاکٹر سید حسن سادات ناصری کے مقدمہ کے ساتھ تہران سے شائع ہو چکا ہے۔

مذہبی علوم پر کتابیں

اس عہد میں مجلس علماء نے شیعہ مذہب اور عقائد پر مبنی کافی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابوں کی عبارت مشکل اور عربی آمیز ہے۔ ان کتابوں میں شیخ الاسلام شیخ محمد بہاؤ الدین عاملی یعنی شیخ بہائی (م ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء) کی "جامع عباسی" میر محمد باقر داماد استر آبادی (م ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۱ء) کی صراط مستقیم، ملا محمد محسن فیض کاشانی (م ۱۰۹۱ھ/ ۱۶۸۰ء) کی اصول المعارف اور ملا محمد باقر مجلسی (م ۱۱۱۱ھ/ ۱۷۰۰ء) کی تصانیف ہیں — بحار الانوار (۲۴ جلدیں)، حق الیقین، عین الحیات، مشکوٰۃ الانوار، اور حیات القلوب قابل ذکر ہیں۔ ان سب کے اسلوب میں ادنیٰ فرق ہے۔ اس خاطر انہیں یکجا لکھا گیا ہے۔

حکمت و فلسفہ

اس عہد کی مذہبی علوم کی کتابیں حکمت و فلسفہ کی بحثوں سے پُر ہیں۔ صدر الدین شیرازی معروف بہ ملا صدرا (م ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۱ء)

اس عہد کے نامور فلسفی تھے۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے اپنے پیشرو فلاسفہ و حکماء کی کتب سامنے رکھیں، مگر ان کے افکار و نتائج بحث، مجتہدانہ ہیں۔ آج تک ایرانی فلسفہ داں، ملا صدرا، کے فلسفے کی تفہیم کی خاطر کوشاں ہیں۔ ملا موصوف نے زیادہ کتابیں عربی میں لکھیں۔ صرف ایک "رسالہ سہ اصل" فارسی میں لکھا جو چھپ چکا۔ پروفیسر ڈاکٹر سید حسین نصر اور پروفیسر ہنری کاربن (فرانسیسی) نے ملا صدرا پر کافی کتابیں لکھی ہیں۔ میر ابو القاسم فندرسکی اس عہد کے ایک اور فلسفی تھے۔ ان کا اور ملا صدرا کا سال وفات ایک ہی ہے۔

ادب و انشاء

کتاب کشکول میں شیخ بہائی نے عربی اور فارسی کی امثال (ضرب الامثال) جمع کی ہیں۔ "انشائے طاہر" میں میرزا طاہر وحید کے وہ خطوط ملتے ہیں جو اس نے اپنی وزارت کے دوران لکھے۔ ان کی زبان ادق اور پیچیدہ ہے۔ اس عہد کی سرکاری مراسلت ماہنامہ "وحید" تہران میں کافی چھپی۔ اور یہاں بھی اسلوب مشکل ہی نظر آتا ہے۔

تاریخ و تذکرہ

اس عہد کے مندرجہ ذیل تاریخ و تذکرے قابل ذکر ہیں۔

تاریخ عالم آرائے عباسی

سنہ ۱۰۳۸ھ / ۱۶۲۹ء میں شاہ عباس اول کے دربار کے منشی اسکندر نے لکھا۔ اس کتاب میں از شیخ صفی الدین اردبیلی، شاہ عباس اول کے آبا و اجداد اور شاہ موصوف کے عہد کے واقعات تاریخی ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں۔

کتاب کی زبان پر تکلف ہے۔

غیاث الدین خواندمیر (م ۹۴۱ھ / ۱۵۳۵ء) کی کتابیں

خواندمیر کی پہلی اہم تاریخ، حبیب السیر ہے۔ پورا نام "حبیب السیر فی اخبار افراد البشر" ہے۔ کتاب ابتدائے آفرینش سے لے کر شاہ اسمٰعیل صفوی کے عہد کے اہم واقعات پر مشتمل اور تین جلدوں میں ہے کتاب ۹۲۹ھ میں لکھی گئی۔ زبان سادہ اور اسلوب دلپذیر ہے۔ خلاصۃ الاخبار میں مصنف نے روضۃ الصفا کے مطالب کی تلخیص پیش کی اور روضۃ الصفا کی ساتویں جلد کا اضافہ کیا۔ مکارم اخلاق اور دستور الوزرا مصنف کی نیم تاریخی کتابیں ہیں۔ وہ آخری عمر میں برصغیر کو سدھارا، اور

دہلی میں فوت ہو کر دفن ہوا ہے۔

تحفۂ سامی اس کتاب کو شاہ اسمٰعیل کے بیٹے سام میرزا نے ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۰ء کے لگ بھگ لکھا کتاب میں کوئی سات سو شعرا کا تذکرہ ہے۔ اکثر شعرا معاصر تھے۔ نمونۂ کلام عمدہ انتخاب کا مظہر ہے۔ تذکرے کی زبان سادہ ہے۔ مصنف ۹۸۴ھ/۱۵۷۶ء میں قتل ہوا۔

تذکرۂ نصرآبادی محمد طاہر نصرآبادی اصفہانی نے اس تذکرۃ الشعرا کو ۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۳ء میں مکمل کیا۔ تذکرۃ الشعرا آپ کی دوسری کتاب ہے۔ جس میں معاصرین کے حالات مندرج ہیں۔ آپ کی زبان عربی آمیز ہے۔

صفوۃ الصفا مصنف کا نام شیخ توکل معروف بہ ابن بزاز وہ ہے۔ اس کتاب میں شیخ صفی الدین اردبیلی اور ان کے مرشد شیخ زاہد گیلانی کے حالات درج ملتے ہیں۔ کتاب کا ایک مقدمہ ہے۔ اور بارہ ابواب۔ ابواب کو فصول میں تقسیم کر کے مختلف صوفیانہ مطالب لکھے گئے۔ اور آیات قرآنی سے ان مطالب کا استنباد کیا گیا ہے انداز بیان میں تکرار اور زبان میں عربیت موجود ہے۔

تذکرہ ہفت اقلیم مصنف امین احمد رازی ہیں۔ کتاب میں جغرافیا اور تذکرہ پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ مصنف کا والد خواجہ میرزا احمد، شاہ طہماسپ کی طرف سے علاقہ رے کا کوتوال تھا۔ قدیم جغرافیہ نویس۔ دنیا کو سات اقلیموں میں تقسیم کرتے تھے! امین احمد رازی نے یہی کیا۔ اس کے بعد ہر اقلیم کے اہم افراد، شعرا و ادبا اور ارکان سلطنت کے بارے میں اپنی معلومات ۳ جلدوں میں پیش کی ہیں۔ زبان سادہ ہے۔ مصنف نے ایرانی شخصیتوں کے بارے میں خاص طور پر دلچسپ معلومات جمع کی ہیں۔ یہ کتاب ۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۳ء میں لکھی گئی۔ اور برصغیر نیز ایران میں چھپ چکی ہے۔

زودگذر افشاری عہد

نادر شاہی، یا افشاری عہد تاریخ ادب فارسی کے لحاظ سے چنداں اہم نہیں ہے۔

اس سلسلے کا بانی نادر قلی افشار تھا۔ جو نادر شاہ افشار کے نام سے معروف ہوا۔ اس نے صفویوں کے دور انحطاط میں ملک کو غنیموں کے تصرف سے نجات دلائی۔ غیر معمولی فتوحات کیں، مذہبی مناظرت

کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اور ایران کا رعب و داب بحال کیا۔ اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ناگزیر ہے۔

بارہویں صدی ہجری کے اوائل سے صفوی سلطنت کمزور ہونے لگی تھی۔ ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء میں محمود افغان نے حملہ کر کے پایۂ تخت اصفہان پر قبضہ کر لیا۔ نادر قلی صفوی سلاطین کی فوج میں شامل ہوا تھا۔ مذکورہ واقعہ کے وقت وہ ایک افسر کے عہدہ پر فائز تھا۔ اسے شاہ حسین صفوی کا افغان حملہ آور کے آگے سر تسلیم خم کر دینا، بے حد ناگوار گزرا۔ نادر قلی نے از خود وطن کی آزادی کے لئے لوگوں سے جاں نثاری کا عہد لیا۔ اس دوران قزوین میں شہزادہ طہماسپ صفوی ثانی، محمود افغان کو بھگانے کے عہد کے ساتھ تخت نشین ہو چکا تھا۔ نادر قلی کی سرکردگی میں ۱۱۴۲ھ/۱۷۳۰ء میں آخرکار افغانوں کو شکست ہوئی۔ نادر قلی کو اس وقت فوج کا سربراہ بنایا گیا۔ دو سال بعد سلطان طہماسپ کو اس کی روس اور ترکی نواز پالیسی کی بنا پر معزول کیا گیا۔ اور شہزادہ عباس مرزا کم سنی میں ہی تخت نشین کیا گیا۔ نادر قلی اس کا نائب السلطنت بنا۔ اس وقت سے عملاً اقتدار نادر کا ہی تھا۔ مگر اس نے چار سال بعد ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۶ء میں اپنی بادشاہت کا باقاعدہ اعلان کیا۔

رعب و جلال کا عہد

نادر شاہ اقتدار کا عہد، مار دھاڑ اور رعب و جلال کا حامل ہے اس نے افغانوں اور ترکوں کو شکست دی۔ روسیوں کی یلغار روکی۔ اور برصغیر کو تحت نگیں کر لیا۔ محمد شاہ "رنگیلا" کی تن آسان فوجوں نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ دہلی میں ایک طرف سے نادری فوج پر تیر اندازی شروع ہوئی جس کے نتیجے میں اس نے قتل عام کا حکم دیا۔ اور پانچ گھنٹے میں ہزاروں لوگ تہ تیغ ہو گئے مگر آخری وقت میں نادر نے محمد شاہ کو معاف کر دیا۔ اور ایران لوٹ آیا۔ اس کے بعد نادر نے ازبکوں سے بخارا اور خوارزم کے علاقے چھینے اور چند سال تک بصرہ اور موصل کو اپنے تصرف میں رکھا۔

آخری عمر میں نادر نے رعایا پر مظالم ڈھائے اور لوگوں کو متنفر کر لیا۔ ایک غلط فہمی کی بنا پر اپنے اکلوتے بیٹے رضا قلی کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اور بعد میں اس حرکت پر کڑھتا رہا۔ نادر ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں اپنے درباریوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے چند جانشینوں نے کوئی ۵۰ برس تک حکومت کی۔ اور اس کے بعد عہد زندیہ کا آغاز ہوا۔

نادر شاہ نے شیعہ سنی اتحاد کی کوشش کی۔ اس کی کوشش تھی کہ مذہبی منافرت ختم ہو۔ اس کی خواہش تھی کہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کی مانند، فقہ جعفری کو سارا عالم اسلام تسلیم کرے۔ نادر کے فرامین مظہر ہیں کہ وہ شیعوں کو کبار اکر سنیوں کی دل آزار باتیں کہیں اور نہ لکھیں۔ بعقائد

میں اعتدال برتنے کی خاطر دوسیٹوں سے بھی مخاطب ہوا اور اس کی یہ مساعی قابلِ قدر ہے۔

متفرقاتِ ادب

مشتاق اصفہانی میر سید علی مشتاق اصفہانی (۱۱۷۱ء/ ۵۰، ۱۱ء) بڑے قادر کلام شاعر تھے۔ وہ صفویوں کے انحطاط اور افشاریوں کے خلفشار کو خاطر میں نہ لاکر شعر فارسی کی اصلاح میں لگے رہے۔ ادبی بازگشت کا دور گویا ان کے وجود سے فروغ ہو چکا تھا۔ انہوں نے شاعری کے عراقی اسلوب کی طرف توجہ کی، اور سعدی و حافظ وغیرہم کی پیروی کی حمایت کی۔ مشتاق کے اشعار صوری اور معنوی خوبیوں کے حامل ہیں ان کی غزل، قصیدہ اور رباعی یکساں معروف ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ ایک غزل کا انتخاب درج کرتے ہیں۔

منم کہ داغ عزیزان بر دیارم سوخت | فلک ز آتش دوری ہزار بارم سوخت
چو من ز آتش آوارگی نسوزد کس | بہ ننگ حسرت آسائشِ شرارم سوخت
مرا چہ شکوہ ز برق آن گیاہ تشنہ ہم | کہ داغ حسرت باران نوبہارم سوخت
ترا نشست چو دامن سمند گرد از نفت رنگ | بیاد کوی تو آمیزش غبارم سوخت
دریں بیاض من آن بی نصیب گلچینم | کہ دور دیدن گلہا بشاخسارم سوخت
بیا بہ آتشم از بوسۂ بزن آبی | کہ داغ حسرت آن لعل آبدارم سوخت

تاریخ درۂ نادری مصنف میرزا مہدی خان استرآبادی، نادر شاہ کے دربار کے منشی ہیں۔ اس کتاب میں نادر شاہ کے عہد کے مفصل حالات درج ملتے ہیں۔ انداز تحریر منشیانہ اور پرتکلف ہے۔ جملے طویل اور تشبیہات و استعارات، دور از کار ملتے ہیں۔ چند سال پہلے تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سید جعفر شہیدی نے اس تاریخ کے مطالب کو سلیس فارسی میں لکھا اور شائع کروایا ہے۔

تاریخ جہانگشای نادری مؤلف میرزا مہدی خان استرآبادی ہیں جو نادر شاہ کے منشی دربار اور کئی سفروں میں اس کے ساتھ رہے ہیں۔ اس کتاب میں نسبتاً سہل زبان میں نادر شاہ افشار کے وقائع سلطنت اور فتوحات تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ کتاب تہران سے شائع ہو چکی ہے۔

زندیوں کا مختصر عہد زندیہ خاندان کا بانی اور اہم حاکم، وکیل کریم خاں زند تھا جس نے تیس سے زیادہ عرصے تک حکومت کی، اور ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء میں فوت ہوا۔ کریم خان نیک شخص تھا۔ وہ نادر شاہ کی فوج کا ایک وفتی جرنیل تھا۔ ہوسِ اقتدار سے اسے نفرت تھی مگر نادر شاہ کے جانشینوں کی نااہلی اور حبِ وطن کے نتیجے میں اسے اقتدار سنبھالنا پڑا۔ مگر وہ ساری عمر وکیل (سرپرست) کہلاتا رہا۔ اور بادشاہ یا سلطان کا لقب اختیار نہ کیا۔ کریم خان نے شیراز کو دارالحکومت بنایا، اور ملک کی تعمیرِ نو پر توجہ دی۔ مگر افسوس وہ زیادہ عرصے تک کام نہ کر سکا۔ اس کے جانشینوں نے ۱۰ برس حکومت کی۔ زندی عہد کا آخری بادشاہ لطف علی تھا جو ۱۲۱۱ھ/ ۱۷۹۶ء میں قاچاریوں کے ہاتھوں شکست کھا کر تاج و تخت سے محروم ہو گیا۔

شعر و تذکرہ یہ مختصر دور، دورِ خلفشار تھا۔ ادبیاتِ فارسی میں اس دور نے کوئی خاص اضافہ نہ کیا۔ چند شاعر اور ایک تذکرہ نویس البتہ اس عہد کے گلہائے سر سبد ہیں۔

عاشق اصفہانی (م ۱۱۸۱ھ/ ۱۷۶۷ء) نام آقا محمد تھا۔ شاعری میں مشتاق اصفہانی کے ہم مشرب تھے۔ آپ کے اشعار سادہ و دلپذیر ہیں، سبکِ عراقی کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

برای خاطر بیگانگان خطا کردی	که ترک صحبت یاران آشنا کردی
میانهٔ دل و جان و تنم فراق افتاد	بیک نگاه که کردی، بمن جفا کردی
گر ملول شوی از جفا دگر نه کراست	مجال آنکه بگوید ستم چرا کردی
خوشم که ذوق شکارم نرفت از دل تو	هزار بار مرا بستی و رها کردی
ببین به عاشق دلگردار ناصواب مبین	کنون که از گرشش عمر دعا کردی

آذر بیگدلی کاشانی (م ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء) لطف علی بیگ آذر اپنے عہد کا معروف شاعر تھا۔ اسے بازگشت ادبی اور سبکِ عراقی میں شعر کہنے سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ اس کی زندگی خراسان، اصفہان اور شیراز میں بسر ہوئی۔ آخرالامر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس نے وکیل کریم خان زند کے لئے قصائد لکھے۔ وہ سب اصنافِ سخن میں طاق تھا۔ اس نے جامی کی مثنوی یوسف و زلیخا کی تقلید میں

اسی عنوان سے ایک طویل نظم لکھی ہے۔ ایک غزل کا انتخاب پیش خدمت ہے

آنچہ در مکتوب من ظاہر نشد نام من است	وانچہ قاصد را بجا طرفیت پیغام من است
غیر بر من می برد حسرت کہ ہمدم تو ام	کاش نو شد قطرہ ای زین کہ در جام من است
می توانم از تغافل بر سر ہم آر دست	دشمن من این دل بی صبر و آرام من است
آذر آن ظالم کہ بی مورد مرا بد نام کرد	ہیچ می گوید کہ این بیچارہ بد نام من است

ہاتف اصفہانی (م ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء)

سید احمد ہاتف اصفہانی نے افشاری اور زندی دونوں عہد دیکھے۔ مشتاق اصفہانی سے اصلاح سخن لی۔ آپ علم طب، ریاضی، حکمت اور عربی زبان میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ آپ نے میدان غزل میں سعدی اور حافظ کی کامیاب پیروی کی۔ آپ اپنے عہد کے غالباً عظیم تر شاعر تھے۔ آپ کے مختصر دیوان میں سب اصناف سخن پائے جاتے ہیں، مگر توحید باری پر مبنی ان کا ترجیع بند فارسی شاعری کی ایک منفرد نظم ہے۔ یہ ترجیع بند پانچ حصوں میں منقسم ہے ترجیعی بیت یوں ہے۔

کہ یکی ہست و نیست ہیچ جز او	وحدہٗ لا الٰہ الا ھو

آپ کی ایک دو بیتی ہے۔

ساقی فلک ار چہ در شکست من و تست	خصم تن و جان می پرست من و تست
تا جام شراب و شیشۂ می باشد	در دست من و تو دست دست من و تست

تذکرہ آتشکدہ

آتشکدہ کے مولف آذر بیگدلی کا مختصر ذکر ہو چکا۔ تذکرہ ۱۱۷۴ء میں لکھا گیا اور اس کے تین حصے ہیں۔ یہ قدیم و معاصر شعرا کا بے حد اہم تذکرہ ہے۔ معاصرین میں سے اس میں ساٹھ شاعر مذکور ہیں۔ تذکرے کی زبان آسان ہے۔ برصغیر کی طرف ہجرت کر جانے والے شعرا کے ساتھ مولف نے خاصا تعصب برتا ہے۔ ڈاکٹر سید سادات ناصری نے تذکرۂ آتشکدہ کی جلد اول کو ۳ حصوں میں ضروری تراجیم حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کروایا ہے اور دیگر جلدوں کو بھی اسی طرح شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ویسے یہ کتاب مدتوں پہلے شائع ہو چکی۔

عہد قاچاری، اور ادب فارسی کا ارتقاء

سلطنت قاچاریہ کا بانی آقا محمد خان تھا۔ جس نے صرف ایک سال ۱۲۱۱-۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء

حکومت کی۔ اور اپنی بدمزاجی کی بنا پر درباریوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے بعد فتح علی شاہ نے مسند شاہی سنبھالی۔ اور ۳۷ برس تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں ایران کی روس اور ترکی سے بہت سی جنگیں ہوئیں۔ روس سے جنگ کے نتیجے میں ایران کا بہت سا علاقہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ ترکی سے البتہ بعد میں صلح ہو گئی۔ بادشاہ نے فرانس اور انگلستان کے ساتھ سیاسی روابط استوار کئے۔ اور اس امر کے نتیجے میں ایرانیوں اور اہل یورپ کے میل جول میں اضافہ ہوا۔ فتح علی شاہ قاچار عجیب ذوق کا شخص تھا۔ اسے عیش و عشرت اور خاص طور پر نت نئی شادیاں کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے کوئی ایک ہزار عورتوں سے نکاح کیا اور ان سے ۵۰ بیٹے اور ۴۸ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اس کی وفات کے وقت اس کے پوتوں، پوتیوں، نواسوں اور نواسیوں کی تعداد ۷۰۵ تھی۔ بادشاہ کو مال و دولت اور نفیس چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ خاقان تخلص کرتا اور شعر کہتا تھا۔ جو اور ہوس کا ایسا دلدادہ شخص سلطنت کے کام کے لئے کس قدر غیر موزوں تھا۔ البتہ شعراء و ادبا کی اس نے خوب سرپرستی کی۔

ایرانیوں کی بیداری

فتح علی شاہ کا وزیر اعظم میرزا ابوالقاسم قائم مقام فراہانی تھا۔ جو کہ معاملہ فہم اور فاضل شخص تھا۔ اسے ایرانیوں کی بیداری بے حد عزیز تھی۔ مگر محمد شاہ قاچار نے اسے قتل کرا کے میرزا عباس بیات ایروانی معروف بہ حاج میرزا آقاسی کو اپنا وزیر اعظم بنایا۔ محمد شاہ کا جانشین ناصر الدین شاہ بعض معاملات میں ایک روشن خیال شخص تھا۔ اس نے یورپ کے کئی دورے کئے۔ بعض ایرانی طلبہ کو یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظائف دیئے۔ ۱۸۵۲ء میں ایران میں پہلی بار چھاپہ خانہ لگا۔ اور رسل و رسائل کے دیگر ذرائع کو بہتر بنانے پر توجہ دی گئی۔ معاصر روشن خیال ارکان سلطنت، مثلاً اتابک اعظم میرزا تقی خان امیر نظام، علی قلی میرزا، اعتضاد السلطنت، میرزا یحیٰی خان مشیر الدولہ اور میرزا علی اصغر خان امین السلطان، سلطان کو صائب مشورے دیتے تھے۔ ان کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ناصر الدین شاہ نے ایرانی نشاۃ ثانیہ کے کام شروع کئے مگر ذہنی بیداری کا اصل روح پرور پیغام حضرت سید جمال الدین افغانی (م ۱۸۹۷ء) لیکر پہنچے تھے۔

سید جمال الدین نے عالم اسلام کے ایک بڑے حصے میں آزادی و بیداری کی روح پھونکی ہے افغانستان، برصغیر پاکستان و ہند، ایران، ترکی، مصر، فرانس اور انگلستان، جہاں بھی وہ گئے ہنگامہ خیزیوں کو جنم دیا۔ ایران میں آپ تین بار آئے اور شاہی استبداد کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ غالباً اسی آواز کا نتیجہ تھا کہ افغانی کے ایک ارادت مند میرزا رضا کرمانی نے یکم

مئی ۱۸۹۶ء کو شاہ ناصر الدین قاچار کو قتل کر دیا۔

تحریک مشروطہ اور بعد کے واقعات

مظفر الدین شاہ کے عہد حکومت میں تحریک مشروطہ (آئینی حکومت حاصل کرنے کی تحریک) پروان چڑھی۔ بادشاہ نے اس تحریک کو سختی سے دبانے کی کوشش کی مگر نتیجہ برعکس نکلا۔ حریت خواہوں نے قتل و غارت، جلا وطنی اور قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں اور اپنا مطالبہ جاری رکھا۔ بادشاہ نے آخر اس مطالبے کو تسلیم کر لیا مگر اس کے جانشین محمد علی شاہ قاچار نے ایک بار پھر تحریک مشروطہ کو کچل ڈالنے کی کوشش کی۔ عوامی طاقت کے آگے اسے بھی سپر انداز ہونا پڑا اور اس نے اپنی معزولیت قبول کر لی۔ ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء میں احمد شاہ قاچار نے عنان حکومت سنبھالی۔ جنگ عظیم اول کے دوران بادشاہ نے ایران کی غیر جانب داری کا اعلان کیا مگر انگلستان، روس، جرمنی اور آسٹریا کی فوجیں ایران کے مختلف حصوں میں گھس آئیں اور اس سرزمین کو محاذ جنگ بنا لیا۔ میرزا حسن خان مستوفی الممالک، لائق ایرانی وزیر اعظم نے بڑی مشکل سے فریقین کو ایران کی غیر جانب داری کا یقین دلایا اور حملہ آوروں کی فوجیں تہس نہس کرتے ہوئے لوٹ گئیں۔ غیر ملکی فوجوں نے ایرانی معیشت پر بڑا اثر ڈالا۔ داخلی بے امنی اور تحریک مشروطہ اور استبداد کے حامیوں کے درمیان تصادم اس پر مستزاد تھا۔ ان حالات میں ۱۹۲۰ء میں دشت الاشت کے ایک مرد میدان رضا خان عرف میر پنج نے قدم آگے بڑھائے۔ رضا خان پانچ سال تک فوج کے سربراہ، وزیر جنگ اور پھر وزیر اعظم رہے اور ۱۹۲۵ء میں رضا شاہ پہلوی کے لقب سے شہنشاہ ایران بنے۔ احمد شاہ قاچار فرانس چلا گیا تھا اور تادم مرگ وہیں رہا۔ اس طرح قاچاری خاندان کا خاتمہ ہوا اور عصر پہلوی عہد آغاز پذیر ہوا۔

ادب اور عام ترقی کے رجحانات قاچاری سوا سو سالہ عہد (۱۲۱۱-۱۳۴۴ھ/ ۱۷۹۶ء تا ۱۹۲۵ء) میں ادب و شعر نے خوب ترقی کی۔ ایک عرصے کے بعد شاعروں نے پھر درباری سرپرستی حاصل کی اور اس ماحول میں شاعروں نے بھی اپنی سابقہ روش کی طرف توجہ کی ع

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔

سبکِ خراسانی کے دلپذیر قصیدے اور سبکِ عراق کی روح پرور غزلیں، پھر عالم وجود میں آنے لگیں۔ اب اصفہانی یا ہندی سبک سے شعرا نے احتراز کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کو تاریخ ادب میں "دورہ بازگشت ادبی" یعنی گزشتہ روش کی طرف ادبی رجوع کہتے ہیں۔ یہ کام عہد صفویہ کے اواخر اور افشاری اور زندی عہدوں میں دھیرے دھیرے جاری رہا۔ اور عہد قاچاری میں اس نے ایک زود کار تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ شعلہ، طبیب کی "ادبی انجمن" کے کام کو سروش اصفہانی، قائم مقام فراہانی، حکیم قاآنی، فروغی بسطامی اور محمود خان صبا نے آگے بڑھایا۔ اور اب بھی قدیم رنگ میں لکھنے والے ایرانی شعرا تقریباً انہی کا انداز بیان اپنائے ہوئے ہیں۔ قاچاری عہد میں بعض ایسے ترقی پذیر اقدامات کئے گئے جن کا علم وادب سے گہرا ربط ہے۔ ایسے اقدامات میں تہران کے مدرسہ دارالفنون کا قیام، اخبارات ومجلات کا اجرا، نئی صنعتوں کا رواج، یورپ کی کتب کے فارسی تراجم، ڈاک کا اجرا، ریلوے لائن کی تاسیس، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی ایران میں تدریس اور ایرانی مدارس میں یورپی اساتذہ کی تدریس شامل ہے۔

بابی اور بہائی تحریکیں

محمد شاہ قاچار کے عہد (۱۸۳۴-۱۸۴۸ء) میں سید علی محمد شیرازی نے "باب" یعنی امام غائب کے قائم مقام ہونے کا دعویٰ کیا۔ "باب" دروازے کو کہتے ہیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ایسا دروازہ ہے جس سے گزر کر لوگ امام موعود کے بارے میں علم حاصل کرسکتے ہیں۔ بعد میں اس نے ایک نئی شریعت کا دعویٰ کیا اور علما کے فتویٰ اور ناصر الدین شاہ کے حکم کے مطابق اسے ۱۸۵۰ء میں تبریز میں قتل کروا دیا گیا۔ باب کے حامیوں نے بڑی مزاحمت دکھائی اور طاقت کے استعمال سے اس فتنے کو دبا دیا گیا۔ اس کے بعد میرزا یحییٰ "صبح ازل" اور اس کے بڑے بھائی بہاء اللہ نے "بابیت" کی تبلیغ کے فرائض سنبھالے مگر کچھ عرصے بعد بہاء اللہ نے "بہائیت" نام کے نئے مذہب کا اعلان کیا۔ یہی نیا مذہب اب تک چوری چھپے پر پُرزے نکال رہا ہے۔ بہاء اللہ نے ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا اور اس کے بیٹے عبدالبہا عباس بھائی نے ۱۹۲۱ء میں۔ اب شوقی آفندی ربانی جانشین ہیں۔

قرۃ العین طاہرہ بابیہ (م ۱۸۵۲ء)

طاہرہ کا نام ام سلمیٰ فاطمہ تھا، زرین تاج اس کا لقب تھا اور طاہرہ تخلص۔ سید علی محمد باب نے اسے قرۃ العین کا لقب دیا تھا۔ وہ سید کاظم رشتی (م ۱۸۴۴ء) کی شاگرد

تھی۔ باپ کا نام حاجی ملا محمد صالح قزوینی تھا۔ ۲۰ سال کی عمر میں اپنے عم زاد ملا محمد قزوینی سے بیاہی گئی۔ ابراہیم اور اسماعیل نامی دو بیٹوں کی ماں بنی، مگر اس کی ازدواجی زندگی ناکام رہی۔ شوہر کی رجعت پسندی اس کی روشن خیالی اور مذہبی تاویلات کا مقابلہ نہ کر سکی وہ زیادہ عرصہ میکے میں رہی۔ ۲۶ برس کی عمر میں وہ اپنی بہن مرضیہ خانم اور بہنوئی میرزا محمد علی کے ساتھ کربلا معلی اور نجف اشرف رہی۔ وہاں پردہ نشین ہو کر وہ دلپذیر وعظ کہتی رہی۔ وہاں اُس نے 'مظہر فاطمۃ الزہراؑ' ہونے کا دعویٰ کیا مگر اپنے مذکورہ بہنوئی کے توسط سے 'باب' کی گرویدہ ہو گئی۔ ۴ سال بعد وہ واپس آئی، پردے کو خیرباد کہا اور 'باب' کی حمایت میں تقریریں کیں۔ اس کی شیریں بیانی اور حسن و جمال لوگوں کے لئے باعث کشش تھا۔ قزوین آکر اُس نے شوہر سے طلاق لے لی۔ 'باب' کے قتل کے بعد، علماء نے اس کے قتل کا بھی فتویٰ دیا، مگر بادشاہ ناصر الدین شاہ دو برس طاہرہ کو تائب ہونے کا کہتا رہا۔ اس نے اُسے ملکہ بنانا چاہا مگر طاہرہ نہ مانی۔ آخر اگست ۱۸۵۲ء میں اسے قتل کروا دیا گیا۔ علامہ اقبالؒ نے طاہرہ کی بے باکی کو "جاوید نامہ" میں سراہا اور وہاں اس شاعرہ کی ایک غزل کو نقل فرمایا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر اقبالؒ نے حذف کر دیا ہے:

دور دہان تنگ تو عارض عنبرین خطت ۔ غنچہ بہ غنچہ، گل بہ گل، لالہ بہ لالہ، بو بہ بو

طاہرہ کے چند دیگر ابیات ملاحظہ ہوں:

ای خفتہ رسید یار، برخیز ۔ از خود بفشان غبار، برخیز
آمد بر تو طبیب غم خوار ۔ ای خستہ زنزار، برخیز
ای آنکہ خمار یار داری ۔ آمد اِت غمگسار، برخیز

قاچاری عہد کے ممتاز شعراءؒ

قاچاری عہد کے جملہ شاعروں کا مختصر ذکر بھی ایک کتاب کا متقاضی ہے۔ ہم چند معروف شعراء کا ذکر اور بعض کا مختصر نمونۂ کلام پیش کرتے ہیں:

۱۔ سحاب اصفہانی (م ۱۲۲۲ھ/ ۱۷۹۷ء) سید احمد ہاتف اصفہانی مذکور کا فرزند، سید محمد سحاب فتح علی شاہ کے دربار سے

وابستہ تھا۔ طبیعت میں خاکساری اور مزاج میں شرافت تھی۔ رشحات سحاب کے نام سے شعرا کا ایک نامکمل تذکرہ لکھا۔ قصائد میں خاقانی اور غزل میں سعدی کا مقلد تھا ایک غزل کا مطلع و مقطع ملاحظہ ہو ؎

شعلہ زد چون برق خواہم ای تو آہ خویش را ۔ تا کنم ز آن چارۂ روز سیاہ خویش را
گرچہ پیر سالخوردی شد سحاب اما کند ۔ صرف ماہ و خردسالی، سال و ماہ خویش را

۲۔ صباحی کاشانی (م ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) حاج سلیمان صباحی بیدگلی کاشانی، باکمال شاعر تھا۔ آقا محمد خان قاچار کی مدح کی۔ فتح علی خان صبا آپ کا شاگرد تھا۔ مرثیہ گوئی میں طاق تھا۔ غزل اور قصیدہ وغیرہ میں بھی نام پیدا کیا۔ دیوان طبع ہو چکا۔ آپ کی ایک رباعی ہے ؎

سودی نکند ہر کہ خریدار تو شد ۔ صحت نپذیرد ہر کہ بیمار تو شد
آسودہ نشد دلی کہ افگار تو شد ۔ ای وای بر آنکس کہ گرفتار تو شد

۳۔ مجمر اصفہانی (م ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) تہران میں فتح علی شاہ کے دربار سے وابستہ رہا۔ نام سید حسین طباطبائی تھا اور جوانی میں ہی انتقال ہو گیا۔ مجتہد الشعرا لقب تھا۔ مجمر شاہزادہ حسین علی مرزا کا خاص ندیم بھی رہا اس کے ظریفانہ اور چیستانی اشعار بے حد معروف ہیں۔ غزل، مثنوی اور قصیدہ بھی اچھا لکھا ہے۔ چند ابیات نقل کرتے ہیں ؎

بر در دل غم صلائی می زند ۔ حلقہ بر در آشنائی می زند
تیغ ناپیدا قاتل ناپدید ۔ کشتہ در خون دست و پائی می زند
از حقیقت ہیچکس آگہ نشد ۔ ہر یکی حرفی ز جائی می زند
خرم آن کشور کہ سلطانی در آن ۔ بوسہ بر دست گدائی می زند
ناتوانی بین کہ از نیروی عشق ۔ پنجہ با زور آزمائی می زند

۴۔ ملک الشعرا صبا کاشانی (م ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء) فتح علی شاہ کے دربار میں ملک الشعرا تھے اور اتفاق سے ان کا اپنا نام فتح علی خان تھا۔ کاشان اور قم علاقوں کے حاکم بھی رہے ہر صنفِ شاعری میں کامیاب طبع آزمائی کی۔ دیوان میں پندرہ ہزار اشعار ہیں۔ عبرت نامہ اور گلشن صبا نام کے مجموعہ کلام انہوں نے خود مرتب کئے تھے۔ خداوند نامہ اور شاہنشاہ نامہ

ان کی مثنویاں ہیں۔ آپ رزمیہ شعر اچھے کہہ لیتے ہیں مگر معانی کی گہرائی مفقود ہے۔ رزم و حماسہ میں آپ فردوسی کے مقلد ہیں۔ مثنوی "خداوندنامہ" کے چند ابیات ملاحظہ ہوں ان میں حضرت علیؓ عمرو بن ود پہلوان سے مقابلہ کرنے کے لئے رسولِ پاکؐ سے اجازت حاصل کرتے ہیں ؎

کہ شیرِ خدا یال یازید چست ۔ کہ شاہا منم آنکہ لبسر و دجست
پیمبر بسر ورش کہ عمرو است این ۔ کہ دست یلی آختہ ز آستین
علی گفت کای شاہ ، اینک منم ۔ کہ یک بیشہ شیر است در جوشنم
برو آفرین خواند ، وخواندش بمہر ۔ کہ یار تو ، دادار گردان سپہر
بسر بست دستار از پاک دست ۔ گشاد و دو گیتی ، بنانش برست

۵۔ نشاطِ اصفہانی (م ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء)

معتمد الدولہ مرزا عبدالوہاب نشاط، شاعر ہونے کے علاوہ خطاط تھے ترکی اور عربی زبانیں خوب جانتے تھے۔ جواں مرد اور فیاض تھے۔ شعراء و ادباء کی سرپرستی کرتے تھے۔ قصیدہ، مثنوی اور رباعی اچھی کہی مگر ان کا اصل میدان غزل ہے اس میدان میں آپ نے سعدی و حافظ کی زمینوں میں خوب طبع آزمائی ہوئی ہے۔ ایک غزل کے منتخب اشعار اس طرح ہیں ؎

زاہد اور رہ مذہب خانہ خماری ہست ۔ وچہ کی اور زہد، خرقہ و دستاری ہست
زفتنش بی بیمی نیست از این رہ کہ طبیب ۔ گزرد بر سر آن کوچہ کہ بیماری ہست
غم گرفتہ است فرو مجلس میخواران را ۔ مگر امروز درین میکدہ ہشیاری ہست
شاید ار بر سر کوی تو بود جای نشاطؔ ۔ بلبلی ہست بہر خانہ کہ گلزاری ہست

۶۔ وصالِ شیرازی (م ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء) اور خاندانِ شعرا

مرزا محمد شفیع وصال شیرازی کو "میرزا کوچک" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ آپ نے فتح علی شاہ اور محمد شاہ کے عہد دیکھے۔ علم موسیقی پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ اس لئے الفاظ کے انتخاب اور دروبست کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ آپ کی مثنوی "بزمِ وصال" شاہنامہ فردوسی کی تقلید میں ہے وحشی کی مثنوی "فرہاد و شیریں" کو آپ نے مکمل کیا اور علامہ جار اللہ زمخشری کی کتاب

"اطواق الذہب" کو عربی سے فارسی میں منتقل کیا۔ وصال، شعرائے قدیم کے اسلوب میں کامیابی سے شعر کہتا تھا۔ اس کی ایک خوبی، شاہی استبداد کے خلاف لکھنا اور بادشاہ و امرا سے کلمۂ حق کہنا تھا۔

وصال کو صاحب خاندان شعر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے چھ فرزند۔ وقار، محمود طبیب، میرزا ابوالقاسم فرہنگ، داوری، یزدانی اور حجت، سب فاضل اور شاعر تھے۔ وصال کی تشبیہات و استعارات کی بہت تعریف کی جاتی ہے ہم صرف ۳ اشعار کا نمونہ پیش کرتے ہیں ؎

ہر طرف سوختۂ ای از غم او می نالد ۔ این چہ شمعست کہ عالم ہمہ پروانۂ اوست
زنہار میا زاد ز خود ہیچ دلی را ؛ از ہیچ دلی نیست کہ راہی بہ خدا نیست
بہ زیر پردہ چون در مہ سحابی ۔ سخن بی پردہ گویم آفتابی

۷۔ حکیم قاآنی شیرازی م ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء)

میرزا حبیب قاآنی اس عہد کا غالباً سب سے بڑا شاعر تھا۔ وہ موسیقی اور فرانسیسی زبان سے بخوبی آشنا تھا۔ اس کا گرگٹ جیسا کردار البتہ افسوس ناک ہے۔ اس نے ہر برسر اقتدار شخص کی توصیف کی اور ہر معزول شدہ امیر و وزیر کی تعریض لکھی ہے۔ قاآنی الفاظ و تراکیب کا سلطان بے تاج ہے۔ اس کے باوجود اس کے ہاں اونچے افکار و تخیلات کی کمی ہے۔

قاآنی نے ابتدائی زندگی شیراز میں گزاری۔ بعد میں دربار تہران میں وارد ہوا اور وہیں فوت ہوا ہے۔ یہاں ہم شاعر کی منظر نگاری کے اسلوب کو دکھانے کی خاطر ایک معروف قصیدہ کی بہاری تشبیب کے چند اشعار نقل کر رہے ہیں ؎

بہار آمد کہ از گلبن ہمی بانگ ہزار آید ۔ بہر ساعت خروش مرغ زار از مرغزار آید
تو گوئی ارغنون بستند بر ہر شاخ در بیشہ ۔ زبس بانگ تذرو و صلصل و دراج و سار آید
بجوشد مغز جان چون بوی گل از گلستان خیزد ۔ بپیچد سرو مرغ دل چون بانگ مرغ از شاخسار آید
خروش عندلیب و صوت سار و نالۂ قمری ۔ گہی از گل، گہی از سرو بن، گہ از چنار آید
یکی گیرد نکہت لالہ از ترکیب قدح دارد ۔ یکی بر گل کند تحسین، کہ زو بوی نگار آید

۸۔ فروغی بسطامی م ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء

میرزا عباس فروغی (فروغ الدولہ) غزل کے صاحب دل شاعر تھے جوانی

بطالم و نواح مشہد میں بسر کی۔ کچھ عرصہ مازندران رہے اور اس کے بعد تہران آ گئے۔ کچھ عرصہ فتح علی شاہ کی مدح کی، پھر اس کام سے تائب ہو گئے۔ فطرتاً سیر چشم اور قناعت پسند تھے۔ دربار سے قطع تعلق کر کے کنج زہد و تصوف کا انتخاب کیا۔ ناصرالدین شاہ اور احمد شاہ کے عہد میں ان کے عرفان و تزکیہ نفس کا کافی شہرہ تھا۔ ناصرالدین شاہ نے کئی مرتبہ بطور خاص انہیں بلایا، کلام سنا اور تحائف پیش کئے۔ فروغی رومی، سعدی اور حافظ کے کامیاب پیرو تھے اور ان کے کلام سے تصوف اور عشق حقیقی کی بو آتی ہے۔ مولانائے روم کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

ای یار مقامر دل پیش آ و دمی کم زن — زخمی که زنی بر ما، مردانه و محکم زن

اسی بحر میں فروغی کی غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو ؎

گر عاشق حق بینی، چشم از همه بر هم زن — چون دل به یکی دادی، آتش به دو عالم زن
هم نکتهٔ وحدت را با شاهد یکتا گو — هم بانگ انا الحق را بر دار معظم زن
هم چشم تماشا را بر روی نکو بگشا — هم دست تمنا را بر گیسوی پر خم زن
هم جلوهٔ ساقی را در جام بلورین بین — هم بادهٔ عشق را با سادهٔ بی غم زن
گر تکیه دهی وقتی، بر تخت سلیمان ده — ور پنجه زنی روزی، بر پنجهٔ رستم زن
تا چند فروغی را مجروح توان دیدن — یا مرهم زخمی کن، یا ضربت محکم زن

۹۔ یغما جندقی (م ۱۲۷۶ھ / ۱۸۵۹ء)

یغما نے ایران و عراق میں سیاحت کی اور آخر کار فتح علی شاہ کے دربار کا رخ کیا۔ آپ نے سب اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے، یہاں تک کہ مخالفوں کی ہجویں بھی لکھیں۔ آپ کی زبان سادہ ہے۔ آپ کے کلام کی کلیات اور ایک متفرق مجموعہ چھپ چکا۔ آپ کے چند شعر نقل کرتے ہیں:

صوفیان را دگر امروز نه هیئت و نه بوئی — آسمان باز بما نازده سنگی به سبوئی
بر سرم چون گذری دستهٔ گل بر سر خاکی — یا به چشم چو بهی سرو روان بر لب جوئی
زاهدا در اهل بهشت است خدا یا سقر ستم — جز به دوزخ، چو منی ظلم بود یاد چو اوئی
ای خوش آن دل که ز مژگان همه چیز چو لیلی — نشود شیفتهٔ رنگی و آشفتهٔ بوئی

۱۰۔ سروش اصفہانی (م ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء)

سروش جوانی میں تبریز گئے اور وہاں قہرمان مرزا کے ذریعے شہزادہ

ناصر الدین سے راہ و رسم پیدا کی۔ ناصر الدین نے اپنی سلطنت کے زمانے میں سروش کو تہران بلا لیا اور شمس الشعرا کا لقب دیا۔ سروش نے خوب داد سخن دی اور مثنوی، قصیدہ اور غزل میں خوب نام پیدا کیا۔ اس کے دیوان کا نام زینت المدائح ہے اور مثنویاں کا ساقی نامہ اور الٰہی نامہ۔ یہاں ہم ان کے نوروز اور آمد بہار کے بارے میں دو شعروں کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ؎

نوروز نو آئین ترا سال زیادست — ای ترک بدہ بادہ کہ عید است و بہارست
گلبن چو یکی حجلہ بہ بر کردہ حریاست — ہامون چو یکی حلہ ای پر نقش و نگارست

۱۱- صبا کاشانی (م ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء)

محمود خان صبا فتح علی خان صبا کے پوتے تھے اور دادا کے تخلص کو اپنا رکھا تھا۔ آپ کے والد محمد حسین عندلیب بھی شاعر تھے۔ صبا نے کوئی ۳ ہزار شعر کہے ہیں، اور اکثر میں محمد شاہ، ناصر الدین شاہ اور سرکاری تقاریب کا ذکر ملتا ہے۔ منظر نگاری میں آپ کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ اس خصوصیت کے حامل چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

از کوہ بر شدند خروشان سحابہا — غلطان شدند بر لب رز آبہا
باد صبا بیامد و بر بوستان گذشت — بگرفت ز لف سنبل از آن بادتابہا
خوبان سپیدہ دم سوی بوستان شدند — از بہر دیدن رخ گل باشتابہا
زین فصل و بابہار کتاب زمانہ است — تا اختیار فصل طرب کن ز بابہا
جز روز خرمی نبود در حساب عمر — ما گرفتہ ایم ز گیتی حسابہا

۱۲- ہدایت طبرستانی (م ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء)

رضا قلی خان ہدایت "للّٰہ باشی" تہرانی تھے اور شاعری میں فتح علی شاہ سے امیر الشعرا کا لقب پایا تھا۔ تمام اصناف سخن میں شعر کہے۔ ان کی مثنویاں گلستان ارم، انوار الولایت، بحر الحقائق، بکتاش نامہ اور انیس العاشقین معروف ہیں۔ دیوان ان کے علاوہ ہے۔ یہاں ہم مثنوی گلستان ارم کے ابتدائی اشعار نقل کرتے ہیں ؎

بنام آنکہ بی نامش بہ نامہ — نمی گردد روان از عجز خامہ
ہمہ عالم ز نورش گشتہ پیدا — ولی خود از نہان ورنہ ہویدا

بہر ذرہ ز نور آفتابش | ظہوری و ظہورش خود حجابش
همه کارش عجائب در عجائب | بہر جا حاضر و از جملہ غائب

ہدایت کی نثری تالیفات اور ان کی دیگر خدمات کا ذکر بعد میں آئے گا

۱۳۔ خیابانی (م ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء) خیابانی کے آباؤ اجداد کا پیشہ سپاہ گری تھا۔ آپ نے محمد شاہ اور ناصرالدین شاہ کی مدح لکھی۔ قصیدہ پُر زور لکھتے تھے۔ نثر میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کے قصائد کا انتخاب استنبول میں چھپا اور مجموعۂ درج دُرر، تہران میں۔ ڈاکٹر صفا نے گنج سخن جلد سوم میں آپ کی کئی تالیفات کا ذکر کیا ہے۔ ایک قصیدے کے ابتدائیہ میں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

ای دل من بہ بیم باش ار بہ بیم | کامدان حور از بہشت نعیم
اینک از بہر یادگار ترا | کرد خواہم بزلف او تسلیم
وندر آن جای تیرہ ات باید | رفت و یک چند گاہ گشت مقیم
گر ستادہ بہ پیش حور بہشت | گر نشستہ بنزد دیو رجیم
گر بماند مقام تو بہ گمند | گر طلبد مکان تو ز نسیم

۱۴۔ ادیب الممالک امیری فراہانی (م ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء) امیری، علم و ادب اور شعر و سخن کے ایک خانوادے سے منسلک تھے۔ آپ نے بچپن سے ہی شعر کہنا شروع کیا۔ آپ عربی اور فرانسیسی بخوبی جانتے تھے بلکہ ان زبانوں کے ادب تک ان کی رسائی تھی۔ آپ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، اور دیوان، وحید دستگردی مرحوم کے مقدمے کے ساتھ چھپ چکا۔ امیری نثر نویس اور صحافی بھی تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

غلام ہمت آنم کہ خاک عشق سرشت | مرید نکہت آنم کہ را و گلشن بخشت
خوشا دیار محبت کہ اندر آن وادی | طراز کعبہ شود فرش عاکفان کنشت
مکن ملامت و آزار بندگان خدای | کہ باغبان نہ برای تو این درخت بکشت
مرا عقیدہ بہ دل اندر است خضر حیات | ترا چکار کہ نیکو شمار لیش یا زشت
تن من ار تو زدودی و خاک تیرہ مگرد | چنانکہ قالب یاران ازو خاک سرشت

۱۵۔ میرزا ایرج (م ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء) جلال الممالک ایرج مرزا فتح علی شاہ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ فارسی کے علاوہ عربی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ روسی اور ترکی کی زبانیں بھی ان کی خاطر قابل استفادہ حقیں خطاطی سے لگاؤ تھا۔ ایرج کو دربار مظفر الدین شاہ سے صدر الشعرا کا لقب ملا تھا، مگر آپ دربار سے کنارہ کش ہو کر سرکاری ملازمت میں شامل ہو گئے۔ بعد میں آپ وزارت تعلیم کے ایک افسر متعین ہوئے تھے۔ آپ کے اشعار سادہ و رواں ہیں دیوان طبع ہو چکا ہے۔ آپ کے قطعات بے حد معروف ہیں اور ان میں سے کئی ہمارے ہاں کے مختلف امتحانات میں شامل درس ہیں اس لئے نمونہ کلام فراہم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دورِ قاچاری کا نثری سرمایہ

یہ عہد نثری سرمایہ کے اعتبار سے غنی ہے۔ مکتوبات، تذکرے، تاریخ، سفرنامے، مذہبیات لغت، ناول، افسانے، مقالات اور انفرادی سوانح عمریاں سب کچھ اس دور میں کافی لکھا گیا۔ ہم اس سرمایے کی مختصر کیفیت ذیل عنوانات کے تحت لکھ رہے ہیں۔

ادب و انشاء مرزا ابو القاسم فراہانی معروف بہ "قائم مقام ثانی" کا ذکر بطور شاعر کے ہو چکا۔ ان کے "منشآت" ادبی چاشنی کے حامل ہیں۔ قائم مقام ثانی کو گلستانِ سعدی سے شغف تھا اور یہ کتاب انہیں تقریباً ازبر تھی "منشآتِ قائم مقام ثانی" کا قابلِ قدر سرمایہ گلستان کے زیر اثر نظر آتا ہے مگر مصنف کی جدت، اور دلآویزی قابلِ داد ہے۔ قائم مقام ثانی کے پوتے میرزا صادق خان ادیب الممالک (م ۱۹۱۷ء) کے مضامین، ادب اور ایران سلطانی نامی اخبارات میں چھپتے رہے اور ان میں ادبی حلاوت قابلِ ملاحظہ ہے۔ آپ پروانہ اور امیر کے تخلص کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ اس دور میں سیاسی اور غیر سیاسی کافی اخبارات اور مجلات نکلے جن میں ادب و انشاء کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ بہار مشہدی کے اخبارات نوبہار، تازہ بہار اور مجلہ دانش کدہ اور علامہ علی اکبر دہخدا کے مضامین دونوں کے علمی نام سے ہی کی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔ انجہانی پروفیسر ایڈورڈ جی۔ براؤن نے اپنی انگریزی تالیف "جدید ایران میں پریس اور شاعری" میں اس دور کے ادب و انشاء کے قابلِ قدر نمونے جمع کئے ہیں۔ قاآنی کی "پریشان" گلستان سعدی کی تقلید میں ایک قابلِ قدر تالیف ہے۔

تاریخ و تذکرہ

ناسخ التواریخ مصنف مرزا تقی سپہر ہیں۔ تاریخ عالم ہے۔ محمد شاہ اور ناصر الدین شاہ کے عہد میں مکمل ہوئی۔ تاریخ اسلام اور تاریخ ایران کے حصے نسبتاً مفصل تر ہیں۔ کتاب کی عبارت سادہ ہے۔ پوری کتاب کی پندرہ جلدیں ہیں ناصرالدین کے منشی دربار، عباس قلی خان سپہر نے کتاب کے بعض حصے مکمل کئے ہیں۔ ابھی تک کچھ حصے چھپے ہیں۔

تاریخ منتظم ناصری مصنف محمد حسن خان صنیع الدولہ اعتماد السلطنہ ہیں کتاب کی تین جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے اسلام تا ۱۲۰۵ھ کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں خلافت عباسیہ کے لیے قاچاری خاندان کے اوائل تک کے واقعات مندرج ہیں اور تیسری میں قاچاری خاندان کی تاریخ۔ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ کتاب کا اسلوب سادہ اور روان ہے۔

نامۂ دانش وران اس کتاب کو مرزا ابو الفضل ساوجی، مرزا حسن طالقانی شمس العلما عبد الرب آبادی، عیاث ادیب اور مرزا عبد الوہاب قزوینی نے سات جلدوں میں لکھا۔ یہ ناصرالدین شاہ قاچار کے عہد کے علما و ادبا کا نامکمل تذکرہ ہے کتاب کی عبارت مشکل ہے۔ چھ جلدیں چھپ چکی ہیں۔

مآثر سلطانیہ مؤلفہ عبد الرزاق نجف قلی، صاحب قرانی، مؤلفہ محمود مرزا اور تاریخ ذو القرنین مؤلفہ فضل اللہ منشی۔ یہ تینوں کتابیں فتح علی شاہ قاچار کے عہد میں لکھی گئیں اور معا قاچاری عہد سے مربوط ہیں۔ تینوں کی زبان سادہ ہے۔

ریاض العارفین اور مجمع الفصحا۔ یہ دونوں کتابیں رضا قلی خان ہدایت طبرستانی مذکور نے لکھی ہیں۔ ہدایت کئی سال تک تہران کے مدرسہ دار الفنون میں پرنسپل رہا۔۔۔ ریاض العارفین، صرف شعرا کا تذکرہ ہے جس میں نمونۂ کلام بھی ملتا ہے۔ مجمع الفصحا دو جلدوں میں ہے اور سات سو سے زائد شعرا کا تذکرہ ہے۔

لغت اور سفر نامے رضا قلی خان ہدایت نے ایک لغت لکھا اور ایک سفر نامہ۔ فرہنگ انجمن آرای ناصری، اس عہد کا اہم لغت ہے۔ اس لغت میں فارسی کے مشکل الفاظ کے معانی، فارسی میں ہی لکھے گئے۔ توضیح کی خاطر فارسی ضرب الامثال اور اشعار سے مثالیں فراہم کی گئی ہیں۔ جمال الدین حسین انجو کی لغت فرہنگ جہانگیری اور مؤلفہ

۱۸۰۱ء) خاص طور پر مؤلف کے پیش نظر رہا ہے۔

ہدایت، ناصر الدین شاہ کی طرف سے خوارزم اور نواحی علاقوں کے ایک سیاسی سفر پر مامور ہوا تھا۔ اس سفر کی کیفیت اس کے دلچسپ سفرنامہ "سفرنامۂ خوارزم" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سفرنامہ کی زبان سادہ ہے۔

ڈرامہ، افسانہ اور ناول کے تجربے

جیسا کہ اس سے قبل اشارہ ہوا ۱۸۵۱ء سے ایران میں یورپی طرز کے کئی مدرسے قائم ہوئے جن میں اکثر مغربی اساتذہ تعلیم دیتے تھے۔ ان اساتذہ کی تعلیم و تدریس، ایرانی طلبا کی دلالت پر یورپ روانگی، ایران و یورپ کے سیاسی روابط اور ناصر الدین قاچار کے یورپ کے سہ گانہ دوروں کے نتیجے میں یورپ کے خیالات ایران میں وارد ہونے لگے۔ ان خیالات کے ذرائع میں ڈرامے، افسانے اور ناول کی حیثیتیں بھی تھیں۔

فارسی میں فن تمثیل کے پہلے نقوش ترکی اور فرانسیسی ڈراموں کے فارسی میں ترجمے سے واضح ہوئے۔ ایک ایرانی شاعر نے (جس کا نام معلوم نہیں ہے) فرانسیسی ادیب مولیئر کا ایک ڈرامہ "گز اوش گریز مردم" کے نام سے فارسی نظم میں پیش کیا۔ مرزا جعفر قراچہ داغی نے ۱۸۷۴ء میں مرزا فتح علی دربندی کے ترکی آذربائیجانی میں لکھے ہوئے سات مختصر ڈراموں کو فارسی میں منتقل کیا۔

شاہزادہ ملکم خان (م ۱۹۰۸ء) انگلستان میں ایران کے سفیر تھے اور انہوں نے تین طبع زاد ڈرامے لکھے۔ ان ہی دنوں تہران سے "تیاتر" نامی اخبار جاری ہوا اور اس میں چند کالم مختصر ڈراموں کی خاطر مخصوص کر دئے گئے۔ اس اخبار میں قاچاری استبداد کے بارے میں "طنزیہ" ڈرامے بھی چھپتے رہے۔ ناصر الدین نے یورپ میں ڈرامے دیکھے تھے وہ ایک حد تک اس فن کا قدردان تھا۔ اسی لئے اس نے مدرسہ دار الفنون تہران میں ڈرامے پیش کرنے کا حکم دیا مگر یہ ڈرامے بیگانہ اور غیر معیاری ہوتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں سید علی نصر نے یورپ کے انداز کا تیاتر بنایا اور ۱۹۲۴ء میں علی نقی وزیری نے موسیقی کا ایک مدرسہ اس طرح معیاری ڈرامے پہلوی عہد میں سٹیج کئے جا سکے۔

افسانے اور ناول

تاریخی شخصیتوں کے نام سے شروع ہوئے۔ ان شخصیتوں میں کیکاؤس بادشاہ، کوروش اعظم، شاہنشاہ قباد اور انوشیروان سرفہرست

آتے ہیں۔ "انتقام خواہانِ مزدک" ایک ناول ہے جسے صنعتی زادہ کرمانی نے ساسانی عہد کی ایرانی شخصیت "مزدک" کے بارے میں لکھا۔ حاج زین العابدین مراغی (مقیم استنبول) کی تالیف "سیاحت نامہ ابراہیم بیگ" کو ناول کہیں یا افسانہ، اس میں "مشروطیت" کی جدوجہد کے زمانے کے ایران کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کا خاکہ ملتا ہے۔ یہ کتاب فارسی روزمرہ اور محاورہ سیکھنے کی خاطر معاون بن سکتی ہے اور اسی لئے اب بھی تدریس کی خاطر منتخب کی جاتی ہے۔ شیخ موسیٰ کے ناول "عشق و سلطنت" کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے حاجی بابا اصفہانی، ایک ناول نما طویل داستان ہے جسے موریئر نے لکھا اور شیخ احمد روحی کرمانی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ناول اپنے دامن میں قاچاری عہد کے ایران پر طنز و تشنیع کے تیر رکھتا ہے۔ ڈرامہ، افسانہ اور ناول کے یہ ابتدائی نقوش پہلوی عہد میں خوب اُبھرے ہیں۔

قاچاری عہد کی سیاسی شاعری

فارسی کی سیاسی شاعری کا آغاز انیسویں صدی عیسوی کے اواخر سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ملتِ ایران اپنے آئینی اور پارلیمانی حقوق (مشروطیت) حاصل کرنے کی خاطر کوشاں تھی مبارزانِ حریت کے بلند حوصلوں کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے، مگر ان حوصلوں کی تحریک و ترغیب کرنے والے شعرا و ادبا تھے اور ان ہی کی کوششوں سے "مشروطہ" کا پودا ۱۹۰۶ء میں نمودار ہوا، اور سخت تُند و تیز دشواریوں کے باوجود پروان چڑھا۔

سیاسی شاعری کے مضامین رنگا رنگ ہیں۔ کہیں اہلِ وطن کی غفلت پر طنز ہے اور کہیں استبداد پر نوحہ۔ وطن کی زبوں حالی کا بیان ہے یا اہلِ وطن کو تن، من، دھن قربان کرنے کی تلقین۔ جن سیاسی شعرا کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ اونچے شعرا اور ادیب تھے ان میں سے اکثر نے قاچاری عہد کا خاتمہ اور عصرِ پہلوی کا ارتقاء دیکھا مگر ان تبدیلیوں کے بڑے موجب چونکہ وہ خود تھے، اس خاطر ہم انہیں مختصراً "عصرِ قاچاری" ہی میں ذکر کرتے ہیں

نکتہ | عصرِ قاچاری کے شعرا نے صنفِ شاعری کے مختلف قالبوں میں قوم سے خطاب کیا مگر بعض نے تصنیف پر توجہ کی۔ اس خاطر اس شاعری کے محتویات کے بارے میں ذرا وضاحت کر دیں۔ "تصنیف" اصطلاح میں اس عوامی گیت کو کہتے ہیں جو خاص واقعہ یا ہنگامی واقعات سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہو۔ ایسے اشعار دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھے جاتے رہے۔ فارسی میں "تصنیف" اگرچہ دورِ قاچار سے پہلے مخصوص

نہیں مگر چونکہ یہ سیاسی بیداری کا دور تھا اس لیے گیت کافی لکھے گئے اور ملک کے گوشہ و کنار میں معروف ہوئے۔ یہ وضاحت اس خاطر ضروری تھی کہ سیاسی شاعری میں تصانیف کا ذکر آئے گا۔ اب سیاسی شعرا کا ذکر آرہا ہے۔

نسیم رشتی (م ۱۹۳۳ء) سید اشرف حسینی و اشرف الدین) نسیم رشتی ہفت روزہ نسیم شمال کے مدیر تھے۔ یہ پرچہ پہلے تبریز سے نکلتا تھا اور پھر تہران سے۔ نسیم نے مشروطہ کی حمایت اور پادشاہانِ مستبد کے انتقاد میں اپنا ذریعۂ نظم صرف کیا حکومتِ مشروطہ کی تائید میں لکھتے ہیں:

ایک کلمات علما نقص صریح است — بر انکه نیز د عقلا، ظلم قبیح است
مشروطہ چو در عقل و چو در شرع صحیح است — ہر کس کند انکار، ز جمع عقلا نیست
مشروطہ ز حق است بپا زیبدہ و اتحاد — عدلیہ و انصاف و مساوات دُرا بار
قانون اساسی است در و ناظر ہر کار — فرقی بیان غنی و شاہ و گدا نیست

عارف قزوینی (م ۱۹۳۳ء) مرزا ابوالقاسم عارف قزوینی کو خطاطی اور موسیقی سے خصوصی لگاؤ تھا۔ تصنیف خوب لکھیں اور انہیں خوش الحانی سے مختلف جگہوں میں پڑھتے رہے۔ ان کی تصنیف ”خرابی، ہنگامہ خیز رہی۔ آپ کی سیاسی شاعری بے حد اہم ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا وہ حمایت عوام، مشروطہ کی تائید اور انتقادات سے معرا نہیں ہے۔ آپ ہمدان میں بو علی سینا کے مزار کے پہلو میں مدفون ہیں۔ ان کی ایک سیاسی غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو ؎

بیمار درد عشق و پرستارم آرزوست — بیمو ذان دو نرگس بیمارم آرزوست
ای دیدہ خون ببار کہ یک ملتی بخواب — رفتہ است وزان دو دیدۂ بیدارم آرزوست
ایران خراب شد ز دو چشم تو ای صنم — اصلاح کار از تو در این کارم آرزوست
بیدار ہر کہ گشت در ایران رود بدار — بیدار در زمانہ گانی بیدارم آرزوست
تجدید دورۂ ”سلطان حسین“ گشت — یک مرد نو چو ”نادر“ سردارم آرزوست
مارا سیاہ گاہ شا عارف اگرچہ راہ — بندہ و کیف ای پاک در بارم آرزوست

ملک الشعرا بہار مشہدی (م ۱۹۵۱ء) ملک الشعرا محمد تقی بہار کی کئی حیثیتیں ہیں: جملہ اصنافِ سخن میں اپنے وقت کے بے نظیر شاعر، سیاسی شاعر، فارسی نظم و نثر کے ناقد، صحافی، زبان شناس، استاد اور محقق۔ آپ کے

والدکا نام مرزا محمد کاظم صبوری تھا۔ صبوری اور بہار یکے بعد دیگرے مشہد شریف میں حضرت امام رضاؑ کے روضے کے "ملک الشعرا" رہے ہیں۔

بہار نے راہِ سیاست میں کافی مشکلات برداشت کیں لیکن ان کے قدم نہ ڈگمگائے اُنہوں نے "نوبہار" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا، اور جب حکومت نے اُسے بند کروا دیا تو آپ نے دوسرا اخبار "تازہ بہار" نکالا۔ بعد میں آپ نے "دانش کدہ" کے نام سے ایک ادبی اور سیاسی مجلّہ جاری کیا۔ یہ اخبارات اور مجلّہ آزادی کے نقیب رہے ہیں۔ بہار نے قاجاری دور میں اپنی زندگی کا کافی عرصہ قید میں بسر کیا۔ ایک سیاسی ہنگامے میں آپ کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ پہلوی دور کے آغاز میں آپ کی غیر معمولی بے باکی ایک سال قید و بند اور تہران سے اصفہان بدر ہونے کا موجب بنی۔ آخر آپ نے رضا شاہ پہلوی سے بالمشافہ گفتگو کی اور اپنی پوزیشن واضح کی۔ اس سے ان کا دورِ ابتلا ختم ہوا۔ بہار نے چند سال تک تہران یونیورسٹی میں تدریس کی اور بعد میں وزیر تعلیم رہے۔ آپ ایران کی ادبی اور علمی محافل کی روح رواں تھے اور آپ کا علمی پایہ اتنا بلند تھا کہ اب ایرانی اساتذہ ان کے بیان فرمودہ بعض مطالب کی توضیح میں لگے ہوئے ہیں۔

شاعری میں بہار نے جدید تجربات بھی دکھائے جو کامیاب رہے۔ آپ کی نظمیں ہماری درس گاہوں میں شامل ہیں۔ پاکستان اور علامہ اقبالؒ کی توصیف میں آپ نے محبت آمیز قصائد لکھے ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ دن اور مہینے کے لحاظ سے ان کا اور اقبالؒ کا یومِ وفات ایک ہی ہے (۲۱ راپریل ۱۹۵۱ء) آپ کی نثری تالیفات کا ذکر عصرِ پہلوی میں آئے گا۔ یہاں ان کی ایک سیاسی غزل کا انتخاب درج کیا جاتا ہے ؎

من نگویم کہ مرا از قفس آزاد کنید — قفسم بردہ بباغی و دلم شاد کنید
آشیانِ من بیچارہ اگر سوخت چہ باک — فکر ویران شدنِ خانۂ صیاد کنید
یاد این مرغِ گرفتار کنید ای مرغان — چون تماشای گل و لالہ و شمشاد کنید
شمع اگر کشتہ شد از باد مدارید عجب — یاد پروانۂ ہستی شدہ برباد کنید
کنج زندان شد اگر ہم وطنان سہم بہار — شکر آزادی و آن کنج خداداد کنید

پور داؤد رشتی (۱۸۸۶ء-۱۹۶۸ء)

استاد مرزا ابراہیم خان پور داؤد رشتی، جرمن اور فرانسیسی زبانیں بخوبی جانتے تھے وہ چند سال بمبئی میں رہے اور وہاں سنسکرت سیکھی۔ ایران کی قدیم زبانوں۔۔ فارسی باستان

پہلوی اور اوستا پر انہیں عبور حاصل تھا۔ ترکی اور عربی کا علم اس پر مستزاد تھا۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر انہوں نے ایران کی قدیم زبانوں اور ایرانی مذاہب پر تحقیقات کیں۔ آپ نے یورپ اور ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں میں تدریس کی۔ تہران یونیورسٹی میں بھی مدتوں پڑھاتے رہے۔ آپ ایک اچھے طبیب بھی تھے۔ ان سب خصوصیتوں کے علاوہ وہ آزادی کے نقیب رہے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران 'پور داؤد' نے کرمانشاہ سے "رستخیز" کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ یہ اخبار اگرچہ مختصر مدت کے لئے نکلا، مگر ملتِ ایران کو بیدار کرنے میں اہم کام کر گیا۔ پور داؤد نے ملی اہمیت کی متعدد نظمیں اور مقالات لکھے۔ وہ حقیقت میں "وطن پرست" تھے اور ایران کی قدیم و جدید چیزوں کے عاشق۔ قاچاری چونکہ ترکوں کے قبیلہ ترکمان سے منسوب تھے، اس خاطر پور داؤد کو اس غیر ایرانی خاندان سے بے حد نفرت تھی۔ احمد شاہ قاچار کی تخت نشینی کے موقع پر ان کے تاثرات ملاحظہ ہوں ؎

خاک بسر کن ز بہر تاج گزاری — یادت امروز شور و شیون و زاری
چشم امیدی بخاندان قجر نیست — کی دمد شورہ زار باد بہاری
احمد بیگانہ است گرچہ شدہ شاہ — نیست ز بیگانہ جز سیاہی و تاری
عاقبت کار گرگ زادہ شود گرگ — گلہ ز تمت بگرگ از چہ سپاری؟

قاچاری خاندان کے خاتمے پر آپ کی مسرت کا اندازہ مندرجہ ذیل چند ابیات سے ہو سکتا ہے ؎

از پیک زند آمد، ان گوش فرا دار
اورنگ شہی پاک شد از دیو تبہ کار
زین مژدہ عیدگاہ و خداوند سپاس آر
زین سلسلہ یک پادشہ دادگری کو؟
در کشور غارت زدگان سیم و زری کو؟
خشکیدہ و تفتیدہ زمین برگ و بری کو؟

کاحمد خدایان شد از تخت نگونسار
وز دامن زن در تکمن دودۂ قاجار
کز خلعت آن ننگ بجستیم دگر بار
نام آور و فرزانہ و مرد ہنری کو؟
توپ سپاہ و جوشن و خود و سپری کو؟
کو کشتہ و کو خرمن و کو گندم و انبار؟

معاصر پہلوی عہد

آخری قاچاری بادشاہوں کی مخالفت بہت بڑھ گئی تھی۔ حکومتِ مشروطہ کے حقوق ل

جانے پر گنگ فارغ نہ ہو سکے۔ ان بادشاہوں کی عیش و عشرت اور فضول خرچیاں حد سے بڑھ گئی تھیں۔ ملک گروی دیا جا چکا تھا، ناصر الدین شاہ کو قتل کر دیا گیا تھا، محمد علی شاہ کو تخت سے اتار دیا گیا تھا۔ آخری بادشاہ احمد شاہ قاجار کا فرنگیوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس افراتفری کے عالم میں ملکی امن و امان کا فقدان ہو چکا تھا۔ احمد شاہ فرانس بھاگ گیا اور اس کے قائم مقام محمد حسن مرزا کو ایران کی مجلس (قومی اسمبلی) نے نا اہل قرار دیا۔ ان حالات میں، جیسے کہ پہلے لکھ دیا گیا، رضا خان نے اقتدار سنبھال لیا اور ۱۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو اسمبلی نے انہیں "رضا شاہ پہلوی" کے لقب سے ایران کا شہنشاہ اور پہلوی خاندان کا بانی قرار دے دیا۔ یہ وہی شخصیت ہے جسے بعد از وفات ایرانی قوم نے "رضا شاہ کبیر" کا لقب دیا ہے۔

نئے اقدامات اور اصلاحات

نئے شہنشاہ نے ایرانی قوم کو وحدت بخشی۔ ملک میں امن و امان قائم کیا۔ مدارس، علمی اداروں اور دانش گاہوں کا آغاز کیا۔ فرہنگستان (اکادمی) قائم کر کے فارسی زبان و ادب کی تطہیر و ترقی کی خاطر قدم اٹھایا۔ بنگاہ نشر و ترجمہ قائم کیا جس کے ذریعے یورپ کے مختلف علوم و فنون کی کتابیں فارسی میں ترجمہ ہو کر چھپنے لگیں۔ شاہنشاہ نے علم و عالم، طلبا اور اساتذہ کے مقام کو مقام احترام بخشا اور اس طرح ایران کی "نشاۃ ثانیہ" کا آغاز ہوا۔

رضا شاہ پہلوی کو دوسری جنگ عظیم کے دوران ملک چھوڑنا پڑا اور آپ غریب الوطنی کے عالم میں جوہنسبرگ (افریقہ) میں ۲۶ جولائی ۱۹۴۴ء کو انتقال کر گئے۔ انہوں نے ایران کی غیر جانب داری کا اعلان کیا تھا مگر روس اور برطانیہ کی فوجیں ایران میں گھس آئیں اور اتحادی راہ جنگ اور تیل کی سپلائی کا مطالبہ کرنے لگے۔ ان حالات میں رضا شاہ مستعفی ہو گئے۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۱ء سے ایران کے نظام کو ان کے لائق سپوت محمد رضا شاہ پہلوی نے سنبھالا (ایرانی اب انہیں "آریا مہر" یعنی آفتاب ایران کے لقب سے یاد کرتے ہیں) اور اب تک اس ملک کی کایا پلٹی جا چکی ہے۔ شاہنشاہ آریا مہر اپنے والد کی روش کے مطابق، علم و ادب کے سرپرست اور مشوق رہے ہیں۔

نکتہ: شمسی یا خورشیدی سال ہجری

معاصر پہلوی عہد میں (اور اسی طرح معاصر افغانستان میں)، یہ سن رائج ہے۔ اس

تقویم کو حکیم عمر خیام نے، سلطان جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں ترتیب دیا تھا اور سعدی نے مقدمۂ گلستان میں اسے "سال جلالی" کہا ہے۔ عیسوی تقویم اور ہجری شمسی یا خورشیدی میں ۶۲۱ سال کا فرق رہتا ہے مثلاً اس وقت ۱۹۷۳ء ہے اور خورشیدی ۱۳۵۲۔

پہلوی دور کا سرمایۂ ادب

اس دور میں فارسی ادب ہر لحاظ سے دوسری زبانوں کے ادب کے برابر ہو گیا۔ اخبار، ہفت روزہ اور پندرہ روزہ اخبار، رسالوں اور مجلّوں، ماہنامہ، دو ماہی اور سہ ماہی کے ذریعے فارسی شعر و ادب کے سرمایہ میں نت نیا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کلاسیکی رنگ میں کہنے والے اور ہیئت میں نئے تجربے کرنے والے شعرا کا جداگانہ ذکر آ رہا ہے۔ اس عہد میں اتنے باکمال اساتذہ اور محقق پیدا ہوئے جن کی تخلیقات، تدقیقات اور تحقیقات کسی بھی زبان کے لئے باعثِ فخر ہو سکتی ہیں۔ اس مختصر کتاب میں ان باکمالوں میں سے صرف چند کا مختصر ذکر آ سکے گا۔

کلاسیکی رنگ کے مشہور شعرا

میرزادہ عشقی (م ۱۳۰۳ھ ش/۱۹۲۴ء) نام سید محمد رضا تھا، ہمدان کے رہنے والے تھے۔ فرانسیسی زبان خوب جانتے تھے کئی سال تک ایک فرانسیسی تجارتی فرم میں فرانسیسی سے فارسی میں مترجم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران عشقی ترکی چلے گئے اور دیگر رضا کاروں کے ساتھ حکومتِ عثمانیہ کو اپنی جنگی خدمات پیش کر دیں۔ مراجعت پر آپ نے تہران سے روزنامہ "قرن بیستم" جاری کیا۔ یہ اخبار ڈیڑھ برس تک جاری رہا۔ آپ ۳۱ سال کی عمر میں قتل کر دیئے گئے اور اس سازشی قتل کا راز فاش نہ ہو سکا۔ وہ آزادی خواہ شاعر تھے اور عمّالِ حکومت پر بے لاگ تنقید کرتے تھے، اس لئے قتل کروا دیئے گئے۔ آپ نے ہر صنفِ شاعری میں طبع آزمائی کی اور نثر میں بھی لکھا۔ بہار نے آپ کی موت پر کہا ہے

جوانی دلیر و گشادہ زبان | سخن گوی و دانشمند و مہربان
گشادہ دل و برگشادہ جبین | وطن خواہ و آزاد و نغز و گزین
چو بلبل نوایش ہمہ دردناک | گریبان جیبش چو گل چاک چاک
گل عاشقی بود و "عشقیش" نام | بہ عشق وطن خاک شد، والسلام

یہاں ہم عشقی کی نظم "دردِ دل" سے چند اشعار نقل کر رہے ہیں ؎

نو طلوع بہت جا دارید کہ خون می ریزد | قطرہ قطرہ دلم از دیدہ برون می ریزد
لیکن ایرانی امروز بہ نشر داد قیاس | شرف بیہدہ احزاب جنون می ریزد
دوران کہ سلاطین ہمہ ماتم زدہ اند | تسلیت از فلک بوقلمون می ریزد
پردۂ ماتم شاہان سلف "عشقی" دید | کانچہ در پردہ "بد" از پردہ برون می ریزد

فرخی یزدی (م ۱۳۱۸ ش/۱۹۳۹ء)

مرزا محمد فرخی یزدی ایسے بلند ہمت شاعر تھے کہ جیل کی چار دیواری میں بھی قاچاری استبداد کے خلاف ہنگامہ برپا کر رہے تھے۔ آخر مستبدوں نے ان کے ہونٹ سی ڈالے تاکہ بات نہ کر سکیں۔ بعد میں انہیں زہر کھلا کر ہلاک کر دیا گیا۔

فرخی نے شہر یزد میں مشروطہ اور آزادی خواہی کی نغمہ خوانی کی۔ ایک غزل میں کہتا ہے ؎

قسم بہ عزت و قدر و مقام آزادی | کہ روح بخش جہان است نام آزادی
ہزار بار بود بہ ز صبح استبداد | برای دستہ پابستہ، شام آزادی

فرخی ۱۹۰۰ء میں تہران آئے۔ اس سے قبل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے۔ یہاں آپ نے روزنامہ "طوفان" جاری کیا اور آزادی کی آواز بلند کی۔ آپ نے عراق اور روس کا سفر بھی کیا تھا۔ "مشروطہ" کی بحالی پر آپ یزد سے "مجلس" کے نمائندے مقرر ہوئے مگر پہلی جنگِ عظیم کے دوران قاچاری سلاطین کی وطن فروشانہ پالیسی کے خلاف لکھنے پر آپ کو ایک بار پھر جیل جانا پڑا۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

ہرگز دل ما ز خصم در بیم نشد | در بیم ز صاحبان دیہیم نشد
ای جان بفدای آنکہ پیش دشمن | تسلیم نمود جان و تسلیم نشد

ارکانِ حکومت پر انتقاد کرنا فرخی کا شیوہ تھا اس لئے رضا شاہ پہلوی کے دور میں اسے ابتلا کا وہ دور برداشت کرنا پڑا جس کی طرف شروع میں اشارہ ہو چکا۔

پروین اعتصامی (م ۱۹۴۱ء)

خانم پروین اعتصامی تبریزی، اس عہد کی معروف ترین شاعرہ ہے۔ پروین کے اشعار ہمارے ہاں مختلف کلاسوں کے درس میں شامل ہیں۔ ان کے کلام پر ناصر خسرو، حکیم سنائی، سعدی اور حافظ کے خاص اثرات نظر آتے ہیں۔ ان کے اخلاقی قطعات بے حد اثر انگیز ہیں۔ شاعرہ کی ازدواجی

زندگی ناکام رہی اور کوئی نو ماہ بعد اُسے شوہر سے طلاق لینا پڑی۔ اس ناکامی کے احساس نے اس کی شاعری کو شعلہ بار بنا دیا اور اس کے اشعار "از دل خیزد و بر دل ریزد" کا مصداق بن گئے۔ بہار نے آپ کی وفات پر کہا تھا ؎

کس کو عقدِ سخن را بہ لطف داد نظام | ز جمع پردگیان بی خلاف پروین بود

دیوانِ پروین تہران سے شائع ہو چکا۔ آپ کے اخلاقی اشعار کا نمونہ یہ ہے ؎

آن پارسا که ده خر و ملک است رہزن است | و آن پادشہ که مالِ رعیت خورد گداست
پروین بہ کجروان سخن از راستی چه سود | کو آنچنان کسی که نرنجد ز حرف راست

ادیب پیشاوری دم ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء)

سید احمد ادیب پشاور کا مولد پشاور ہے۔ نوعمری میں کابل گئے کچھ عرصہ وہاں رہے۔ افغانستان کے علماء سے استفادہ کرتے رہے۔ آپ نے ایران کے مختلف شہروں میں گزر کیا۔ سبزوار میں مشہد فلسفی ملا ہادی سبزواری سے استفاضہ کیا۔ زندگی کے آخری ۳۹ سال آپ نے تہران میں بسر کئے۔

ادیب غیر معمولی ذہین شخص تھے۔ فارسی و عربی زبانوں کے علاوہ آپ علوم معقول و منقول میں ماہر تھے اور لغت، منطق و فلسفہ، علم معانی، کلام، ریاضیات اور حکمتِ الٰہی کے استاد مانے جاتے تھے۔ انہوں نے کئی باکمالوں (جیسے استاد بدیع الزمان فروزانفر) کی تربیت کی۔ آپ فارسی کے علاوہ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور ان کا دیوان چھپ چکا۔ آپ کی مثنوی قیصر نامہ، دیوان سے سوا ہے۔ تاریخ بیہقی اور دیوان ناصر خسرو پر آپ نے حواشی بھی لکھے ہیں۔ آپ نے استعمار کے خلاف کافی لکھا، مگر اساساً آپ سیاسی اور روزمرہ ہنگامہ آرائیوں سے دور رہے۔ اس کے باوجود ترکوں اور عربوں کی حمایت میں آپ نے جو کچھ لکھا، وہ فن کسی دوسرے ایرانی شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔ نمونۂ کلام کے طور پر ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو ؎

سحر بوی نسیمت جان سپرم | اگر امان دہد امشب فراقِ تا سحرم
چنان بگذری خاک بر دو چشم من بگذار | قیاس کن که چہ ست از نثار خاک درم
گرفت عرصۂ عالم جمالِ طلعت دوست | بہر کجا کہ روم این جمال مینگرم
برغم فلسفیان بشنو این دقیقہ ز من | کہ غایبی تو و ہرگز نرفتی از نظرم
چنان نہفتم در سینہ داغِ لالہ رُخی | کہ شد چو غنچہ لبالب از خونِ دل جگرم

رشید یاسمی (م ۱۳۳۰ ش/۱۹۵۱ء)

رشید یاسمی کرمانشاہی، عربی، فرانسیسی، انگریزی اور ایران کی قدیم زبانیں خوب جانتے تھے، علوم منقول اور تاریخ کا مطالعہ ان کا مشغلہ رہا۔ ۱۹۳۳ء میں آپ تہران یونیورسٹی میں صدر شعبۂ تاریخ مقرر ہوئے۔ شاعری کے علاوہ آپ کو ترجمہ و تصنیف و تحقیق کا بے حد شوق تھا۔ شاعری میں ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قدیم رنگ میں نئے مضامین ادا فرماتے رہے۔ رشید یاسمی مختلف ادبی و علمی انجمنوں کے رکن و روح رواں تھے۔ "سعی و کوشش" کے موضوع پر ان کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

بسی دیو داری تو اندر کمین — چہ اندوہ و نومیدی و آز و کین
اگر کاہلی ابر تو گردد چیر — بفرسودن تو نپاید دیر
ورت تن بہ نبینہ کوشا بکار — بمانند نومید و آشفتہ وار
یکی پیشہ باید گزیدن کہ تن — زمانی نیاساید از تاختن
ز کوشش بجز شادی و خرمی — کرا نیست سرمایۂ آدمی

حبیب خراسانی (م ۱۹۳۸ء)

حاج میرزا حبیب اللہ مجتہد، صوفی اور عارف تھے، علوم منقول میں ماہر اور وعظ و ارشاد میں مصروف تھے۔ کچھ عرصہ فتویٰ نویسی اور قاضی امور شرعی رہے۔ آپ نے عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے۔ ان کی آخری عمر زہد و عبادت میں گزری اور مشہد میں انتقال فرمایا۔ آپ کے غیر معمولی حافظے میں ہزاروں اشعار موجود تھے، عربی اور فارسی لغت اور فلسفہ و منطق کی اہم کتابوں کے طویل اقتباسات انہیں ازبر تھے۔ ان کے ناصحانہ کلام کا نمونہ یہ ہے :

کس را مسنج جز بہ ترازوی خویشتن — وز کس مرنج نیز بہ جز خوی خویشتن
ای ہوشمند سوی رقیبان نظر مکن — چون آن کنی نظر فگنی سوی خویشتن
ای شیر مرد تا بکی از مدح روبہان — پیوستہ کور مانی از آہوی خویشتن
ہموارہ می بکوش ز تکاپوی کس ولی — غرہ مشو بہ سعی ز تکاپوی خویشتن

نظام وفا کاشانی (م ۱۳۴۴ ش/۱۹۶۵ء)

استاد نظام وفا، مذہبی خاندان کے ایک فرد تھے، فلسفہ اور علم ادب سے شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے تہران کے مختلف ہائی سکولوں میں پڑھایا، پھر وزارت زراعت میں شامل ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے اس وزارت خانے کے

سیکرٹری بن گئے۔ آپ مثنوی اور غزل کے استاد مسلم تھے۔ ان کے پندرہ ہزار اشعار کے مجموعے میں، اخلاق و عمل کا درس ملتا ہے۔ ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو :

برما زجفاکاری مردم ستمی نیست — از دل شکن آن را که دلی نیست، غمی نیست
سوگند بروی تو که ما اہل صفائیم — دلگی بما از این نبرد و زین بہ قسمی نیست
آن را که مسخر شود اقلیم قناعت — چون او بہ ہمہ کون و مکان محتشمی نیست
ما زندہ بہ چشتیم نگاہ ما و نہ سیم — عشق است وجودی که بپای آن عدمی نیست

رہی معیری تہرانی (م ۱۹۶۸ء)

نام محمد حسن تھا۔ آپ کو شعر، موسیقی، نقاشی اور دیگر فنون لطیفہ سے یکساں دلچسپی تھی۔ آپ نے سترہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ غزلیات زیادہ کہی ہیں۔ مشہور مصنف علی دشتی نے آپ کے دیوان "سایۂ عمر" پر مقدمہ تحریر کیا کہ :

" رہی معیری میدان غزل میں سعدی و حافظ کا کامیاب پیرو ہے مگر کہیں کہیں اس کی نازک خیالی سبک اصفہانی و ہندی کے شعرا کی یاد دلاتی ہے۔" رہی نے پاکستان، اہل پاکستان اور علامہ اقبالؒ کی توصیف میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ یہاں ہم ان کا ایک اخلاقی قطعہ نقل کرتے ہیں :

پاس ادب بہ حد کفایت نگاہ دار — خواہی اگر زبی ادبان یابی ایمنی
بالمرز خویشتن، ہر کہ نشیند بہ دوستی — با عزّ و حرمت خود، خیزد بہ دشمنی
در خون نشست غنچہ کہ شد ہمنشین خار — گردن فراخت سرو، ہر چیدہ دامنی
افتادہ باش لیک نہ چندانکہ ہمچو خاک — پامال ہر نہیرہ شوی از فروتنی

عباس فرات یزدی (م ۱۳۴۹ش/۱۹۷۰ء)

عباس فرات نے یزد، اصفہان اور تہران کے ہائی سکولوں میں تدریس کی پھر پولیس میں بھرتی ہو گئے مگر شعر و ادب سے تعلق برقرار رکھا۔ آپ تہران کی ادبی انجمنوں کے روح رواں رہے۔ آپ پرگو شاعر تھے۔ چھ دیوان یادگار چھوڑے ہیں ایک غزل کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یکدم تہی ز بادہ غم می فروش نیست — خالی بساط عیش ز جوش و خروش نیست
در ہم جہان ز بانگ نصیحت شدہ است پُر — دردا کہ در دو گوش نصیحت نیوش نیست
پیغام دوست می رسد از ہر جہت دگر — حاجت بہ قول ہاتف و بانگ سروش نیست

ما روز و شب بہ صحبت نوشین لبان خوشیم — دیگر مگو بہ بزم جہان عیش و نوش نیست
مستند کائنات، وفات، از غم نشاط — ہرگز تہی ز بادۂ غم می فروش نیست

رسا تہرانی مشہدی (پیدائش ۱۹۰۹ء)

ڈاکٹر قاسم رسا تہران میں پیدا ہوئے مگر کئی سال سے مشہد میں مقیم اور آستانۂ قدس رضوی کے ملک الشعراء ہیں۔ ملک الشعراء رسا نے جشنِ دین اور بزرگان دین کے بارے میں اشعار لکھے ہیں۔ اخلاقیات اور عشق و محبت پر مشتمل آپ کے قطعات بے حد معروف ہیں۔ استاد شہریار جن کا ذکر آگے آئے گا انہوں نے آپ کی تعریف میں کہا ہے:

دکتر کجا و بندۂ شرمندہ شہریار — کاو را سخن رسا بود، و نارسا مرا

ڈاکٹر رسا کو مسلمانوں، اور بالخصوص پاکستانیوں سے بے حد محبت ہے۔ علامہ اقبالؒ کے کلام سے آپ کو خصوصی موانست ہے۔ شاعرِ مشرق کی تعریف میں ان کا ایک قطعہ جس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ہمارے ہاں جزو درس رہا ہے ؎

سر زد از لاہور رخشان اختری — آنکہ پاکستان ہمی نامید بود
شاعر شیرین کلام و نکتہ سنج — عارفی روشن دل و پاکیزہ خو
شانہ زد از خامہ بر زلفِ سخن — تا بگوید راز پنہان مو بمو
در دل عشاق سوز خامہ اش — آتش عشق است ننشیند فرو

امیری فیروز کوہی (پیدائش ۱۹۰۹ء)

نام سید کریم ہے۔ عربی اور فارسی کے استاد و شاعر ہونے کے علاوہ محقق اور نقاد ہیں۔ آپ کی نظم "عرفان نامہ" اور مثنوی "مؤید نامہ" بے حد معروف ہے۔ "دیوان صائب" کو آپ نے محنت سے ایڈٹ کیا اور اس پر مفید مقدمہ لکھا۔ "سبکِ ہندی و دفاع از مکتب صائب" آپ کی زبردست انتقادی کتاب ہے۔ صائب کے علاوہ علامہ اقبالؒ بھی ان کے محبوب شعراء میں ہیں۔ امیری کی ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو ؎

بہ حالتی کہ منم حال را مجالی نیست — سخن بہ جد چہ گویم کہ ذوق و حالی نیست
گناہکاری از این بیشتر چہ می باشد — کہ یک جہان گنہست و انفعالی نیست
بہ زندگی چہ فراغ از خیال می طلبی — کدام خواب کہ آلودۂ خیالی نیست
حساب سال و جہت در دیار عشق نیست — در آن دیار کہ عشق است ماہ و سالی نیست
زمان آفتاب جہانتاب زندگی است امیر — ولی دریغ کہ در صحبتش کمالی نیست

ڈاکٹر مہدی حمیدی شیرازی (پیدائش ۱۹۱۴ء) آپ اس وقت تہران یونیورسٹی میں ادبیات کے استاد ہیں۔ اس سے قبل وزارت تعلیم اور فوج میں افسر رہ چکے ہیں۔ فارسی نثر و نظم میں آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف موجود ہیں:

الف۔ عروض حمیدی۔ فن عروض اور ردیف و قافیہ کے دقائق کے بارے میں ہے۔
ب۔ دریای گوہر (۳ جلد) اور ج۔ بہشت سخن (۲ جلد)، یہ پانچ جلد فارسی نظم و نثر کے انتخابات پر مشتمل ہے۔ د۔ اشک معشوق (مجموعۂ شعر)، ڈاکٹر محمد علی اسلامی ندوشن نے اس کتاب پر مفصل مقدمہ تحریر کیا ہے۔ حمیدی کے اشعار کا نمونہ درج ذیل ہے:

آمد خزان و بر رخ گل رنگ و بو نماند — در گل بجز حکایت رنگ و سبو نماند
در پای گل که آن همه آواز بود و بانگ — جز بانگ برگ و زمزمهٔ رزم جو نماند
ای آرزوی من، همه گلها ز باغ رفت — غیر از خیال روی تو ام در برو نماند
چیزی به روزگار بماند ز هر کسی — از ما به روزگار به جز آرزو نماند
بادی زمین بپرس و زمین یاد کن شبی — زآن پیشتر که پیکر او گوی نیز او نماند

مہرداد اوستا بروجردی (پیدائش ۱۹۲۷ء) نام محمد رضا رحمانی ہے۔ اوستا سبک خراسانی میں شعر کہتے ہیں۔ آپ معتدل مزاج ہیں اور وقتی ہنگاموں سے متاثر ہو کر کم لکھتے ہیں۔ حماسی اور رزمی اشعار لکھنے میں آپ طاق ہیں۔ "حماسۂ آسیا" (یعنی بر اعظم ایشیا کا رزمیہ) آپ کی ایک بڑی طویل نظم ہے۔ اوستا مختلف ادبی اور علمی مجلوں میں اشعار اور مضامین چھپواتے رہتے ہیں۔ سلمان ساوجی کا دیوان بھی آپ نے مرتب کر کے شائع کروایا ہے۔ یہاں ہم آپ کے "حماسۂ آسیا" کا افتتاحی بند نقل کر رہے ہیں ؎

آسیای باختر را فتنه در خاور شکسته — تیغ ها رایت گشوده، جنگ با لشکر شکسته
فتنه را کشتی در این دریای پهناور شکسته — مرگ را اختران گسسته، پای بیوه پر شکسته
زین به طوفان بادبان گشوده دیگر شکسته — زنجی اسکان گرفته، زنجی محور شکسته

سیمین بہبہانی تہرانی (پیدائش ۱۹۲۷ء) آپ روزنامۂ "اقدام" کے مدیر اور "تاریخ اسلام" کے مشہور مؤلف عباس خلیلی مرحوم کی بیٹی ہیں۔ سیمین تہران کے ہائی اسکولوں میں پڑھاتی رہی ہیں اور ساتھ

ساتھ مختلف روزناموں اور ہفتگی رسالوں میں کلام لکھتی رہیں۔ آپ غزل اچھی کہتی ہیں۔ آپ کے اخلاق آمیز اشعار کا بیشتر خطاب عورتوں سے ہے۔ ایک طویل قطعہ میں آپ نے صنفِ نازک کے وظائف گنے ہیں۔ اس قطعہ کا آخری حصہ بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے:

ای زن به اتفاق کنون می کوش   کز تنگنای جهل برون آئی
بند نفاق، پای تو بندد   این بند را بکوش که بگشائی
تنگ است در صف ترقی جان   تا هم تو کم به تنگ شیا لائی
تا خود ز خواب شوم چه بنشینی   تا خود به پاسخم چه بفرمائی

شاعری میں ہیئت کے نئے تجربے

ناصر الدین شاہ قاچار کے دور میں ایران اور اہلِ یورپ کے درمیان روابط کی استواری کا ذکر ہو چکا، بازگشتِ ادبی کے دور کی طرف اشارہ ہو چکا۔ اس دور اور قدما کی روش کی طرف لوٹنے کی کوشش کے ادبی فوائد مسلّم ہیں مگر عصری تقاضے مجبور کرتے تھے کہ مسائلِ حاضرہ پر بھی لکھا جائے۔ ادیب الممالک فراہانی، سید اشرف حسینی، علی اکبر دہخدا اور ملک الشعراء بہار وغیرہم نے قدیم روش کی اندھا دھند تقلید کرنے اور لکیر کا فقیر بننے کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے اشعار میں "مشروطہ" اور "ملیت ایران" جیسے تازہ مضامین پیش کئے۔ انہوں نے فارسی میں یورپ کی زبانوں (جیسے جرمن اور فرانسیسی) کے الفاظ کے استعمال کو، تحولِ زبان کے اصول کے مطابق، مستحسن قرار دیا۔ بہار، عارف قزوینی، میرزادہ عشقی اور کئی دوسروں نے "تصنیف" (عوامی سرود) لکھیں اور اہلِ وطن کا خون گرمایا۔ ان شعراء نیز رشید یاسمی اور یحییٰ دولت آبادی نے عروض کی پابندی کے باوجود شعر کی نئی ہیئت اور جدید قالب استعمال کئے اور دوسروں کے لئے نمونے فراہم کئے۔ بمثال کے طور پر بہار کے ایک قطعہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ ایسے دو شعر مقدمۂ گلستانِ سعدی میں بھی موجود ہیں:

بیائید ای کبوترهای دلخواه   بدان کافور گون پاها، چو شنگرف
بپرید از فراز بام و ناگاه   به گرد من فرود آئید چون برف

بہار نے اس طرح کی متعدد جدتیں دکھائی ہیں مگر شعر کی ہیئتِ نو کا حقیقی انقلاب نیما یوشیج (م ۱۹۵۹ء) لائے ہیں۔ نیما کے مقام شاعری کے بارے میں اختلاف ہے،

مگر ان کے شعرِ نو کے بانی ہونے کے بارے میں کسی کو کلام نہیں۔ نیما یوشیج نے شعر کے مصارع برابر ہونے کے اصول کو مسترد کر دیا اور کلماتِ شعر کے ہم آہنگ و ہم صدا ہونے کو کافی جانا۔

حالات اور نمونۂ کلام

نیما یوشیج کا نام "علی" تھا۔ آپ طبرستان کے کوہستانی اسفندیاری قبیلہ "یوش" کے ایک فرد تھے اور اسی خاطر طبری لہجے کے مطابق اپنے آپ کو اس قبیلے سے منسوب کیا ہے "یوشیج = یوشی"۔ "نیما" کا تخلص آپ نے ۲۹ سال کی عمر میں اختیار کیا (۱۹۲۱ء)۔ آپ نے طبرستان اور تہران میں تعلیم حاصل کی۔ فرانسیسی زبان محنت سے سیکھی اور استاد نظام وفا سے مشورۂ سخن لیا۔ نیما ابتداً میں سبکِ خراسانی کے شاعر تھے مگر جوانی میں فرانسیسی ادب کے گہرے مطالعے کے زیرِ اثر وہ ہیئتِ شعر میں تبدیلیوں کا سوچنے لگے۔ ان کے اشعارِ نو "قرنِ بیستم" اور "نوبہار" نامی اخباروں میں چھپتے رہے مگر ۱۹۳۰ء تک وہ پرانی روش کے بھی قائل تھے۔ آپ خلوت پسند شخص تھے مگر حیدر علی کمال، ملک الشعرا بہار، احمد اشتری اور علی اصغر حکمت ایسے فضلا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ مثنوی رومی کے آپ عاشق تھے اور اس عظیم کتاب کو محافل میں خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے مگر مذکورہ سال میں جب مجلۂ "موسیقی" کے ارکانِ تحریر میں شامل ہوئے تو قدیم روشِ شعر کو گویا خیرباد کہہ دیا۔

نیما یوشیج نے اپنا نیا "ترتیب" شاعری میں دکھائی ہے۔ ان کے اشعار موزوں ہیں اور فارسی کے قدیم اوزان پر ان کے اشعار کا ہر مصرع پورا اترتا ہے۔ ان کے "مستزادات" میں مصرعے نابرابر ہیں مگر ہر ایک میں وزن موجود ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

می تراود مہتاب	می درخشد شب تاب
وزن: فاعلاتن فع لات	فاعلن فع لات
نیست یک دم شکند خواب	بہ چشم کس ولیک
وزن: فاعلاتن فعلاتن	فعلات فعول

یا مثلاً ـــ

غم این خفتۂ چند	خواب در چشم ترم می شکند
وزن: فعلاتن فعلات	فاعلاتن فعلن فاعلاتن

یہ سب وزن بحرِ رمل کے افاعیل کی رو سے درست ہیں۔ ایک دوسرے قطعے

کے دو ابتدائی شعر یوں ہیں ؎

ای آدمہا کہ بر ساحل نشستہ شاد و خندانید — یک نفر در آب دارد می سپارد جان
یک نفر دارد کہ دست و پای دائم می زند — روی این دریای تند و تیرہ و سنگین کہ میدانید

نیما یوشیج کے مذکورہ اشعار "شعرِ آزاد" کہلاتے ہیں۔ "شعرِ سپید" (بلینک ورس) میں البتہ وزن، قافیہ اور افاعیل عروضی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسے "نثر" اور ذاتی "شعر" کہا جا سکتا ہے۔

نیما یوشیج، آستارا کے حکیم نظامی ہائی سکول میں مدتوں پڑھاتے رہے۔ "افسانہ" ان کی ایک طویل نظم ہے جو پانچ پانچ مصرعوں کے ۱۲۰ بندوں پر مشتمل ہیں۔ اس نظم کے بندوں کا پہلا اور تیسرا، اور دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہیں، جب کہ پانچواں مصرع آزاد ہے۔ ان کے متعدد مقالے بھی چھپ چکے۔ ان کی کئی نظمیں انگریزی، اردو اور فرانسیسی میں ترجمہ ہو چکیں۔

سیاوش کسرائی (پیدائش ۱۹۲۵ء)

قانون کے گریجوایٹ ہیں اور نیما یوشیج کے مقلد۔ "آرش کمانگیر"، "آوا" اور "خون سیاوش" کے عنوانات سے ان کے تین مجموعہ ہائے کلام چھپ چکے۔ ان کی فکر اور قوتِ مشاہدہ قابلِ داد ہے۔ موسم سرما، سیمرغ اور درخت عام موضوعات ہیں مگر سیاوش نے ان پر لاجواب نظمیں لکھی ہیں۔ "درخت" پر آپ کے آزاد اشعار ان کی نظم کی ابتدا سے نقل کرتے ہیں ؎

تو قامت بلند تمنائی ای درخت — ہموارہ خفتہ است در آغوشت آسمان
بالائی ای درخت — دستت پر از ستارہ و جانت پر از بہار
زیبائی ای درخت — وقتی کہ بادہا
در برگہای در ہم تو لانہ می کنند — غوغائی ای درخت
وقتی کہ چنگ وحشی باران گشودہ است

بامداد (پیدائش ۱۹۲۵ء)

نام احمد شاملو تہرانی ہے۔ خوش فکر اور فاضل شاعر ہیں۔ نیما یوشیج اور ان کے مکتبِ فکر سے منسلک ہیں۔ پر نویس شخص ہیں۔ افسانوں، ڈراموں، مقالات اور مختصر داستانوں (ترجمہ از فرانسیسی) کے لکھنے کے علاوہ، پانچ شعری مجموعے ترتیب دے کر طبع کروا چکے ہیں۔ آپ کے اشعار میں عوامانہ الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر "شعر" کے موضوع پر ان کی ایک طویل

آزاد نظم کا ابتدائی بند نقل کر رہے ہیں ؎

موضوع شعر شاعر پیشین — از زندگی بود
در آسمان خشک خیالش او — جز با شراب و یار نمی کرد گفتگو
او در خیال بود شب و روز — در دام گیسوی مشکی معشوقہ پای بند
حال آنکه دیگران — "دستی به جام باده و دستی به زلف یار"
مستانه در زمین خدا نعره می زدند

فریدون مشیری تہرانی (پیدائش ۱۹۲۶ء) مشیری بھی نیما یوشیج کے ہم خیال ہیں آپ محکمۂ ڈاک و تار کے ایک افسر ہیں قدما کے رنگ میں بھی شعر کہتے ہیں مگر باعث شہرت ان کی آزاد شاعری ہے۔ کلام کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں اور مجلات و اخبارات میں ان کی آزاد نظمیں اکثر شائع ہو رہی ہیں نمونے کی خاطر نظم "مرگ" کے افتتاحی ابیات ملاحظہ ہوں ؎

چرا از مرگ می ترسید — چرا زین خواب جان آرام شیرین روی گردانید؟
چرا آغوش گرم مرگ را افسانه می دانید — چرا زین خواب جان آرام شیرین روی گردانید؟
به بام خاطر من می کند پرواز — سپید اندر بوم ناامیدی باز
مگوئید این سخن تلخ و غم انگیز است

ہوشنگ ابتہاج سایہ (پیدائش ۱۹۲۷ء) "سایہ" کبھی ہ۔ ا۔ سایہ" کو تخلص کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی آزاد شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے۔ آزاد غزل بھی لکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ان کی نظم "رستاخیز" سے ماخوذ ہیں ؎

بپا برخاستم پرورده خشم آورده — نه با گنجینۂ رنجیه
دست آزادی — نگاهم شعله خیز کوره آتش فشان خشم
دهن لبریز خشم و دشمنی فریاد
بپا برخاستم — دشمن جاده بر دل خون باد

فریدون توللی شیرازی (پیدائش ۱۹۲۷ء) توللی معروف معاصر شاعر ہیں اور ان کا کلام ہماری بعض درسی کتب کا جزو ہے۔ آپ نے شیراز اور تہران میں تعلیم حاصل کی۔ آثار قدیمہ سے بڑی دلچسپی

ہے اور شیراز میں اسی محکمہ کے سربراہ ہیں۔ قدیم رنگ میں خاصے کے شعر کہتے رہے مگر ایک عرصہ سے وہ رنگ ترک کر دیا اور پیروانِ نیما میں شامل ہو گئے۔ اب تک کلام کے چار مجموعے چھپ چکے۔ دو مجموعے "کاروان" اور "القناعیل" قطعات کا مجموعہ ہیں جن میں آپ نے معاشرتی مسائل پر اظہار فکر کیا ہے۔ نمونے کی خاطر نظم "موج مرگ" کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گیرودار یست در این جان غبار آلود	ہیچ و دانائی است و دین مغز ہوس پرداز
گیرو داری کہ از این پس بہ کہ بندم چہر	ہیچ و دانائی کہ از این پس بہ کہ گوییم راز
ہمہ بیزاری و بیزاری و بیزاری	ہمہ ناکامی و نادانی و رسوائی
ہمہ افسوس کنان از غم بی چہری	ہمہ اندوہ بہ جان از تب تنہائی

مندرجہ ذیل دو شعر نظم "فردای انقلاب" کا ابتدائیہ ہیں :

فردای انقلاب، پر جوش و پر خروش	از نقطہ ہای دور رای آیدم بگوش
می گیردم قرار، می بخشیدم امید	می آردم بہ ہوش

امید مشہدی (پیدائش ۱۹۲۸ء)

نام مہدی اخوان ثالث ہے۔ تعلیم مشہد اور تہران میں حاصل کی۔ فنی صنعتی تعلیم میں آپ کا تخصص ہے۔ وزارت فرہنگ و ہنر ایران میں ایک افسر رہے ہیں۔ پہلے غزل، قصیدہ اور مثنوی کہتے رہے۔ اب نیما یوشیج کے رنگ میں کہتے ہیں۔ البتہ اپنے اشعار میں وزن رکھنے کے قائل ہیں۔ امید، لفظ و معنی کا حسن قائم رکھنے کے لئے بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ نئے رنگ کی ان کی ایک غزل کا انتخاب دیکھئے :

ای تکیہ گاہ و پناہ	زیباترین لحظہ ہای
پر عصمت و پر شکوہ	تنہائی و خلوت من
ای شط شیرین پر شوکت من	ای با تو من گشتہ بسیار

نظم "میراث" کا ابتدائیہ بھی نمونے کی خاطر نقل کیا جاتا ہے ؎

پوستینی کہنہ دارم من	یادگاری ژندہ پیر از روزگارانی غبار آلود
سالخوردی جاودان مانند	مانده میراث از نیاکانم مرا، این روزگار آلود
جز پدرم آیا کسی را می شناسم من	کز نیاکانم سخن گفتم

نادر نادر پور (پیدائش ۱۹۲۹ء)

نادر معاصر آزاد شاعری کے غالباً مشہور ترین فرد ہیں۔ مختلف اخبارات و مجلات میں آپ کے اشعار بڑی نمایاں صورت میں چھپ رہے ہیں، چشم ہا و دستہا، دختر جام، سرمۂ خورشید اور دختر جام نام کے چار مجموعہ ہائے کلام چھپ چکے۔ نادر، آزاد کے علاوہ سپید شعر، (بلینک ورس) کے دلدادہ ہیں۔ شعر سپید نے ان کے دم سے ہی زیادہ رواج پایا ہے۔ اس دوسری قسم کے شعر میں عروضی وزن، قافیہ اور ردیف میں سے کسی چیز کی پروا نہیں کی جاتی۔ نادر، فرانسیسی ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں، کلاسیکی اشعار خوب کہتے ہیں ان کے تحقیقی اور ادبی مقالے بھی بڑے اہم رہے ہیں۔ یہاں ہم "شعر نو" کی مناسبت سے نادر کی نظم "نیایش" (عبادت) کا آغاز نقل کرتے ہیں سے

ای آفریدگار ۔

فروغ فرخ زاد تہرانی (پیدائش ۱۹۳۴ء)

نیما یوشیج اور نادر پور کی ہمنوا ہیں۔ ان کا موضوع مرد و زن کی مساوات اور عورتوں کی حمایت ہے، اسیر، دیوار، عصیان اور تولدی دیگر کے عنوانات کے تحت ان کلام کے چار مجموعے اب تک چھپ چکے ہیں۔ ان کی ایک نظم کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔ یہ ایک خوش فکر رفیق حیات مل جانے کے بارے میں "خواب" کا جزو ہے اور نظم کا عنوان بھی "خواب" ہے سے

باامیدی گرم و شادی بخش	بانگاهی مست و رویائی
دخترک افسانه می خواند	نیمه شب در کنج تنهائی
بی گمان روزی ز راهی دور	می رسد شهزاده ای مغرور
می خورد بر سنگ فرش کوچه های شهر	ضربهٔ سم ستور بادپیمائش
می درخشد شعلهٔ خورشید	بر فراز تاج زیبائش

تا دو پود جامه اش از زر

معاصر فارسی ادب پر ایک عمومی تبصرہ

معاصر فارسی ادب، ترقی یافتہ دیگر زبانوں کے ہم پلہ ہے مختلف موضوعات پر لکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل زبانوں میں سے تین یا چار بلکہ زیادہ پر حاوی ہیں، ترکی عربی، روسی، فرانسیسی، انگریزی، جرمن، ہسپانوی، یونانی، اطالوی، سویڈن اور چینی وغیرہ

ایران کی قدیم زبانوں ۔ ۔ ۔ اوستا، فارسی باستان اور پہلوی نیز بعض ہند آریائی زبانوں کے بارے میں بعض کا علم اس پر مستزاد ہے۔ مختلف زبانوں کے ادب جو فرہنگ سے آشنا لوگ مسلماً اپنے ادب کو غنی تر کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر جلال متینی نے نثر فصیح فارسی معاصر (ج ۱) بالترتیب عباس اقبال آشتیانی (م ۱۹۵۵ء) ذکاء الملک محمد علی فروغی (م ۱۹۴۲ء) مجتبیٰ مینوی (پیدائش ۱۳۲۰ھ) ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری (پیدائش ۱۹۱۳ء) اور سعید نفیسی (م ۱۹۶۶ء) کی نگارشات جمع کی ہیں۔ اس فہرست میں استاد بدیع الزمان فروزانفر مرحوم، ڈاکٹر علی اصغر حکمت، استاد جلال الدین ہمائی، ڈاکٹر محمد معین مرحوم، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، ڈاکٹر محمد جعفر محجوب وغیرہ جن کے نام یک کتاب معنون کی گئی، ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی، ڈاکٹر سید جعفر شہیدی اور ڈاکٹر عبد الحسین زرین کوب اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔

فارسی ادب کے مجلے تہران، مشہد، تبریز، اصفہان اور شیراز کی یونیورسٹیاں پابندی سے نکال رہی ہیں: مشرق، اور مہر، تہران سے شائع ہونے والے معروف مجلے تھے ارمغان، یغما، آموزش و پرورش، ہنر و مردم، وحید، راہنمائے کتاب، تلاش، موسیقی اور سخن فارسی زبان و ادب کے قابل قدر معاصر مجلے مانے جاتے ہیں، آخر الذکر مجلہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے ذریعے دنیائے ادب کی رفتار ترقی معلوم کرنے میں آسانی رہتی ہے۔

مختصراً یہ کہ ادبی تحقیق، تخلیق شعر و ہنر، ادبیات تطبیقی، زبان شناسی، لغت نویسی، تحقیق لسانیات، تنقید اگرچہ اس کا ابھی اب تک تیز نہیں ہو سکا، ناول و رومان و افسانہ لکھنے، شعر کی کلاسیکی روایات اپنائے رکھنے اور جدت طرازیوں میں، ادب فارسی کا معاصر عہد، قدیم سے ممتاز تر ہوتا جا رہا ہے۔

فارسی ادب برصغیر پاک و ہند میں

ایران اور برصغیر پاک و ہند کے تعلقات کی تاریخ تو اتنی ہی قدیم ہے جتنے قدیم خود یہ ممالک ہیں۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کی تحقیقات کے مطابق تو یہ روابط آریائی تمدن سے پہلے بھی قائم تھے۔ اور ہندوستان آنے والے آریہ تو ایران میں کافی عرصہ گزار کر یہاں آئے۔

رگ وید میں ایران اور اوستا میں ہندوستان کے بارے میں اشارات ملتے ہیں۔ سنسکرت اور ایران قدیم کی زبانوں میں ایک طرح کی مشابہت نظر آتی ہے ہخامنشیوں سے ساسانیوں تک ایرانی ہر دور میں تھوڑا بہت عرصہ شمالی ہند کے کسی نہ کسی حصے پر ضرور قابض رہے۔ اس لئے برصغیر کا یہ حصہ خاص طور پر سیاسی، اور تمدنی طور پر ایران کے زیر اثر رہا۔ لیکن جہاں تک فارسی زبان کی ہندوستان میں آمد کا تعلق ہے تو وہ مسلمانوں کے ساتھ ہی یہاں آئی۔ لیکن بعض محققین کے نزدیک ہندوستان میں فارسی مسلمانوں کی آمد سے پہلے موجود تھی۔

"پنڈت برجموہن کیفی نے لکھا ہے۔ ہندوستانی راجاؤں کے مسلمان حکومتوں کے ساتھ سیاسی روابط تھے۔ ان کے دیوان رسائل میں فارسی نویس ہندو موجود تھے۔ دوسرے انہوں نے خروشتی خط اور ماگدھی زبان میں پائے جانے والے بدھ عہد کے ایک کتبے کا ذکر کیا جو بلوچستان میں تورڈھیری کے مقام پر پایا گیا ہے۔ اس میں شاہی کا لفظ بادشاہت اور حکومت کے معنوں میں آیا ہے۔ ہندو راجاؤں کے دربار میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہمیں فارسی نویس ہندوؤں کی موجودگی کے بارے میں کوئی ٹھوس تاریخی دلیل نہیں ملتی۔ علاوہ ازیں دول اسلامی کی زبان سلطان محمود کے زمانے تک عربی رہی۔ اس لئے ہندوؤں کے دربار میں فارسی جاننے والوں کا وجود قرین قیاس نہیں۔ ماگدھی زبان کے کتبے میں ایک لفظ شاہی کے استعمال سے یہ نتیجہ نکالنا بھی درست نہیں کہ فارسی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں موجود تھی۔ کیونکہ اپنے اصطلاحی معنوں میں تو فارسی اس وقت تک ایران میں بھی موجود نہیں تھی۔ خان آرزو نے فارسی اور سنسکرت کو متحد الاصل زبانیں ثابت کیا ہے۔ ان دونوں آریائی زبانوں میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ اس لئے آنجہانی کیفی صاحب سے اس سلسلے میں اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) ڈاکٹر محمد باقر صاحب کا خیال ہے۔ فارسی ہندوستان میں پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں آئی۔

(۱) کیفیہ مطبوعہ ۱۹۵۰ء لاہور، جلد ۱، ۲۰

(۲) یادنامہ ایرانی مینورسکی ۱۹۶۹ء تہران ص: ۵

اس زمانے میں ایران اور برصغیر کے شمالی علاقوں پر کشان حکمران تھے۔ اور پرش

پورہ (موجودہ پشاور) ان کا پایۂ تخت تھا۔ لیکن پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں نیز ایسے ہی کئی دیگر نام شامل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ حضرات تصنیف و تالیف کے اعتبار سے ایران میں فارسی زبان ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی۔ اور اس زمانے میں وہاں پہلوی زبان کا دور تھا۔ دوسرے یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ کشان فارسی یا پہلوی بولتے تھے اور ان کی اپنی زبان کوئی نہ تھی۔ بعض محققین کے نزدیک ان کی زبان پشتو تھی۔ اس لئے یہ کہنا بھی درست نہیں کہ فارسی کشانی عہد میں ہندوستان آئی۔

(۱) ایرانی فاضل ڈاکٹر رضازادہ شفق نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان میں فارسی کی اشاعت میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آنے والے پارسیوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی زیادہ درست نہیں معلوم ہوتی۔ ایک تو اس لئے کہ ایران سے آنے والے پارسیوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ وہ گجرات کاٹھیاواڑ کے مقامی ماحول میں جذب ہو کر رہ گئے۔ بمبئی کی ڈاکٹر جیرواوالا نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ پارسی آبادکاروں کو گجرات میں جن شرائط کے تحت آباد ہونے کی اجازت ملی ان میں یہ بات بھی شامل تھی کہ انہیں گجراتی زبان سیکھنی پڑیگی اس طرح پارسیوں کا دین تو بچ گیا لیکن انہیں اپنی زبان سے دستبردار ہونا پڑا۔ ان حالات میں فارسی کی اشاعت میں ان کا کیا رول رہ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فارسی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان آئی۔ اور انہی کوششوں سے یہ برصغیر میں پھیلی۔

مسلمان سب سے پہلے مکران و سندھ آئے۔ اور فارسی زبان بھی پہلے انہی علاقوں میں آئی۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم کی فوج میں ایرانی بھی شامل ہوں گے۔ کیونکہ حملہ آور ہونے سے پہلے اس نے تیاری کے لئے اپنا کیمپ کئی ماہ تک شیراز میں رکھا تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں ابن حوقل، مقدسی اور اصطخری نے مکران سے ملتان تک فارسی زبان کے رواج کا ذکر کیا ہے۔ شاید عربی تمدن کے غلبہ کی وجہ سے سندھ میں فارسی زبان فروغ نہ پا سکی۔ اس شیریں زبان کو ہندوستان میں پھیلانے کی سعادت غزنویوں کے حصے آئی۔

غزنوی دور

ہندو راجاؤں کے ساتھ غزنویوں کا پہلا تصادم ۳۶۹ھ/۹۷۹ء میں امیر

سبکتگین کے عہد میں ہوا۔ اور پھر معرکہ آرائی کا یہ سلسلہ سلطان محمود کے ہندوستان پر متعدد حملوں اور اس کے جانشینوں کی یلغاروں کی صورت میں جاری رہا۔ اس دوران سبکتگین نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ اور سلطان محمود کے زمانے میں ۴۱۸ھ میں سرحد اور پنجاب کا علاقہ سلطنت غزنی کا حصہ بن گیا۔ لاہور غزنویوں کے ہندوستانی مقبوضات کا صدر مقام بنا۔ غزنی سے لاہور کے لئے سپہ سالار یا نائب مقرر ہو کر آتے رہے۔ ۴۲۸ھ میں سلطان مسعود نے اپنے بیٹے شہزادہ مجدود کو لاہور کا نائب السلطنت اور ایاز کو اس کا نگران مقرر کیا۔ اس کے بعد غزنوی شہزادے اور امراء اس منصب پر فائز ہوتے رہے۔ پہلے سلاجقہ اور پھر غوریوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے غزنویوں کو غزنی چھوڑنے اور لاہور میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ خسرو شاہ نے ۵۵۵ھ میں لاہور ہی میں وفات پائی۔ آخری غزنوی بادشاہ خسرو ملک کے مراسم تاجپوشی بھی لاہور ہی میں انجام پائے۔ شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں ۵۸۲ھ میں اس کی اسیری کے ساتھ ہندوستان سے غزنویوں کے اقتدار کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اس عہد میں لاہور کو بڑی ترقی اور اہمیت نصیب ہوئی۔ ہزاروں خاندان غزنی اور ایران کے دوسرے حصوں سے ترک وطن کر کے یہاں آباد ہو گئے۔ ان میں صوفیاء علماء اور شعراء بھی شامل تھے۔ ان کی آمد سے یہاں فارسی زبان کا رواج ہوا۔ دربار لاہور کے علم دوست اور ادب پرور وزراء و امراء کی بدولت لاہور بہت جلد ایک علمی و ادبی مرکز بن گیا۔ جس کی کشش سے لوگ اس شہر کی طرف جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ برصغیر میں فارسی شاعری کا سرچشمہ لاہور ہی سے پھوٹا۔ غزنوی عہد میں لاہور کو وہ رونق ملی کہ یہ شہر "غزنین خورد" کہلانے لگا۔

برصغیر میں غزنوی دور کے شعراء

فرخی، عنصری اور عسجدی وغیرہ فارسی کے وہ اولین شعراء ہیں جنہوں نے برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہ شعراء سلطان محمود کی اکثر یلغاروں میں اس کے ساتھ ہندوستان آئے۔ اور انہوں نے محمود کی جنگوں کا حال اپنے قصیدوں میں بیان

کیا۔ فرخی اور عنصری نے سومنات کی فتح پر شاندار قصیدے کہے لیکن یہ شعرا برصغیر میں پیدا ہوئے۔ نہ یہاں انہوں نے سکونت اختیار کی۔ اس لئے ان سے قطع نظر کرکے ان شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے جو یہاں پیدا ہوئے یا یہاں مقیم ہوئے۔

لاہور کا پہلا شاعر جس کا نام تذکروں میں ملتا ہے۔ ابو عبداللہ روزبہ بن عبداللہ النکتی ہے۔ سلطان مسعود ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء کی شان میں اس کے ایک قصیدے کے چند اشعار لباب الالباب میں نقل کئے گئے ہیں۔ غزنوی امراء میں مندرجہ ذیل کا ذکر عوفی نے شعرائے لاہور میں کیا ہے۔

(۱) قوام الملک نظام الدین ابو نصر ہبۃ الفارسی (۲) العمید الاجل عطاء بن یعقوب الکاتب (۳) الصدر الاجل ملک الکتاب جمال الدین ابو المحاسن یوسف بن نصر اللہ الکاتب (۴) شہاب الدولہ والدین محمد بن رشید (۵) امیر العمید ثقۃ الدین جلال الفلاسفہ یوسف بن محمد دربندی (۶) ابو المعالی نصر اللہ بن محمد بن عبدالحمید (۷) ضیاء الد۔۔ بن عبدالرافع بن ابی الفتح ہروی (۸) ابوبکر بن المساعد خسروی۔

ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان جو فارسی شاعری کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان دونوں شاعروں کا تعلق اسی دور سے ہے

ابوالفرج رونی

ابوالفرج بن مسعود رونہ کا رہنے والا تھا۔ لیکن اس رونہ کے محل وقوع کے بارے میں محققین کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض ایرانی فضلا اسے نیشاپور کا ایک قصبہ بتاتے ہیں۔ عوفی نے رونہ کو ضلع لاہور کا ایک قصبہ لکھا ہے۔ لیکن اس نام کے قصبہ کا سراغ کہیں نہیں لگ سکا۔ ڈاکٹر صفا رونہ کو نیشاپور ہی کا ایک قصبہ سمجھتے ہیں۔ مگر ان کے نزدیک رونی کی ولادت اور پرورش لاہور ہی میں ہوئی۔ لیکن وہ اپنے

اصلی وطن رونہ کی مناسبت سے رونی مشہور ہوا۔ ابوالفرج سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی (۴۵۱ھ - ۴۹۲ھ) اور سلطان مسعود بن ابراہیم (۴۹۲ھ - ۵۰۸ھ) اور ان کے امراء کی مدح کرتا رہا۔ مسعود سعد سلمان کے ساتھ رونی کے تعلقات بڑے خوشگوار رہے مسعود سعد کے دیوان میں ابوالفرج کے بارے میں ایک قطعہ شکایت بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ اسی کنیت کے ایک اور شخص ابوالفرج نصر بن رستم کے بارے میں ہے۔ رونی کی زندگی

کا زیادہ تر حصہ لاہور ہی میں بسر ہوا۔ اس کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اسے معاشی آسودگی حاصل نہ ہو سکی۔ محمود شیرانی مرحوم کی تحقیق کے مطابق رودکی ۳۰۴ھ/۹۱۶ء تک زندہ تھا۔ رودکی کا دیوان تہران سے پروفیسر نفیسی کے اہتمام میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ دیوان قصائد کے علاوہ رباعیات، قطعات اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ رودکی کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ ابوالفرج غزنوی دور کا ایک ممتاز شاعر تھا۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انوری جیسا عظیم قصیدہ گو اس کے دیوان کے مطالعے اور پیروی پر فخر کرتا ہے۔ مسعود سعد سلمان، ظہیر فاریابی جیسے نادر الکلام شعرا سے خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ ظہیر فاریابی اور معزی کے ہاں اس کے اثرات ملتے ہیں۔ حقیقت میں انوری نے قصیدہ گوئی کی جس روش کو کمال تک پہنچایا۔ رونی ہی اس کا موجد تھا۔ رونی نے غزنوی دور کے دوسرے شعرا کی روش سے ہٹ کر قصیدے کہے۔ اس کے کلام میں علمی اصطلاحات، نئی تراکیب، اچھوتی تشبیہات اور نازک خیالی عام ملتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں وہ بہت محتاط نظر آتا ہے۔ مشکل بحریں اور طویل ردیفیں اسے بہت پسند ہیں۔ بیشتر قصیدے تشبیب کے بغیر شروع ہوتے ہیں۔ قصیدے کا آغاز ممدوح کی تعریف سے ہوتا ہے۔ رونی اپنے ممدوح کی تعریف میں مبالغے اور غلو سے کام لیتا ہے۔ اس کے قصائد زیادہ طویل نہیں ہیں۔ اس کے دیوان میں صرف تین نامکمل غزلیں موجود ہیں۔ اس کی رباعیات میں عاشقانہ جذبات اور فلسفیانہ مضامین ملتے ہیں انہیں گوارا ہی کیا جا سکتا ہے۔

نوروز جوان کرد بدل پیر و جوان را — ایام جوانیست زمین را و زمان را
ہر سال درین فصل بر آرد فلک پیر — چون طبع جوانان جہان دوست جہان را
گر شاخ نوان بود زبی برگی بی برگ — از برگ نوا داد قضا شاخ نوان را
مرغ از طلب دانہ فرو ماند کہ دانہ — در خاک ہمی سبز کند روی مکان را
آن غنچۂ گل بین کہ ہمی نازد بر باد — از خندہ وزدیدہ فرو بستہ دہان را

مسعود سعد سلمان

اس نامور شاعر کے باپ کا تعلق ہمدان سے تھا۔ اور یہ ساٹھ سال تک غزنویوں کی ملازمت میں رہا۔ لیکن مسعود سعد ۴۴۰ - ۴۳۸ھ کے درمیان لاہور میں پیدا ہوا۔ سلطان

ابراہیم (۴۵۰ - ۴۹۲) کے عہد میں وہ اپنی شاعری کی بدولت سلطان کے دربار سے وابستہ ہوا۔ جب شاہزادہ سیف الدولہ محمود بن ابراہیم ۴۶۹ھ میں لاہور کا نائب السلطنت بن کر آیا۔ تو مسعود سعد بھی اس کے ساتھ تھا۔ سیف الدولہ ۴۸۰ھ میں اپنے باپ کے حکم پر اپنے مصاحبین سمیت گرفتار ہوا۔ ان میں مسعود سعد بھی شامل تھا۔ وہ سات سال تک سو اور دھک کے قلعوں میں اور تین سال قلعہ نای میں قید رہا۔ اس اثنا میں وہ سلطان اور امرائے غزنین کے نام دردناک قصائد لکھ کر بھیجتا رہا۔ آخر ۴۹۰ھ میں سلطان کے ایک مقرب عمید الملک عماد الدولہ ابوالقاسم کی سفارش پر اسے رہائی ملی۔ اور یہ اپنی جاگیر پر آ گیا۔ سلطان ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا مسعود ۴۹۲ھ میں اس کا جانشین ہوا۔ اور اس نے اپنے بیٹے شیرزاد کو لاہور کی حکومت عطا کی۔ قوام الملک ابونصر ہبتہ اللہ فارسی شیرزاد کا وزیر اور مسعود سعد کا دوست تھا۔ مسعود سعد کے دن پھرے اور ابونصر نے اس کو جالندھر کا حاکم بنا دیا۔ لیکن ابونصر معتوب ہوا اور اس کے ساتھ اس کے دوست بھی۔ مسعود سعد کو مرنج میں آٹھ سال قید رکھا گیا۔ ثقتہ الملک طاہر بن علی مشکان کی سفارش پر اس قید سے اس کو رہائی ملی۔ اس کے بعد وہ شاہی کتاب خانے کا کتاب دار رہا۔ ۵۱۵ھ ۱۱۲۱ء میں مسعود سعد نے وفات پائی۔

مسعود سعد سلمان نے اپنی زندگی کے اٹھارہ یا انیس سال قید میں گزارے۔ اس نے اسیری کی ان تلخ یادوں کو بڑے مؤثر طریقے سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ فارسی شاعری میں مسعود کی یہ حبسیہ شاعری (حبسیات) بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے درد و اثر میں ڈوبے ہوئے دلدوز شعر پڑھنے والے پر رقت طاری کر دیتے ہیں۔ لاہور سے دور اس کی یاد میں اس فرزند لاہور نے آنسوؤں کے جو موتی بہائے۔ ان موتیوں سے اس نے اپنی شاہکار نظمیں تخلیق کیں۔ ہندوستان کے فارسی شعرا میں مسعود سعد پہلا شاعر ہے جس کے ہاں مقامی اثرات بہت ملتے ہیں۔ ہندی شاعری کی تقلید میں اس کے دیوان بارہ ماسے کی قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ جن میں ایام ماہ و ہفتہ برشگال جیسے خالص ہندوستانی موضوع پر بھی اس نے طبع آزمائی کی۔ عوفی نے لکھا ہے کہ مسعود سعد کے تین دیوان فارسی، عربی اور ہندی میں تھے۔ عربی کے متفرق اشعار تو مل جاتے ہیں۔ لیکن ہندی دیوان کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ جس شخص کی فارسی شاعری پر اتنے ہندی اثرات ہیں اور جو لاہور میں پلا بڑھا۔ اس کے لئے ہندی میں شعر

کتنا بعید از امکان معلوم نہیں ہوتا۔

مسعود سعد کے دیوان میں قصیدے زیادہ ہیں۔ قصیدہ گوئی میں اس کے پیش نظر رودکی لیبی اور منوچہری کا کلام رہا۔ مسعود سعد کے کلام تکلفات زیادہ نہیں ہیں۔ قدرت فکر اور جدت تراکیب اس کے کلام کی ایک خاص خوبی ہے۔ اسے رودنی کی طرح طویل بحروں یا لمبی ردیفوں کا شوق نہیں ہے۔ مدحیہ قصائد اور حبسیات سے قطع نظر اس کے کلام میں احساس طرب بھی ملتا ہے۔ اس کی غزلیں محبوب کی شان میں کہے گئے قصیدے معلوم ہوتے ہیں۔ رباعیات میں عشقیہ، مدحیہ اور حبسیہ مضامین ملتے ہیں۔ مسعود سعد ملک کا پہلا شاعر ہے جس نے فارسی میں پہلا مکمل شہر آشوب لکھا۔

مسعود سعد سلمان کے اپنے معاصر شعرا مثلاً رونی، سنائی، راشدی، معزی اور عثمان مختاری وغیرہ کے ساتھ دوستانہ روابط قائم تھے۔ اس کا دیوان سنائی ہی نے مرتب کیا۔

ای لاہور ویحک بے من چگونہٖ	بی آفتاب تابان، روشن چگونہٖ
ای آنکہ باغ طبع من آراستہ ترا	بی لالہ و بنفشہ و سوسن چگونہٖ
تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار	با من چگونہ بودی و بی من چگونہٖ
ناگہ عزیز فرزند از تو جدا شدہ است	با درد او بہ نوحہ و شیون چگونہٖ
نفرستیم پیام و نگوئی بہ حسن عہد	کاندر حصار بستہ چو بیژن چگونہٖ

غزنوی دور کی نثر

لاہور پر غزنویوں کی حکومت ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عرصے تک رہی۔ اس زمانے میں یہاں فارسی کا رواج ہوا بہت سے فارسی شعرا کے نام ملتے ہیں، جن کا تعلق اس دور سے تھا۔ علما و فضلا بھی یہاں آئے۔ اس کے باوجود اس دور کی فارسی نثر کا زیادہ سرمایہ ہم تک نہیں پہنچا۔ اس دور کے اہم ترین نثر نگار حضرت داتا گنج بخش نظر آتے ہیں، اور ان کی بھی ایک ہی کتاب "کشف المحجوب" آج کل دستیاب ہے۔

حضرت داتا صاحب کا نام سید علی، کنیت ابوالحسن اور لقب گنج بخش تھا۔ آپ کے والد سید عثمان جلاب کے اور ان کی والدہ ہجویر کی رہنے والی تھیں۔ یہ دونوں بستیاں مضافات غزنی میں واقع تھیں۔ انہی کی مناسبت سے داتا صاحب

کو ہجویری اور جلابی بھی کہتے ہیں۔ آپ کے پیر طریقت کا نام محمد ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی تھا۔ ان کے علاوہ بھی آپ نے اپنے وقت کے اکابر صوفیہ سے اکتساب فیض کیا۔ آپ ۴۳۱ھ کے لگ بھگ تبلیغی مقصد سے لاہور تشریف لائے۔ ان سے پہلے سید اسماعیل بخاری یہاں دعوت اسلام دے چکے تھے۔ غزنویوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے ہندو مسلمانوں سے بہت زیادہ متنفر ہو چکے تھے۔ ان پر مسلمانوں کی قوت کا رعب تو بیٹھ چکا تھا لیکن ان کے دل اسلام دشمنی کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے۔ داتا صاحب نے ان کٹھن حالات میں اپنا مشن بڑی خوبی سے پورا کیا۔
آپ کا انتقال لاہور میں ہوا۔ تاریخ وفات ۴۶۵ھ بتائی جاتی ہے۔ لیکن استاد حبیبی کی تحقیق کے مطابق داتا صاحب کا انتقال ۴۸۱ھ ۔ ۵۰۰ھ کے درمیان ہوا۔ انکی تصانیف میں (۱) منہاج الدین (۲) کتاب الفنا (۳) اسرار الخرق (۴) کتاب البیان لاہل العیان (۵) نحو القلوب (۶) الرعایہ (۷) شرح کلام منصور حلاج (۸) بیان ایمان (۹) کشف الاسرار اور (۱۰) کشف المحجوب۔ لیکن اب ان کی صرف دو کتابیں ملتی ہیں۔ ایک کشف الاسرار اور دوسرے کشف المحجوب۔ کشف الاسرار کا داتا صاحب سے انتساب محققین کی نظر میں درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب اس مسئلہ پر اپنی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" میں تفصیلی بحث کی ہے۔

کشف المحجوب فارسی میں تصوف کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک قدیم اور اہم کتاب ہے۔ غزنی سے ایک بزرگ ابو سعید غزنوی داتا صاحب کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ انہوں نے آپ سے تصوف اور صوفیاء کے بارے میں چند سوالات پوچھے تھے۔ داتا صاحب نے یہ کتاب انہی سوالات کے جواب میں لکھی۔ اس میں حقیقت سے پردے اٹھائے گئے ہیں۔ اس لئے اس کا نام کشف المحجوب رکھا گیا ہے۔

یہ کتاب ۲۴ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تصوف کی مبادیات دوسرے حصے میں صوفیاء کے احوال اور تیسرے حصے میں تصوف کے مسائل اور اصطلاحات صوفیہ کا بیان ہے۔ دوسرے حصے میں تقریباً ۱۲۰ صوفیاء کے حالات لکھے گئے ہیں۔ داتا صاحب نے یہ بلند پایہ کتاب بڑے عالمانہ انداز میں لکھی ہے کسی موضوع پر لکھتے ہوئے پہلے آیات قرآن، پھر احادیث رسولؐ آخر میں اقوال

بزرگان لائے گئے ہیں۔ انہوں نے ہر مسئلے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ جہاں انہیں دوسروں کے ساتھ اختلاف ہے وہاں انہوں نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ داتا صاحب نے ابو النصر سراج ۳۷۸/۹۸۸ھ اور رسالہ قشیریہ سے استفادہ کیا ہے۔ کتاب کا کچھ حصہ انہوں نے قیام لاہور میں لکھا۔ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء، مولانا جامی، شاہزادہ دارا شکوہ نے اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے۔ محکمہ اوقاف نے کشف المحجوب کے ایک قدیم ترین نسخے کو جو حضرت زکریا ملتانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اور مرحوم ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی ملکیت تھا۔ بڑے اہتمام سے ۱۹۷۶ء میں شائع کرایا ہے۔ اس کا ایک نسخہ مشہور مستشرق ژوکوفسکی کی نگرانی میں روس سے شائع ہوا۔ پروفیسر نکلسن نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ اس کتاب کا طرز تحریر مجموعی طور پر سادہ ہے۔ لیکن تصوف کے موضوع کی وجہ سے اس میں عربی الفاظ کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ اس میں کہیں کہیں جملوں میں موزونیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ موزونیت صوفیانہ کتب کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

خاندان غلاماں کا عہد (مملوک سلاطین)

۵۸۲ھ میں شہاب الدین محمد غوری نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور اس نے یہیں سے ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر یلغاریں کیں۔ ۶۰۰ھ میں محمد غوری قتل ہوا اور اس کے جانشین محمود بن غیاث الدین نے ہندوستان کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ پایۂ تخت دہلی منتقل ہو چکا تھا۔ لیکن قطب الدین کی تاجپوشی کا جشن لاہور ہی میں منایا گیا۔ یہ ہندوستان کا پہلا مسلمان خود مختار بادشاہ اور خاندان غلاماں یا مملوک سلاطین یا معزیہ کا بانی تھا۔ اس خاندان کے فرمانرواؤں میں التمش (۶۰۷-۶۳۳ھ)، رضیہ سلطانہ ۶۳۴-۶۳۷ھ، سلطان ناصر الدین ۶۴۴-۶۶۴ اور غیاث الدین بلبن ۶۶۴-۶۸۶ھ قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے کے سارے بادشاہ نسلاً ترک تھے۔ لیکن ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں فارسی زبان اور ایرانی ثقافت کا غلبہ تھا۔ اس لئے انہیں فارسی زبان اور اس کی اشاعت سے بڑی دلچسپی رہی۔

اس عہد میں دہلی پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے مرکزِ ادب بنا۔ دہلی کے علاوہ صوبائی صدر مقام اور وہ شہر جہاں مسلمانوں کی لشکرگاہیں تھیں۔ مثلاً ملتان، لکھنوتی، اُچ، دیپالپور، اجودھن، ہانسی، سنام، سیالکوٹ وغیرہ فارسی شعر و ادب کے مرکز بن گئے۔ اُچ میں ناصر الدین قباچہ (۶۰۲ھ - ۶۲۲ / ۱۲۰۶ - ۱۲۲۵) کے دربار میں سدید الدین عوفی اور مولانا منہاج الدین سراج جیسے علماء موجود تھے۔ بلبن کے زمانے میں اس کا بڑا بیٹا شاہزادہ محمد (شہید) ملتان کا صوبیدار تھا۔ اس باذوق شاہزادے کے ہاں امیر خسرو اور حسن سجزی جیسے شاعر اس کے دربار کی رونق بڑھا رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس نے شیخ سعدی کو ہندوستان آنے کی دعوت بھی دی تھی ...... بنگال بھی اسی عہد میں فتح ہوا اور وہ بھی ممالیک کی حدودِ سلطنت اور فارسی کی قلمرو میں آگیا۔ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں ایران تاتاریوں کی غارت گری کا شکار ہوا تو بہت شاہزادے، امراء، علماء فضلا اور شعراء جان بچا کر وسط ایشیا اور ایران سے ہندوستان آگئے۔ ان کے آنے سے فارسی کو تازہ خون ملا۔ اس دور میں شعراء نے قصائد زیادہ لکھے اور ان قصیدوں میں اپنے ممدوحین کی جنگی مہمات کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ بعض رباعیات بھی کسی نہ کسی تاریخی واقعہ سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں۔

اس دور کے شعراء

ناصر الدین قباچہ ۶۰۲ سے ۶۲۲ تک اُچ کا حکمران رہا اور اس کی اپنی داد و دہش اور اس کے وزیر عین الملک کی شعر دوستی اور علم پروری کی وجہ سے بہت شعراء اس کے دربار میں جمع ہو گئے، جن میں سے مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:-

شمس الدین محمد بلخی عوفی نے اسے تاج الندماء کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ نوجوان شاعر اعلیٰ درجے کا کاتب بھی تھا۔ ناصر الدین قباچہ کی مدح میں اس کا مندرجہ ذیل مطلع کا قصیدہ مشہور ہے

ای لب لعلت مزاج آبِ حیوان یافته　　بر جهان دلبری حسن تو فرمان یافته

فضلی ملتانی یہ شخص بخارا میں عوفی کا ہمدرس رہا۔ اپنے زمانے کا جید عالم بھی تھا۔ پچھمی نرائن شفیق نے تذکرہ گل رعنا میں اس کو تاج الفضلا کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اور اس کا شمار علمائے ملتان میں کیا ہے۔ عوفی نے اس کی چند رباعیات اور ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

ای ظفر ہمدم ترا از بخت برنا آمدہ　　نامۂ تائید تو انا فتحنا آمدہ

ضیاءالدین سجزی فخرالشعراء ضیاءالدین سجزی بھی دربار ناصرالدین قباچہ کے سرکردہ فضلا میں سے تھا۔ اس کے قصیدے کا ایک شعر اس طرح ہے:

گرچہ از طفلان زمہدست پر آغوش باغ

تمد خوشبوی بنفشہ از غم پیری دوتاست

سدیدالدین عوفی اور مولانا منہاج سراج اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔

ناصری یہ شاعر ماوراالنہر سے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ۶۲۳ھ کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے دہلی آیا۔ حضرت خواجہ سے اپنی کامیابی کے لئے دعا کروا کے سلطان شمس الدین التمش کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور وہاں اس نے سلطان کی مدح میں ایک زوردار قصیدہ پڑھا۔ اس کا مطلع یہ تھا:

ای فتنہ از نہیب تو زنہار خواستہ　　تیغ تو مال وفیل از کفار خواستہ

اسی دوران سلطان کی توجہ شاعر کی طرف نہ رہی۔ ناصری بادشاہ کی اس بے توجہی سے مایوس ہونے لگا تو سلطان نے اپنی بے مثال قوت حافظہ سے وہ اشعار دہرا کر ناصری کی ڈھارس بندھائی۔ قصیدے کے ۵۳ اشعار پر ۵۳ ہزار سفید تنکے انعام دیئے۔ آذر نے آتشکدے میں اس کا نام خواجہ ابونصر لکھا ہے۔ یہ مشہد میں پیدا ہوا اور خواجہ ابوسعید ابوالخیر کی اولاد میں سے تھا۔ آذر نے ناصری کا یہ قطعہ نقل کیا ہے:

ازبود در قفست ہمہ روز است ماتم　　از دیر آمدن ہمہ شب ما تمی دگر

ترسم اگر حکایت غم ہای خود کنم　　غمگین شوی ازین غم وآن ہم غمی دگر

روحانی سمرقندی

روحانی چنگیز خان کے حملے سے جان بچا کر بخارا سے ۶۲۲ھ میں دہلی آیا۔ عوفی نے الاجل الافضل تاج الحکماء عطارد ثانی ابوبکر بن محمد بن علی الروحانی لکھا۔ سلطان التمش کے دربار میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ اس نے رنتھنبور اور مانڈو کی فتح پر سلطان کی مدح میں زوردار قصیدہ لکھا اور سلطان نے اس کو گراں قدر صلہ عطا کیا۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے:

خبر بہ اہل سما برد جبرئیل امین ‌ ‌ ‌ ز فتحنامۂ سلطان عہد شمس الدین

تاج الدین ریزہ

تذکرہ نگاروں نے اسے ریزہ یا سنگریزہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر یٰسین خان نیازی کی تحقیق کے مطابق وہ چھٹی صدی کے ربع آخر میں پیدا ہوا۔ دہلی کا یہ روشن دماغ اور فاضل شخص دبیر الملک کے عہدے تک پہنچا۔ اور ۶۶۴ھ تک ضرور زندہ تھا۔ ۶۲۹ھ سے قبل شاہی ملازمت میں داخل ہوا۔ کیونکہ اسی سال اس نے فتح گوالیار پر ایک رباعی کہی جو التمش کے حکم سے شہر کے دروازے پر کندہ کرائی گئی۔ یہ بلبن کے عہد تک زندہ رہا اور بلبن نے اسے شمس الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس کا انجام بڑا حسرتناک ہوا۔ کہتے ہیں کہ اسے ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا دیا گیا۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے دیوان انوری نولکشور ایڈیشن کے آٹھ دس الحاقی قصیدوں کی نشاندہی کی۔ ان میں سے دو قصیدے تو یقینی طور پر سنگریزہ کے ہیں۔ ڈاکٹر یٰسین خان نیازی نے مذکورہ بالا الحاقی قصیدوں کو سنگریزہ کے قصیدے قرار دیا ہے۔ جو دیوان انوری میں شامل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے سنگریزہ کو ایک سادہ اور سلیس شاعر لکھا ہے [1]

چو زلف است آن جبین بردن جانان ‌ ‌ ‌ کز و گردد پریشانی پریشان
بمہ و ماہ میخواہد ہمی جنگ ‌ ‌ ‌ رخش پوشیدہ زان از زلف خفتان
چو شمشیرش بخندد خصم گرید ‌ ‌ ‌ بلی از خندۂ برق است باران
کند مہرش بنات النعش را جمع ‌ ‌ ‌ چنان قہرش ثریا را پریشان

عمید سنامی

فخر الملک، ملک الکلام خواجہ عمید الدین کا تعلق مشرقی پنجاب کی ریاست پٹیالہ کے ایک قصبے سنام سے تھا۔ وہ ۶۰۱ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۶۵۳ھ میں وفات پائی [2]۔ اپنی خداداد ذہانت کی بدولت ترقی کرتے

[1] اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۴ء [2] ارمغان پاک ص: ۳۸

کرتے ہندوستان کا دیوان کل بن گیا تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ اس نے ناصرالدین محمود اور غیاث الدین بلبن کا زمانہ پایا۔ عمید اپنے عہد کا ایک قادرالکلام شاعر تھا۔ اس نے ناخن، کشتی اور آہو جیسی خشک ردیفوں میں بہت اعلیٰ درجے کے اشعار کہے ہیں انوری نے فلک اور بیک جیسے سنگلاخ قوافی میں جو قصیدہ کہا اس کے اشعار چوبیس سے زیادہ نہیں لیکن انہی قوافی نے عمید نے حمد و نعت کے موضوع پر ۴۷ اشعار کا قصیدہ لکھا ہے۔ صنائع بدائع کے استعمال میں اسے بڑی قدرت حاصل تھی۔ عمید ہندوستان کا پہلا شاعر ہے۔ جس کے قصائد میں صنعت مناظرہ کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اس ضمن میں اس کے لکھے ہوئے سیف و قلم اور بنگ و شراب کے مناظرے قابل ذکر ہیں۔ اپنی دیوانی ملازمت میں ایک بار حساب کتاب میں گڑبڑ کی وجہ سے قید بھی رہا اور زمانہ اسیری میں بڑی پراثر جیسہ نظمیں لکھیں۔ آخری عمر میں اس کا رجحان تصوف کی طرف ہو گیا اس کی توجہ حمد و نعت کی طرف زیادہ ہو گئی۔

چو بردارد نگارم چنگ، بندد زخمہ بر ناخن | زند ناہید را صد زخم غیرت بر جگر ناخن
ز رشک چنگ او ناہید را تب گیرد آن ساعت | کبود گردد از تاثیر آن تب سر بسر ناخن
ردیف ناخن آوردم درین شعری کہ حرا آمد | بلی در بحر کار آید لبان موی سر ناخن

شہاب الدین مہمرہ بدایونی

امیر خسرو جیسے شخص نے مہمرہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے لیکن اس کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ مواد دستیاب نہیں ہے۔ صاحب نزہت الخواطر نے اس مہمری بدایونی لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ شہاب الدین مہمرہ کا رہنے والا ہے۔ ایک تو اس کا محل وقوع معلوم نہیں ہو سکا۔ دوسرے بیشتر اہل قلم نے اسے مہمرہ ہی لکھا تھا مہمری نہیں۔ منتخب التواریخ کے مصنف ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے جو اس نے سلطان رکن الدین فیروز شاہ کی مدح میں کہا تھا۔ فیروز شاہ ۶۳۳ھ میں صرف سات ماہ حکمران رہا۔ مہمرہ نے امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کی اصلاح کی یہ مثنوی ۷۰۱ھ میں تکمیل کو پہنچی یعنی مہمرہ ۷۰۱ھ تک یقیناً زندہ تھا۔ سراج الدین علی خان آرزو نے اس کا شمار ہندوستان کے بڑے شعرا میں کیا ہے امیر خسرو کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ مہمرہ الٰہیات ریاضیات اور طبعیات میں استاد تھا۔ ہندوستان کے فارسی شعرا میں تصنع پر تکلف قصاید کہنے کا آغاز مہمرہ ہی نے کیا۔ اس کی قدرت کلام کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے

کو یا انتہائی بے جوڑ الفاظ کو بڑے صنعت خیز انداز سے اپنے کلام میں لاتا ہے۔ ہندوستان کے فارسی شعراء میں عمرو ہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے حمد و نعت اور اخلاق و تصوف کے موضوعات پر قصیدے لکھے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں کرگ، اژگ، پیل اور شیر کا استعمال قابلِ ذکر ہے۔

آسمان پیل گون ملک تنم را کرگ سان — روزگار شیر وش جسم مرا پیلگ داد
پیل بارگ آن نخورد و کرگ با جوشن نیاورد — شیر چرخ از جور این شخص چون موی زار

شیخ جمال الدین ہانسوی

آپ بابا فرید گنج شکرؒ کے خلیفہ اعظم تھے ان کا کلام صوفیانہ ہے ان کے کلام کی ادبی اہمیت تو زیادہ نہیں لیکن شاعر کی واردات قلبی نے اس کو پر اثر بنا دیا ہے۔ ان کا انتقال ۱۲۶۰ء میں ہوا۔

دورِ ممالیک کی نثر

یہ دور ہندوستان میں ایک طرف اسلامی سلطنت کی توسیع اور دوسری طرف اشاعت اسلام کا دور تھا۔ اس لئے اس زمانے میں خالص ادبی موضوعات پر بہت کم لکھا گیا صرف عوفی کی جوامع الحکایات کا ذکر اس ضمن میں کیا جا سکتا ہے۔ کتب تاریخ کا تناسب ذرا زیادہ نظر آتا ہے اکثر تاریخیں بادشاہوں کے نام منسوب ہیں۔ شعراء کا پہلا تذکرہ لباب الالباب اسی دور میں لکھا گیا۔ اشاعت اسلام کے لئے صوفیائے بڑی کوشش کی اس لئے صوفیانہ موضوعات پر بھی کچھ کتابیں فارسی میں لکھی گئیں۔ اس عہد کی قابل ذکر نثری تصانیف حسب ذیل ہیں۔

جوامع الحکایات

جوامع الحکایات و لوامع الروایات سدید الدین محمد عوفی کی تالیف ہے یہ مشہور صحابی حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کی اولاد میں سے تھے۔ بخارا میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی تعلیم سے فراغت کے بعد ماوراء النہر اور خراسان کے مختلف شہروں میں پھرتے رہے اور وہاں کی معروف شخصیتوں سے ملتے رہے تاتاریوں کے حملوں سے جان بچا کر ہندوستان چلے آئے ۶۱۷ھ سے پہلے وہ اُچ میں ناصر الدین قباچہ کے دربار سے متوسل ہو چکے تھے۔ ۶۲۵ میں قباچہ کی شکست اور خودکشی کے بعد التمش کے ساتھ اس کے دربار میں دہلی آگئے۔ ۶۳۰ھ کے بعد ان کا پتہ نہیں

چلا گیا اور یہاں گئے۔

عوفی نے جامع الحکایات قباچہ کی فرمائش پر لکھنا شروع کی تھی۔ لیکن یہ ۶۳۰ھ میں مکمل ہوئی اور اس لئے عوفی نے اسے التمش کے وزیر نظام الملک قوام الدین محمد بن ابی سعید جنیدی کے نام معنون کر دیا۔ فارسی نثر میں حکایات کی اس قدر جامع کتاب اس سے پہلے مرتب نہیں ہوئی تھی۔ کتاب چاروں حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصے میں معرفت معبود گار ذکر انبیاء و اولیاء اور تواریخ ملوک، دوسرے حصے میں اخلاق پسندیدہ تیسرے میں مذموم اخلاق اور چوتھے میں عالم خشکی و تری اور حیوانی طبائع کا ذکر ہے ہر حصہ پچیس پچیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک ہندوستانی فاضل ڈاکٹر نظام الدین نے اس کتاب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کو نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ لیکن اس کے چھپنے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی۔ یہ کتاب تاریخی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتی۔ عوفی نے ناصر الدین قباچہ اور التمش کے ساتھ رہا ان کے بارے میں جو حکایات اس کتاب میں آئی ہیں وہ اس کے تجربات و مشاہدات کا حصہ ہے۔ عوفی تاریخ کی مستند کتب سے ان حکایات کا انتخاب کیا ہے علاوہ ازیں ان حکایات سے اس دور کی تہذیب و معاشرت اخلاق و سیاست کا اندازہ ہوتا ہے اس کتاب کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے لباب الالباب کی طرح پر تکلف نہیں ہے۔

الفرج بعد الشدة قاضی ابو علی تنوخی ۳۸۴ھ نے اس نام سے عربی میں حکایات کی ایک کتاب تالیف کی تھی۔ عوفی نے ان حکایات کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور یہ ترجمہ ناصر الدین قباچہ کے نام سے منسوب ہے اس کی بعض حکایات جوامع الحکایات میں بھی شامل ہیں۔

کتب تذکرہ و تاریخ

لباب الالباب فارسی شعرا کا یہ اولین دستیاب تذکرہ، عوفی نے ۶۱۸ھ میں اچ میں مکمل کیا۔ اور یہ ناصر الدین قباچہ کے وزیر عین الملک کے نام معنون ہے۔ کتاب بارہ ابواب دو جلدوں اور تقریباً ۳۰۰ شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے اس تعداد میں وہ سلاطین و وزرا اور علما بھی شامل ہیں جنہوں نے کبھی کبھی

شعر کہے ہیں اس تذکرے میں شعراء کے احوال ترتیب و تفصیل سے نہیں ملتے اس طبقاتِ شعرائے عرب کے موضوع پر جو کتب موجود تھیں۔ عوفی نے لباب الالباب انہی کی تقلید میں لکھا یہ تذکرہ قدیم ترین کتاب ہے۔ جس میں ۶۰۰ھ تک شعرا ان کے کلام کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ اس میں بہت سے ایسے شعرا کا ذکر آیا ہے۔ جن کا کلام اب دستیاب نہیں ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ پروفیسر براؤن اور دوسری دفعہ استاد سعید نفیسی کے اہتمام میں شائع ہو چکی ہے۔ لباب الالباب کا اسلوب تحریر پرتکلف ہے۔ تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع کا استعمال اس میں بہت ہوا ہے۔

بحر الانساب (سلسلۃ الانساب)

محمد مبارک شاہ معروف بہ فخر مدبر کی تالیف ہے اس کا شمار غزنوی قطبی اور شمسی دور کے اہم مصنفوں میں ہوتا ہے یہ کتاب ۶۰۲ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ بحر الانساب رسول اکرمؐ صحابہ کرام، ملوک عرب، شام و یمن، ملوک عجم، خلفاء، طاہریوں سے غوریوں تک ۱۳۶، نسب ناموں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا ابتدائی حصہ قطب الدین ایبک کے دور سے متعلق ہے اور سر ڈینی سن راس نے اسے تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کے نام سے شائع کرا دیا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ترکوں کے بارے میں بڑی مفید معلومات درج ہیں۔

چچ نامہ

ایک عربی کتاب فتح نامہ یا منہاج الدین والملک یا تاریخ منہاج المسالک کا فارسی ترجمہ ہے جو ۲۱۵ھ/۸۳۰ء – ۲۵۵ھ/۸۶۸ء کے درمیان لکھی گئی اس میں برہمنوں کے سلسلے کے بانی چچ کے حالات درج ہیں۔ سندھ کے بارے میں یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے اس میں بدھ مت اور ہندو مت کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں ہندو تہذیب و معاشرت کا بیان بھی اس میں تفصیل سے ملتا ہے۔ چچ نامہ کے فارسی مترجم کا نام علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی ہے۔ یہ ۱۱۶۰/۵۵۵ھ میں پیدا ہوا۔ یہ ترجمہ اس نے ۶۱۳ھ میں مکمل کیا اور ناصر الدین قباچہ کے وزیر عین الملک کو پیش کیا۔

تاج المآثر

مصنف کا نام تاج الدین حسن بن نظامی نیشاپوری ہے یہ فاضل شخص خراسان سے دہلی آیا اور قاضی دہلی شرف الملک نے اس بڑی آؤ بھگت کی۔ قطب الدین ایبک نے اسے اپنی فتوحات کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کا حکم دیا۔ حسن نے ۱۲۰۵ء/۶۰۲ھ میں کتاب لکھنی شروع کی اور اس میں ۱۲۱۷ء/۶۱۴ھ تک کے

واقعات آگئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مصنف نے قطب الدین کی وفات کے بعد بھی یہ کام جاری رکھا تاج المآثر شہاب محمد غوری کے ہندوستان پر آخری پانچ حملوں قطب الدین کی فتوحات اور التمش کے عہد حکومت کے پہلے سات سالوں کے بارے میں ایک اہم کتاب ہے یہ اس دور کی محفوظ رہ جانے والی پہلی تاریخ ہے۔ کتاب کا انداز بیان پر تکلف ہے اور مصنف کی روش منشیانہ ہے۔

طبقات ناصری

یہ مولانا ابو عمر عثمان بن منہاج سراج جوزجانی کی تالیف ہے۔ ان کی پیدائش فیروز کوہ (غور) میں ۱۱۹۳ء/ ۵۸۹ھ میں ہوئی ان کی ماں سلطان غیاث الدین غوری کی بیٹی ماہ ملک کی دودھ شریک بہن تھی۔ اس لئے ان کا بچپن محل میں امیرزادوں کی طرح گزرا۔ مولانا نے بہت طویل سفر کئے اور ۱۲۲۷ء/ ۶۲۴ھ میں اُچ پہنچے اور اچ کے مدرسہ فیروزی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ناصر الدین قباچہ کی شکست اور خودکشی کے بعد دہلی آگئے پہلے دہلی کے قاضی اور پھر ہندوستان کے قاضی القضاۃ مقرر ہوگئے۔ سلطان ناصر الدین شاہ نے انہیں دوبارہ قاضی القضاۃ بنایا۔ انہوں نے ۱۲۶۰ء/ ۶۵۸ھ میں طبقات ختم کی اور مولانا نے یہ کتاب سلطان ناصر الدین کے نام ہی معنون کی طبقات ایک عمومی تاریخ ہے اور ابتدائے آفرینش سے ۶۵۰ھ تک کے واقعات اور ۲۳ طبقات پر مشتمل ہے۔ غوریوں سے لیکر مصنف کے زمانے تک حالات اس تاریخ کی جان ہیں مستند تاریخ ہے لیکن مختصر بہت ہے مولانا شاعر بھی تھے۔ اس لئے کہیں کہیں عبارات میں اشعار بھی آجاتے ہیں۔ پھر بھی اس کتاب کا اسلوب بیان واضح ہے۔

کتب تصوف

(۱) رسالہ در کسب نفس

(۲) رسالہ وجودیہ

(۳) حدیث المعارف

(۴) گنج اسرار

(۵) انیس الارواح

یہ سب کتب حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ۱۲۳۴ء/ ۶۳۲ھ کی تالیفات بتائی جاتی ہیں۔ رسالہ در کسب نفس کے سوا باقی نایاب ہیں۔

انیس الارواح خواجہ عثمان ہارونی کی ۲۸ مجالس کے ملفوظات تھے۔

طوالع الشموس خواجہ حمید الدین ناگوری م ۱۲۷۴ء/۶۷۳ھ کی تالیف ہے اس میں باری تعالیٰ کے ننانوے اسماء کی شرح دو جلدوں میں کی گئی ہے۔

کتاب الاوراد شیخ ابو محمد زکریا ملتانی م ۱۲۶۲/۶۶۱ھ کی تصنیف ہے۔

اصول طریقہ شیخ حمید الدین صوفی ناگوری م ۱۲۷۴ء/۶۷۳ھ کی تصنیف ہے۔

دلیل العارفین حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ م ۱۲۳۶/۶۳۳ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ انہیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ۶۳۳ھ نے مرتب کیا۔

فوائد السالکین یہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ملفوظات ہیں جنہیں شیخ فرید الدین گنج شکر نے مرتب کیا۔

عہد شمسی کے ایک فاضل سوید حاجرمی نے احیاء العلوم کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

التمش کے بیٹے رکن الدین فیروز کے زمانے میں امام رازی کی تصنیف سر مکتوم کا فارسی میں ترجمہ کرایا گیا۔

آداب الحرب والشجاعتہ ۳۴ ابواب پر مشتمل یہ کتاب فخر مدبر کی تصنیف ہے نام سے کتاب کے موضوع کا ایک حد تک اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ اس میں جنگ کے طور طریقے بیان کئے گئے ہوں گے لیکن آداب جنگ کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں مثلاً کرم و حلم، عدل، انتخاب وزیر واسپ کے بارے بیان کی گئی ہیں۔ مصنف نے اکثر مقامات پر اپنے موضوع کی تائید میں آیات قرآنی احادیث رسول اور اقوام نبدگان نقل کئے ہیں۔ خلفاء اور سلاطین کی حکایات بھی کہیں کہیں محل کی مناسبت سے لائی گئی ہیں۔ لاہور کے ابتدائی دور کے متعلق بھی اس میں مفید معلومات موجود ہیں اس کتاب کا وہ حصہ بڑی اہمیت رکھتا ہے جہاں مصنف نے اپنے زمانے کے اسلحہ کی تفصیل بیان کی ہے۔

عہد تغلق ۷۲۱ھ — ۸۱۵ھ / ۱۳۲۱ء — ۱۴۱۲ء و عہد خلجی ۶۸۹ھ — ۷۲۱ھ / ۱۲۹۰ء — ۱۳۲۱ء

عہد خلجی و تغلق

خاندان غلاماں کے بعد سلاطین خلجی برسراقتدار آئے جلال الدین خلجی اس سلسلے کا بانی تھا۔اس کا بھتیجا اور داماد علاؤالدین اس خاندان کا اہم ترین بادشاہ تھا۔جس کے عہد میں مسلمانوں کی سلطنت جنوبی ہند تک جا پہنچی۔گجرات اور دکن سلطنت دہلی کے ماتحت آگئے اس طرح اس عہد میں سلطنت میں توسیع کے ساتھ فارسی زبان کا دائرہ اثر بھی وسیع ہو گیا۔ بادشاہ خود پڑھا لکھا نہیں تھا۔ لیکن دہلی میں ایسے ایسے علماء فضلا اور شعراء جمع ہو گئے تھے۔ کہ بقول برنی ان کی نظیر عالم اسلام میں کہیں نہیں ملتی تھی۔اس لحاظ سے عہد علائی کا مقابلہ عہد اکبری ہی سے کیا جا سکتا ہے۔اس کے انتقال کے بعد چند نومسلم غلاموں کی سازشوں سے یہ خاندان بالکل نابود ہو گیا۔اور ان بظاہر مسلمان مگر بباطن ہندوؤں کا قلع قمع حاکم دیپالپور کے غازی ملک غیاث الدین تغلق نے کیا اور چونکہ خلجی خاندان کا کوئی شہزادہ زندہ نہیں تھا اس لئے لوگوں نے غیاث الدین تغلق ہی کو دہلی کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔

محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق اس خاندان کے اہم بادشاہ تھے۔محمد تغلق خود بہت بڑا عالم تھا۔شعر بھی کہتا ہے۔اور اعلیٰ درجے کا خوش نویس بھی تھا۔علماء و شعرا کا قدردان تھا۔ محمد تغلق کے زمانے میں ایران سے کافی لوگ ہندوستان آئے بقول ابن بطوطہ دوسرے ممالک سے یہاں آنیوالوں کو خراسانی کہا جاتا ہے۔ایرانیوں کی آمد سے فارسی زبان کو مزید فروغ ملا۔محمد تغلق کی داد و دہش کا سن کر علماء شعرا جوق در جوق ہندوستان آرہے تھے فیروز شاہ تغلق علماء شعرا کی سرپرستی میں بڑی فراخدلی سے کام لیتا تھا۔اس کے عہد میں ملک کے مختلف حصوں میں مدارس کھولے گئے۔سب سے قابل ذکر بات یہ ہے۔کہ اس کے زمانے میں سنسکرت کتابوں کے فارسی میں ترجمے کا آغاز ہوا۔سلطان خود بھی مصنف تھا فتوحات فیروز شاہی اس کی تصنیف ہے۔تغلقوں کے زمانے میں ہندوستان کے بہت سے علاقے خود مختار ہو گئے۔بنگال، دکن، گجرات اور جونپور میں آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔ان خود مختار حکومتوں کی وجہ سے فارسی زبان کی سرپرستی و اشاعت کے وسائل میں کافی اضافہ ہو گیا کشمیر میں بھی فارسی ادب کا آغاز اسی عہد میں ہوا۔

عہد خلجی و تغلق کے شعرا

خلجی خاندان کا بانی سلطان جلال الدین خلجی خود شاعر تھا اور شعر دوست۔ اس کے ہاں اکثر شعر و شاعری کی مجلس منعقد ہوتی تھیں۔ امیر خسرو اور حسن کی غزلیں موسیقی کے ساتھ گائی جاتی تھیں۔ بدایونی نے سلطان کی یہ رباعی نقل کی ہے۔

آن زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم — وآن روی چو گلنارت تفیدہ نمی خواہم
بی پیر بہشت خواہم یکشب بکنار آئی — ہاں بانگ بلند است این پوشیدہ نمی خواہم

امیر خسرو اور حسن کے علاوہ سلطان جلال الدین خلجی کے شعرا میں موید جاجرمی، موید دیوانہ امیر ارسلان، کاہی، سعد منطقی، باقی خطیب اور قاضی مغیث کے نام ہی صرف ملتے ہیں۔ برنی نے سلطان علاؤ الدین کے شعرا گنے ہیں صدر الدین عالی، حمید الدین راجا، مولانا عارف عبید حکیم، شہاب انصاری اور صدر نستی وغیرہ ہر ایک کو صاحب دیوان شاعر قرار دیا ہے سعد منطقی اور عبید حکیم نے تو سلطان محمد تغلق کا زمانہ ۷۲۵-۵۲ بھی دیکھا برنی لکھتا ہے کہ ان دونوں نے محمد تغلق کو مذہب کے معاملے میں آزاد خیال اور متشکک بنا دیا تھا۔ عبید حکیم اور امیر خسرو میں چشمک رہتی تھی۔ فخر الدین قواس اور بو علی قلندر کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ باقی شعرا کے حالات اور کلام نہیں ملتا۔ امیر خسرو کی شاعری خاندان غلامان میں شروع ہوئی اور وہ محمد تغلق کے زمانے تک زندہ رہے لیکن ان کی زندگی کا بڑا حصہ تقریباً ۲۱ سال عہد علائی میں بسر ہوئے اس لئے انہیں عہد علائی میں شمار کیا گیا۔ اس اعتبار سے حسن سجزی بھی اسی دور میں آتے ہیں۔

طوطی ہند امیر خسرو

ابوالحسن یمین الدین امیر خسرو ہندوستان کے ایک قصبے پٹیالی میں پیدا ہوئے سال پیدائش ۱۲۵۳/۶۵۱ھ بتایا جاتا ہے۔ ان کے والد سیف الدین محمود ترکی النسل تھے اور چنگیزی حملوں کے درمیان ترک وطن کر کے ہندوستان آ گئے تھے خسرو کے نانا عماد الملک سلطان شمس الدین التتمش $\frac{\text{۶۰۷ — ۶۳۳}}{\text{۱۲۱۰ — ۱۲۳۵}}$ کے امیر دربار تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش ان کے نانا نے کی خسرو بیس کی عمر میں علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے۔ ۱۲۷۲/۶۷۱ھ میں انہوں نے حضرت نظام الدین اولیا کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ مرشد کے ساتھ ان کی ارادت ضرب المثل بن گئی۔ عقیدت و محبت کا یہ رشتہ مرشد کی وفات تک قائم رہا۔ خسرو اپنی زندگی بھر دربار شاہی سے وابستہ رہے اس ملازمت میں وہ امیر کشلو خان عرف ملک چھجو برادر زادہ سلطان غیاث الدین بلبن بغرا خان پسر بلبن، قاآن الملک شاہزادہ محمد پسر بلبن

خاں جہاں صوبیدار اودھ کیقباد، سلطان جلال الدین خلجی، سلطان علاؤالدین خلجی
غیاث الدین تغلق اور محمد تغلق کے ساتھ دہلی کے علاوہ سامانہ، بنگال، ملتان اور اودھ
میں رہے۔ ۱۳۲۵/۲۵، ۷ھ میں ان کے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کا انتقال ہو
گیا۔ خسرو اس وقت دہلی میں موجود نہیں تھے۔ اس اندوہناک واقعہ کے بعد وہ صرف
چھ ماہ زندہ رہے اور وہ ۷۲۵ھ میں انتقال کر گئے۔ اور اپنے مرشد کی پائینتی دفن
ہوئے۔ خسرو بہت ہی قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے۔ ان کا نام ایرانی شعرا کے ساتھ لیا
جاتا ہے ایران کے قدیم تذکرہ نویسوں اور جدید نقادوں نے ان کی شاعرانہ عظمت کا کھلے
دل سے اعتراف کیا ہے۔ خسرو اپنے پانچ دیوان تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال
بقیہ نقیہ اور نہایۃ الکمال کے ناموں سے مرتب کئے۔ ہر دیوان میں عمر کے کسی خاص حصے کا کلام
ہے جو اس کے نام سے ظاہر ہے ان مجموعوں میں ان کے قصائد، غزلیات، ترجیع و ترکیب
بند اور کچھ مثنویاں شامل ہیں۔

انہوں نے پانچ تاریخی مثنویاں قران السعدین، مفتاح الفتوح، دولرانی خضر خان
نہ سپہر اور تغلق نامہ لکھیں۔

امیر خسرو نے خمسۂ نظامی کا جواب بھی لکھا اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ مخزن الاسرار کے جواب میں مطلع الانوار

۲۔ شیریں خسرو شیریں کے جواب میں شیریں خسرو۔

۳۔ سکندر نامہ کے جواب میں آئینہ سکندری

۴۔ لیلیٰ مجنوں کے جواب میں مجنوں و لیلیٰ

۵۔ ہفت پیکر کے جواب میں ہشت بہشت

شہزادہ محمد کی شہادت پر خسرو کا مرثیہ بھی بے حد دلدوز اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے درباری
ملازمت کی وجہ سے خسرو کو ساری عمر قصیدہ گوئی کرنی پڑی۔ قصیدے میں انہوں نے انوری
ظہیر خاقانی اور کمال اسمٰعیل کی پیروی کی ان کے مدحیہ قصائد میں تکلف و تصنع بہت زیادہ
ہے ان کے شاہکار قصیدے پند و موعظت التصوف و سلوک و الٰہیات کے موضوع پر اور
سنائی کے رنگ میں ہیں ان مقاصد میں خسرو کا مراۃ الصفا اور بحر الابرار مشہور ہیں مولانا
جامی نے دونوں قصیدوں کا جواب لکھا۔

خسرو نے اپنی تاریخی مثنویوں میں تاریخی صحت کے ساتھ ساتھ لوازم قصہ گوئی کا بھی خیال رکھا ہے۔ یہ مثنویاں اس دور کی تہذیبی زندگی کا اعلیٰ مرقع پیش کرتی ہیں۔ خسرو پہلے شخص ہیں جنہوں نے خمسہ نظامی کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھیں۔ عام طور پہ یہ کہا جاتا ہے کہ آج تک خمسہ نظامی کے جواب لکھنے کی بعض کوششیں کی گئیں ان میں خسرو ہی کی کوشش کامیاب رہی اس کے باوجود نظامی کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خسرو نے خود بھی اسبات کا اعتراف کیا ہے۔

خسرو کی غزلیات حال و قال کی مجالس میں اب تک مقبول چلی آ رہی ہیں۔ اور ان کی مقبولیت زیادہ تر ان کی غزلوں ہی پر مبنی ہے۔ خسرو نے ابتدائی دور میں غزل گوئی میں سعدی کی تقلید کی لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے اس صنف میں اپنا ایک راستہ بنا لیا۔ خسرو کی غزل موسیقیت ان کے جذبہ درون اور عارفانہ چاشنی کی وجہ سے زیادہ مقبول ہوئی ہے

به خوبی همچو مه تابنده باشی — به ملک دلبری پاینده باشی
من درویش را کشتی بغمزه ! — کرم کردی الهی زنده باشی
جفا کم کن که فردا روز محشر — به روئے عاشقاں شرمنده باشی
ز قید دو جہاں آزاد باشم — اگر تو ہمنشین بنده باشی
جہاں سوزی اگر در غمزه آئے — شکر ریزی اگر در خنده باشی

به رندی و به شوخی همچو خسرو
ہزاراں خان ماں برکنده باشی

حسن سجزی

امیر خسرو کے جگری دوست اور پیر بھائی نجم الدین حسن بدایوں میں ۱۲۵۴ء/ ۶۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ ہاشمی الاصل تھے لیکن ان کے باپ دادا سجستان یا سیستان سے ہندوستان آئے تھے۔ انہوں نے دہلی میں تعلیم و تربیت پائی ان کی شاعری کی شہرت ہوئی تو غیاث الدین بلبن کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد امیر خسرو کے ساتھ انہیں بھی ملتان لے گیا۔ شہزادے کی شہادت کے بعد حسن واپس دہلی آ گئے۔ پھر کسی دربار کے ساتھ ان کی وابستگی کا پتہ نہیں چلتا البتہ علاؤ الدین خلجی اور اس کے متعلقین کی مدح میں اس کے قصاید موجود ہیں بقول برنی جلال الدین خلجی کی محفلوں میں ان کی غزلیں پڑھی جاتی تھیں محمد تغلق نے جب دار الحکومت دہلی سے دولت آباد منتقل کیا تو ۱۳۲۶ء/ ۷۲۷ھ میں یہ بھی وہاں چلے گئے۔ کیونکہ ان کے مرشد حضرت نظام الدین اولیا اور ان کے

دوست امیر خسرو کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے دہلی میں ان کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حسن نے دولت آباد ہی میں ۱۳۳۷ء/۷۳۸ھ میں وفات پائی۔ حسن نے ساری عمر صبر و قناعت کے ساتھ تجرد میں گزار دی بڑے خوش شکل اور خوش مزاج آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے مرشد کے ملفوظات کو فواد الفواد کے نام سے مرتب کیا۔

حسن کے دیوان میں قصاید کی ایک معقول تعداد موجود ہے لیکن ان کے قصیدوں میں جو خصوصیات موجود نہیں جو لازمہ قصیدہ سرائی ہوتی ہے ان کے دیوان میں رباعیات قطعات اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہیں لیکن شاعری میں ان کی شہرت کا دار و مدار ان کی غزلیات پر ہے۔ ان کی غزلیات کی بدولت انہیں سعدیِ ہندوستان کہا گیا ہے حسن نے عشق کی واردات کو بڑے سوز و گداز اور روانی سے بیان کیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے فیض تربیت نے انہیں جلا بخشی اور بعض وجدانی کیفیتوں کے تحت انہوں نے جو غزلیں لکھیں وہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ جامی نے حسن کے کلام کو سہل ممتنع کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے ۔

ہر قوم راست راہی دینی و قبلہ گاہی	ما قبلہ راست کردیم برسمت کج کلاہی
نیزای خطیب بہ خوان بر خطبہ کرداری	روپش نگر چو عیدی ابرو نماز گاہی
گر سرو و مہ ندیدی بایک دگر موافق	بالاش بین چو سرو بالای سرو ماہی
یا آنکہ کرد او بر قتل از دلم فراموش	هر گز بش بہ بینیم یاد آیدم گناہی
یارب نگاہ داری چشم و چراغ ما را	گرچہ نکرد ہرگز در حال ما نگاہی
عقل حسن چہ باشد اندر حضور عشقت	طفل جہاں ندیدہ در پیش بادشاہی

شیخ بو علی شاہ قلندر

شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندر ۱۲۰۸ء/۶۰۵ھ میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کر کے دہلی میں درس و تدریس میں مشغول رہے پھر یکایک ان کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر انہوں نے جنگل کی راہ لی۔ عمر بھر مجذوب رہے حالت جلال میں بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ علاؤ الدین خلجی ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ان کا انتقال پانی پت ہی میں ۱۳۲۴ء/۷۲۴ھ میں ہوا۔ غزلیات کے علاوہ ان کی دو مثنویاں کنز الاسرار اور رسالہ عشقیہ بھی مشہور ہیں۔ بعض محققین بو علی کے ساتھ ان

مثنویوں کے انتساب کو درست تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی غزلیں جذب و کیف سے معمور ہیں ؎

اگر بینم بیشی ناگہ من آن سلطان خوبان را — سر اندر پای وی آرم فدا سازم دل وجان را
فروزم آتشی در دل بسوزم قبلۂ عالم — پس آنگہ قبلہ سازم من آن ابروی جانان را
بیا ساقی کہ روی تو مرا شمع حرم باشد — بگردم گرد میخانہ بجو سم پای مستان را
دل و جان کردہ ام نذر جان اکنون پشیمانم — کہ گر یابم خریداری فروشم دین و ایمان را
شرف بر عندلیب از گفتن اشعار رندانہ — شکایت ہا ز اشعار تو ہر گبر و مسلمان را

سلطان محمد تغلق ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء — ۷۵۲ھ عالم شخص تھا۔ اور شعر و شاعری سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ مندرجہ ذیل تین شعر سلطان کے نام سے تذکروں میں مسطور ہیں۔

بسیار درین جہان چمیدیم — بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشستیم — ترکان گران بہا خریدیم
گشتیم اور تمام واز غفلت — امروز چو ماہ نو خمیدیم

محمد تغلق کے دربار میں ممتاز اور اہم شاعر بدر چاچ تھا۔

بدر چاچ

بدرالدین بدر، چاچ یا شاش یا تاشقند کا رہنے والا تھا۔ اور یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ وہ ہندوستان کب آیا چونکہ اس کے تمام قصائد محمد تغلق کی مدح میں ہیں۔ اس لئے یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی کے عہد یا اس سے وابستہ تھا۔ بدر چاچ عالم و فاضل شخص تھا۔ معقول و منقول کے علاوہ علم ہیئت نجوم و موسیقی میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ اس کے قصیدوں میں ان علوم کی اصطلاحات کا استعمال ملتا ہے۔ سلطان نے اسے فخر الزمان کا خطاب دے کر اس کی عظمت کا اعتراف کیا۔ اس کے قصیدوں میں بہت سے تاریخی حوالے بھی ملتے ہیں۔ ۷۴۴ھ/۱۳۴۳–۴۴ء میں یہ دہلی سے دارالحکومت کی منتقلی کے بعد دولت آباد چلا گیا۔ اسی سال اس نے اپنی مثنوی شاہنامہ مکمل کی۔

بدر چاچ کا کلام تکلف و تصنع میں جواب نہیں رکھتا۔ اس نے رعایات لفظی تضاد اور تجنیس کے استعمال میں کمال کر دکھایا ہے لیکن اس تکلف و تصنع کی وجہ سے کہیں کہیں اس کا کلام بالکل چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ عشق مجازی، عشق حقیقی اور عظمت انسان کے موضوع پر

اس نے چند قطعات بھی لکھے۔ عباسی خلیفہ کی طرف سے جب محمد تغلق کو فرمان و خلعت دہلی پہنچا۔ تو بدر چاچ نے ایک زوردار قصیدہ کہا جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

ملک را بازوی قوی شد دین سرافرازی نمود ۔۔۔ شرع را رحمت فزون شد رونق ایمان رسید

کیش داران صلوات رہبرای دین گرفت ۔۔۔ تشنہ لبان شریعت را حیات جان رسید

نان شاران کو بر فرق رسولان کرد شاہ ۔۔۔ چشم‌دار از شکر شاہی سر بہ ذنبان رسید

بدر کے کلام سے اس عہد کے دو اور شاعروں کے ناموں کا پتہ چلتا ہے ایک جمال شیخ جو اس کے ساتھ دولت آباد گیا اور دوسرے ناصر الدین جبلی جن کی ہجو میں بدر نے ایک قطعہ کہا

ضیا نخشبی بدایونی استادالشعرا شہاب الدین مہمرہ کے شاگرد تھے ایران پر منگولوں کی یورش کے دوران بخارا سے بدایوں آگئے تھے ساری زندگی عزلت میں بسر کر دی ان کی شہرت تو ان کی نثری تصانیف طوطی نامہ اور سلک السلوک کی وجہ سے ہے لیکن وہ شاعر بھی تھے ان کی ایک کتاب گلریز ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سے شائع ہو چکی ہے گلریز کا ایک حصہ منظوم ہے ڈاکٹر شیخ اکرام مرحوم نے نخشبی کی وفات ۷۵۱ھ میں لکھی ہے ۔

چنانچہ دارم دلش خوش پیامی ۔۔۔ کہ خواہد بہ رسید از مایک سلامی

بسوی روضۂ پاک رسولی ۔۔۔ کہ بی او عرش را نبود قبولی

بہ مدح حضرت محمود عالم ۔۔۔ محمد آن کہ شد مقصود عالم

جہان را راہ حق بنمودہ او ۔۔۔ مکان و لامکان پیمودہ او

ضیای نخشبی باشد غلامش
جہان زد سکہ شاہی بہ نامش

مطہر کڑہ مطہر بلاد مشرقی کے صدر مقام کڑہ میں (موجودہ الہ آباد کے قریب) پیدا ہوا۔ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی نے مطہر کے دیوان کے مطالعہ سے اس کی تاریخ پیدائش ۱۳۱۶ء / ۷۱۶ھ اور تاریخ وفات ۱۳۸۸ء / ۷۹۱ھ لکھی ہے مطہر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے جانشین حضرت چراغ دہلی کا مرید تھا۔ اور ان کی وفات پر اس نے ان کا مرثیہ لکھا۔ مطہر نے کئی قصیدے فیروز تغلق اور اس کے امراء کی تعریف میں لکھے۔ عین الملک ماہرو اس کا مربی خاص تھا۔ بدایونی نے مطہر کی علائیت پر چوٹ کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کے بعض قصائد سے روغن چراغ دان کی بو آتی ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے مطہر کے

دیوان کا انتخاب اور شیخ کا بیچ میگزین نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع کیا ہے بدایونی نے لکھا ہے کہ مطہر کا دیوان چندرہ سولہ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ مطہر نے چھوٹی بحروں میں سادہ اور شگفتہ غزلیں کہی ہیں چھوٹی بحر کی ان غزلوں کو شیخ الاکرام نے تیر و نشتر قرار دیا ہے ؎

راحت از روزگار نتواں یافت　　خرمی زیں دیار نتواں یافت

ای طلبگار وصل روز وصال !　　بی شب انتظار نتواں یافت

تا نسوزی وجود از محنت　　بوی مشک تتار نتواں یافت

پر سیمرغ و جیفۂ اکسیر　　نتواں یافت یار نتواں یافت

آخری تغلق بادشاہ محمود تغلق ۷۹۵ھ سے ۸۱۵ھ کے زمانے میں ایک اور شاعر قاضی ظہیر دہلوی کا نام ملتا ہے۔ بدایونی نے ان کے قصاید کی تعریف کی ہے اور اس نے قاضی ظہیر کے پانچ قصیدے نقل کئے ہیں۔

اس دور کی نثر

زیر بحث دور میں فارسی کا نثر کا وقیع سرمایہ ملتا ہے اس عہد میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء جیسی عظیم ہستی پیدا ہوئی۔ ان کے اثر اور ان کے خلفا اور مریدوں کی کوششوں سے مذہب و تصوف کے موضوع پر زیادہ لکھا گیا ویسے بھی یہ دور اشاعت اسلام کا تھا۔ اس قسم کی کتابوں ضرورت زیادہ تھی۔ تاریخ نویسی اس دور کا دوسرا بڑا موضوع رہی۔

ادبی کتب

طوطی نامہ ضیاء الدین نخشبی بدایونی م ۷۵۱ھ کی تصنیف ہے۔ طوطی نامہ کا اصل ماخذ سنسکرت کی ایک کتاب "شک سپ تتی" یعنی طوطے کی ستر کہانیاں ہے۔ نخشبی کے طوطی نامے میں صرف ۵۲ کہانیاں ہیں۔ ۵ سنسکرت کی کتاب سے اور دو بتیسیا نامہ سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب سنسکرت سے براہ راست ترجمہ نہیں ہوئی بلکہ نخشبی نے اس کے کسی فارسی ترجمے کو بہتر انداز میں دوبارہ لکھا۔ اس کتاب کے دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ حمیدی لاہوری نے ۹۰۰ھ میں اس کا منظوم ترجمہ کیا ابوالفضل نے بھی عہد اکبری میں اسے آسان فارسی میں لکھا۔ فورٹ ولیم کالج کے منشی حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی کے نام سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ نخشبی کی عبارت مصنوع اور پر تکلف ہے۔

اعجاز خسروی امیر خسرو کی یہ نثری تصنیف ۱۹/۱۳۱۹ء ۷۱۹ھ میں مکمل ہوئی اس میں نثر نویسی کے مختلف اسالیب اور محاسن سے مفصل بحث کی گئی ہے امیر خسرو کی غزل میں جتنی سادگی ہے ان کی نثر میں اتنا ہی تکلف ہے۔

مقدمات امیر خسرو نے اپنے پانچوں دیوانوں پر مفصل مقدمے لکھے ہیں جو ادبی محاسن کے حامل ہیں ان میں غرۃ الکمال کا دیباچہ مفید معلومات کا حامل ہے۔

انشای ماہرو عین الملک ماہرو خلجی اور تغلق دور کا ایک ممتاز انشا پرداز تھا انشای ماہرو پروفیسر عبد الرشید صاحب نے مرتب کر کے پنجاب یونیورسٹی کے اہتمام سے شائع کرائی ہے۔ ماہرو کی نثر، نثر فنی کا اعلیٰ نمونہ ہے نثر مصنوع میں جتنے صنائع بدائع استعمال ہو سکتے ہیں۔ وہ سب اس نے کئے۔ اس کی تحریروں میں عربی الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ جملے بے حد طویل لکھتا ہے مرزا محمد منور صاحب نے ماہرو کو ہندوستان کے عظیم انشا پردازوں امیر خسرو، محمود گاوان اور ابو الفضل کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

ماہرو خلجی اور تغلق عہد میں سیاسی لحاظ سے بڑے اہم مناصب پہ فائز رہا ہے اس لئے اس کے خطوط اس دور کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

کتب تاریخ

اس عہد میں نثر و نظم دونوں میں تاریخ لکھی گئی نظم میں امیر خسرو کی حسب ذیل مثنویاں قابل ذکر ہیں۔

(۱) **قران السعدین** اس کا موضوع معز الدین کیقباد اور اس کے باپ بغرا خان ولد غیاث الدین بلبن کی صلح ہے۔

(۲) مفتاح الفتوح میں جلال الدین خلجی کی فتوحات کا ذکر ہے۔

(۳) **دولرانی خضر خان** جلال الدین خلجی کے بیٹے خضر خان کی دولرانی (دختر راجۂ گجرات) کے ساتھ عشق و شادی کا بیان ہے۔

(۴) نہ سپہر میں مبارک شاہ خلجی کے عہد حکومت کے واقعات ہیں۔

(۵) تغلق نامہ غیاث الدین تغلق کے بارے میں ہے۔

امیر خسرو کے علاوہ خواجہ عبدالملک عصامی نے فتوح السلاطین کے نام سے غزنوی دور سے ۱۳۵۰ء تک کے واقعات پر مشتمل منظوم تاریخ لکھی ہے۔

نثری تاریخیں

تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاءالدین برنی

ضیاءالدین برنی ۱۲۸۵ء / ۶۸۴ھ کے لگ بھگ

بران (موجود بلند شہر — یوپی بھارت) میں پیدا ہوا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا مرید تھا۔ امیر خسرو اور حسن سے اس کے دوستانہ مراسم رہے۔ اس کے والد اور عزیز دربار سے وابستہ تھے۔ اپنے علم و فضل اور لطافت طبع کی بدولت محمد تغلق کا بہترین ندیم ثابت ہوا۔ اس نے اپنی کتاب سلطان فیروز شاہ کے نام سے منسوب کی اس کی موت اس بادشاہ کے زمانے میں ۷۵۸ھ میں بڑی کس مپرسی کے عالم میں ہوئی۔ تاریخ فیروز شاہی اصل میں طبقات ناصری کا تکملہ ہے اور اس میں خاندان غلامان کے سلطان بلبن کی تخت نشینی ۶۶۴ سے سلطان فیروز شاہ تغلق کے چھٹے سال جلوس ۷۵۸ھ تک کے واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب طبقات ناصری سے کہیں زیادہ دلچسپ شگفتہ اور معلوماتی ہے۔ برنی تاریخ نویسی میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھتا تھا۔ وہ واقعات سے زیادہ ان کے نتائج کو اہمیت دیتا تھا۔ اس طرح تاریخ کو وہ سرمایہ عبرت و بصیرت بنا دیتا ہے وہ تاریخ میں حقیقت نگاری اور غیر جانبداری پر زور دیتا ہے۔ برنی کی تاریخ بادشاہوں کی مدح سرائی تک محدود نہیں بلکہ وہ ان کے اعمال کا احتساب کرتا ہے۔

تاریخ فیروز شاہی میں تاریخی واقعات کے ساتھ اس دور کے معاشرے کی جھلک بھی نظر آتی ہے اس نے بادشاہوں کی عیش و نشاط اور علمی و مذہبی مجلسوں کا حال بھی لکھا ہے کتاب کی عبارت مرصع اور رنگین ہے لیکن معانی کو الفاظ پر قربان نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ عنایت نامہ، مآثر سادات، اور حسرت نامہ بھی اس کی تصانیف ہیں۔

اخبار برمکیاں

اصل کتاب عربی میں ابوالقاسم محمد طائفی کی تصنیف تھی ضیاءالدین برنی نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ برمکیوں کے عروج و زوال کی یہ عبرتناک داستان برنی کے نظریۂ تاریخ سے پوری مطابقت رکھتی ہے برنی نے اس

ترجمے میں دو حکایتیں اپنی طرف سے شامل کی ہیں ۔ اور آخر میں فیروز شاہ کی شہادتوں کا بیان بھی ہے ترجمہ سلیس اور رواں ہے ۔

خزائن الفتوح (تاریخ علائی) امیر خسرو کی نثری تصنیف ہے اور علاؤالدین خلجی کے عہد کی مختصر تاریخ ہے اس میں ۶۹۵ — ۷۱۱ / ۱۲۹۰ — ۱۳۱۱ تک کے واقعات کا بیان ہے ۔

تغلق نامہ[1] یہ کتاب امیر خسرو کی مثنوی تغلق نامہ سے الگ چیز ہے یہ محمد تغلق کی تصنیف ہے اس کا ایک نسخہ ابرٹش میوزیم میں محفوظ ہے جو صرف دو اوراق پر مشتمل ہے اور کتاب کا یہ حصہ طبقات ناصری کے ایک قلمی نسخے کے آخر میں آیا ہے ریوئے اس کو محمد تغلق کی تصنیف قرار دیا ہے ۔ اس کتاب کا موضوع تاریخ ہی ہے ۔

فتوحات فیروز شاہی یہ سلطان فیروز شاہ تغلق کی تصنیف ہے لیکن اس میں سلطان کی جنگوں یا فتوحات کی بجائے نظم و نسق اور رفاہ عامہ کے سلسلے میں جو کارنامے سلطان نے انجام دیئے ان کا ذکر ہے ۔ سلطان نے اذیت ناک سزاؤں اور ناجائز محصول منسوخ کر دیئے ۔ اس نے کئی نئے شہر ، مساجد اور خانقاہیں بنوائیں سرکاری شفاخانے کھولے اس کتاب میں ان سب کا بیان ہے ۔

تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف شمس سراج عفیف ۷۵۱ھ یا ۷۵۷ھ میں پیدا ہوا اس کا باپ

---

[1] ، عہد تغلق کے مصنفین از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین ۱۹۴۰ء

دیوان وزارت میں ملازم رہا ۔ عفیف سلطان فیروز شاہ کے دربار میں پروان چڑھا اور ہانسی کے شیخ قطب الدین خلیفہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا مرید تھا ۔ تیمور کے حملے کا اس کے دل و دماغ پر بڑا اثر پڑا ۔ یہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے کی عمومی تاریخ ہے اس میں اس کی فتوحات اور رفاہ عامہ کے کاموں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے برنی کی تاریخ فیروز شاہی کے مقابلے میں اس کا کوئی درجہ نہیں لیکن اپنی جگہ یہ بھی اہم کتاب ہے ۔

فرہنگ

فرہنگ قواسی

برصغیر میں فارسی زبان کا پہلا لغت ہے جسے محمد فخرالدین مبارک شاہ قواس غزنوی نے لکھا عربی الفاظ پر مصنف کی توجہ زیادہ رہی ہے کتب خانہ حمیدیہ بھوپال کا نسخہ بڑی تقطیع کے ۲۰۴ صفحات اور بیس ہزار الفاظ کے معانی پر مشتمل ہے قواس کو علاء الدین خلجی ۶۹۵ – ۷۱۵ کے شعرا میں شامل تھا۔ دستور الافاضل مولانا رفیع دھلوی کا مرتب کردہ لغت ہے کتاب ۷۴۳ھ / ۴۳-۱۳۴۲ء میں مکمل ہوئی۔

کتب مذہب وتصوف

تفسیر تاتارخانی

فیروز تغلق $\frac{\text{۷۵۲ – ۷۹۰}}{\text{۱۳۵۱ – ۱۳۸۸}}$ کے ایک علم دوست امیر تاتار خان کے نام کسی عالم نے یہ تفسیر لکھی۔ عالم کا نام معلوم نہیں۔

فقہ فیروزشاہی

سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں مولانا یعقوب مظفر کرامی نے اسے شروع کیا۔ لیکن وہ اسے مکمل نہ کر سکے سلطان نے ان کی وفات کے بعد دوسرے علماء سے مکمل کرایا۔

فتاوی قراخانی

فقہ کے موضوع پر یہ بھی مولانا یعقوب مظفر کرامی کی کتاب ہے کتاب سوالاً جواباً ہے سوال فارسی اور جواب میں عربی

حوالے بکثرت دیئے گئے ہیں۔

فتاوی تاتارخانی

مولف کا نام فرید الدین ہے م ۱۳۴۴/۷۸۶ء کے لگ بھگ انھوں نے وفات پائی۔ ابراہیم بن محمد حلبی نے ۹۵۶ھ/۴۹-۱۵۴۸ء میں اس کا عربی میں خلاصہ کیا۔ جو تاتارخانیہ کے نام سے اب بھی شامل درس ہے۔

مجموعہ خانی فی عین المعانی

فقہ میں صدر جہان قاضی القضاۃ کمال الدین ناگوری کی کتاب ہے۔ اس کی عبارت سادہ ہے۔

فوائد فیروز شاہی

ملا محمد العطاری کی تصنیف ہے ایک سو پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب میں مذہب، اخلاق اور معاشرت کا تقریباً ہر پہلو زیر بحث آگیا ہے۔

فتاوئی جہانداری

ضیاء الدین برنی کی تالیف ہے جس میں اس نے فقہ، قانون اور رسم ورواج کو مفکرانہ انداز میں موضوع گفتگو بنایا ہے۔

صحیفۂ نعت محمدی ضیاء الدین کی ہندوستان کے مخصوص مذہبی اور سیاسی معاملات پر ایک عمدہ تصنیف ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ رامپور کی لائبریری بھی ہے۔

تصوف کے موضوع اور متعلقات پر اس دور میں اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان پر مفصل بحث، موجودہ کتاب میں ممکن نہیں اس لئے ان کتب کے ناموں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(۱) نزہتہ الارواح
(۲) الارواح
(۳) صراط مستقیم
(۴) طرب المجالس

شیخ امیر حسینی کی تصانیف ہیں جو ہرات کے رہنے والے تھے لیکن حضرت زکریا ملتانی کے مرید تھے۔ ۷۲۹ھ تک زندہ تھے۔

مکتوبات بو علی شاہ قلندر م ۱۳۲۴/۲۴ ۷، شاہی حاجب اختیار الدین کے نام بو علی کے مکتوبات ہیں پند و نصیحت کی صورت میں اسرار توحید کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۱) شمائل الاتقیا
(۲) رسالہ غریب
(۳) رموز الوالہین
(۴) افکار المذکور
(۵) تفسیر رموز

یہ سب کتب خواجہ رکن الدین بن عماد دبیر کاشانی کی تصانیف ہیں پہلی کتاب کے سوا باقی سب آج کل ناپید ہیں خواجہ صاحب کا انتقال دولت آباد دکن میں ۱۳۳۱/۳۲ ۷ھ میں ہوا۔

(۱) عشرہ مبشرہ
(۲) سلک السلوک
(۳) ناموس اکبر

ضیاء نخشبی بدایونی کی م ۷۲۱ھ کی تصانیف ہیں۔ سلک السلوک ۱۵۱ ابواب پر مشتمل ہے تصوف کے اسرار و اصطلاحات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

(۱) سفر نامہ
(۲) رسالہ مکیہ
(۳) اربعین صوفیہ
(۴) ترجمہ قرآن مجید

سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت م ۷۸۵ھ کی تصانیف ہیں، رسالہ مکیہ قطب الدین دمشقی م ۱۳۷۹ء ۷۸۰ھ کے عربی رسالے کا ترجمہ ہے۔

(۱) مکتوبات
(۲) شرح آداب المریدین
(۳) فوائد رکنی
(۴) رسالہ مکیہ فردوسیہ
(۵) ارشاد الطالبین
(۶) ارشاد السالکین
(۷) فوائد المریدین
(۸) اجوبہ
(۹) عقائد اشرفی
(۱۰) لطائف المعانی
(۱۱) وصول الی اللہ
(۱۲) تمہ مخک الطالبین

یہ کتب مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری م ۱۳۸۱ء / ۷۸۲ھ کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان کے مکتوبات علوم معارف کا خزینہ اور آداب و دانش کا گنجینہ ہیں بقول شیخ محمد اکرام پاک و ہند کے اسلامی فلسفے کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے حضرت یحییٰ کے مکتوبات قیمتی مواد کے حامل ہیں۔

(۱) کتاب التمہیدین
(۲) ام الصحائف
(۳) یوسف زلیخا
(۴) مراۃ العارفین

حضرت خواجہ مسعود بک یا مسعود بیگ رح کی تصانیف ہیں فیروز شاہ تغلق کے اقرباہی سے تھے۔ زندگی کا ایک حصہ بڑی شان و شوکت سے بسر کیا۔ اس کے بعد درویشی اختیار کر لی۔ اکثر حالت سکر میں رہتے تھے اور حقیقت کو بیان کرنے میں قید شریعت کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے ۱۳۹۷/۸۰۰ھ میں ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر جمنا میں بہا دیا گیا۔ ان کا اسلوب ابن عربی کی طرح فلسفیانہ ہے۔

(۱) بشارۃ المریدین
(۲) مکتوبات اشرفی

سید اشرف جہانگیر سمنانی م ۱۴۰۵/۸۰۸ھ کی تصانیف ہیں۔ ان کا مزار کچھوچھہ شریف نجارت میں ہے۔

سیر الاولیاء

برصغیر کے اولیائے چشت کا بہترین تذکرہ ہے مولف کا نام سید محمد مبارک کرمانی المعروف امیر خورد ہے سال تالیف ۱۳۶۰/۷۶۱ھ

راحت القلوب

شیخ مسعود فرید الدین گنج شکر م ۱۲۶۴/۶۶۱ھ کے ملفوظات ہیں جنہیں حضرت نظام الدین اولیاء م ۱۳۲۳/۷۲۴ھ نے مرتب کیا۔

فوائد الفواد حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں ان کو نجم الدین حسن سجزی نے مرتب کیا۔ ملفوظات کے کسی اور مرتب کو وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو حسن سجزی کو ہوئی۔ امیر خسرو جیسا عظیم شخص یہ کہا کرتا تھا۔ کہ کاش میری تمام تصنیفات حسن کے نام ہوتیں اور یہ کتاب میرے نام ہوتی حسن گیارہ برس تک مسلسل مرشد کی صحبت میں رہے اور ان کے ملفوظات جمع کرتے رہے۔ اور پندرہ برس میں انہوں نے فوائد الفواد مکمل کی۔ حسن پرتکلف نثر لکھنے پر قادر تھے۔ لیکن اس کتاب کا انداز بیان بڑا سادہ اور سلیس ہے۔

افضل الفوائد بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں ان کے مرتب امیر خسرو ہیں۔

راحۃ المحبین بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں مرتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

خلاصۃ الالفاظ جامع العلوم ملفوظات سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہان گشت م ۸۵ ۷ مرتبہ ابو عبداللہ علاؤ الدین

سراج الہدایہ ملفوظات سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہان گشت م ۸۵ ۷ ھ مرتبہ مولانا عبداللہ

جواہر جلالی ملفوظات سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہان گشت م ۸۵ ۷ ھ مرتبہ احمد الدعو۔

خیر المجالس حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے جانشین حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی م ۱۳۵۶ء / ۵۷ ۷ ھ کے ملفوظات ہیں جن کو خواجہ حمید قلندر نے مرتب کیا۔ یہ کام ۱۳۵۵/ ۵۶ ۷ ھ میں مکمل ہوا۔

مفتاح العاشقین بھی چراغ دہلی کے ملفوظات ہیں مرتب کا نام محب اللہ ہے۔

خوان پر نعمت / معدن المعانی / راحت القلوب حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری م ۱۳۸۰ء / ۸۲ ۷ ھ کے ملفوظات ہیں جن کو زین بدر عربی نے جمع کیا ہے۔

لطائف اشرفی سید اشرف جہانگیر سمنانی م ۱۴۰۵/۸۰۸ھ کے ملفوظات ہیں جن کو نظام الدین یمنی نے مدون کیا۔

متفرقات

(۱) **شفاء الخانی** عبدالکریم قوام ناگوری م ۱۳۹۱/۷۹۴ھ کی علم طب کے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے اور سلطان خضر خان گجراتی کے نام منسوب ہے۔

(۲) **جزئیات وکلیات** یہ کتاب فارسی نظم ونثر میں علم تشریح البدن پر ضیاء الدین نخشبی بدایونی کی کتاب ہے۔

(۳) **دلائل فیروزشاہی** نجوم کے موضوع پر عزیز الدین خالد خانی کی تصنیف ہے جو کسی سنسکرت کتاب کا ترجمہ ہے اور فیروز تغلق کے نام سے منسوب ہے۔

(۴) **غنیۃ المنیۃ** فیروز تغلق کے زمانے میں موسیقی کے موضوع پر لکھا گیا ہے رسالہ ہے مصنف معلوم نہیں۔

(۵) **کنز التحف** ۱۴۰۵/۷۵۶ھ میں تصنیف ہوئی اس کا موضوع بھی موسیقی ہی ہے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

سید و لودھی خاندان

۸۱۷ — ۸۵۲ھ ۸۵۲-۹۳۲ھ

۱۴۱۴ — ۱۴۵۱ء ۱۴۵۱-۱۵۲۶ء

تغلق خاندان کے زوال اور خاتمے کے زمانے میں ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں بنگال، جونپور، مالوہ اور گجرات قابل ذکر ہیں۔ محمد تغلق کے آخری زمانے میں دکن میں سلطنت بہمنی وجود میں آچکی تھی۔ جو بعد میں برار، بیدر، احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ یہ تمام حکومتیں فارسی زبان وادب کے فروغ کے لئے کام کرتی رہیں۔ ہندوستان پر ۱۳۹۸/۸۰۰ھ میں تیمور کے حملے کے وقت یا اس سے پہلے تمام اہل کمال دہلی چھوڑ کر ان مقامات پر چلے گئے تھے وہاں کے بادشاہوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ

لیا۔ جونپور تو علم و فضل کا ایسا مرکز بنا کر شاہجہان اسے شیراز ہند کہا کرتا تھا۔ بنگال کے ایک بادشاہ سلطان غیاث الدین نے خواجہ حافظ کو بنگال آنے کی دعوت دی تھی۔ گجرات اور مالوہ میں بھی اسلامی علوم نے بہت ترقی کی۔ دکن میں محمود گاواں جیسی شخصیت نے علم و ادب کی سرپرستی کی۔ سیّد خاندان کے عہد حکومت میں دہلی میں کوئی ادبی سرگرمی نظر نہیں آتی۔ خود مختار ریاستوں میں البتہ اس کی گرم بازاری رہی۔ لودھیوں کے دور میں سلطان سکندر کا زمانہ فارسی ادب کی ترقی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے جس سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس عہد میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنی شروع کی اور انہیں فارسی سکھانے کا اہتمام سرکاری طور پر کیا گیا۔ اس دور کا سرمایہ اب محفوظ نہیں رہا ممکن ہے مغلوں نے آکر لودھیوں کے زمانے کی دوسری چیزوں کے ساتھ ادبی آثار بھی مٹا دیئے ہوں۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لودھیوں کے زمانے میں فارسی زبان میں ہندوستانی عناصر کی آمیزش بہت زیادہ ہو گئی ... مغلیہ دور میں ایرانیوں کی بہت بڑی تعداد ایران سے ہندوستان آئی۔ اور ان کی آمد سے ہندوستان کی فارسی کا رنگ ہی بدل گیا اور اس بدلے ہوئے رنگ کے سامنے لودھیوں کے زمانے کے فارسی آثار بالکل ماند پڑ گئے۔ اور اس طرح ان کی حفاظت نہ ہو سکی۔

اس عہد کے شعراء

سلطان سکندر شعراء کا بڑا قدردان تھا۔ اور خود بھی شعر کہتا تھا۔ اس کا تخلص گلرخ تھا۔ بدایونی نے اس کے مندرجہ ذیل اشعار منتخب التواریخ میں نقل کئے تھے۔

سروی ز سمن پیرہن و گل بہ نشستش — روحی ست مجسم کہ در آن پیرہنستش
مشک ختنی چیست کہ صد مملکت چین — در حلقۂ آن زلف شکن در شکنستش
از سوزن مژگان بکشم رشتۂ جان را — تا چاک بدوزم کہ در آن پیرہنستش
گلرخ چو کند جوہر دندان ترا وصف — ہم چون دُرِ سیراب سخن در دہنستش

مجد الدین باری

سکندر لودھی کے زمانے کا شاعر تھا۔ اس نے ایک شاہنامہ لکھا جس میں خوارزم شاہیوں کے مفصل حالات کا بیان ہے تذکروں میں باری کی یہ رباعی ملتی ہے۔

در پیش تو گر بگریم ای دلارام — ناخن بزنی کہ از تو در آزادم
خط تو کہ دود آتش نیکوئی است — در چشم من آمد آب زان می بادم

برہمن

بعض محققین نے اس کا نام چندر بھان لکھا ہے۔ علوم رسمی کی تدریس کے ساتھ ساتھ شعر بھی کہا کرتا تھا۔ اس کا یہ مطلع مشہور ہے۔

دل خون نشدی چشم تو خنجر نشدی گر — رہ گم نشدی زلف تو ابتر نشدی

شیخ رزق اللہ دھلوی

شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے چچا تھے نہایت عالم فاضل شخص تھے۔ ہندی اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص مشتاقی تھا ان کی وفات ۹۰۷ھ میں ہوئی۔

جمالی

حامد بن فضل اللہ جمالی کا اصل نام جلال الدین تھا۔ اور پہلے اپنے نام کی مناسبت سے جلالی تخلص کرتے تھے۔ لیکن بعد میں اپنے مرشد اور سسر شیخ سماء الدین کے کہنے پر جمالی تخلص رکھا۔ دہلی میں تحصیل علوم سے فارغ ہو کر سیاحت پہ نکلے اور ایران، عراق، عرب، اور فلسطین کا سفر کیا اور اس سفر کے دوران مولانا عبد الرحمٰن جامی حسین واعظ کاشفی کاتبی جیسے اور عبد الغفور لاری جیسے اکابر علماء صوفیا سے ملاقات ہوئی۔

سلطان سکندر لودھی $\frac{\text{۸۹۴ھ — ۹۲۳ھ}}{\text{۱۴۸۸ء — ۱۵۱۷ء}}$ جمالی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اور وہ اپنا کلام بھی انہیں دکھایا کرتا تھا۔ سلطان کی وفات پر جمالی نے پُر اثر دردناک مرثیہ کہا۔ مغل بادشاہوں ظہیر الدین بابر اور نصیر الدین ہمایوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات اچھے رہے۔ جمالی کا انتقال ۱۵۳۵ء/۹۴۲ھ میں ہوا ——— ۶

شاعری میں ایک دیوان مثنوی مہر و ماہ اور مثنوی مرآۃ المعانی ان کی یادگار ہیں سیر العارفین جمالی کی نثری تصنیف ہے۔ دیوان، قصائد، غزلیات، ترجیع و ترکیب بندوں، قطعات و رباعیات اور چند چھوٹی مثنویات پر مشتمل ہے۔ ان کے قصائد میں لفظی شکوہ ہے اور نہ مبالغہ و اغراق انہوں نے سلیس و رواں زبان میں بڑے خلوص کے ساتھ اپنے ممدوحین کی مدح کی ہے۔ تصوف انکی شاعری کا خاص جوہر ہے مرآۃ المعانی میں ان الفاظ کے اصطلاحی معانی بیان کیے گئے ہیں جو محبوب حقیقی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی غزل بھی سوز و گداز کی حامل ہے۔

جانان بپرسی تو شب ما چسان گذشت — باد وزید چنین برسید و چنان گذشت
تیر غمت کہ بر سپر سینہ ام رسید — دل را شگافت و بر جگر آمد زجان گذشت

گفتی گزر زجان وجہان از برای من — چون جان توئی زجان وجہاں ہیران گزشت

ازچشم مردمان ہمہ خونابہ شد روان
درمجلسی کہ ذکر جہانی روان گزشت

اس دور کی نثر

سید دور کے خاندان میں صرف ایک تاریخ لکھی گئی ۔ سلطان سکندر کے دربار میں نامور علماء جمع تھے سلطان ان کے مباحثوں سے لطف اندوز ہوتا تھا ۔ ان علماء میں شیخ اللہ دیا ۔ شیخ عبداللہ تلنبی شاہ جلال شیرازی ، شیخ عبدالوہاب بخاری ، شیخ حسن طاہر کے نام لئے جا سکتے ہیں لیکن ان کی فارسی تصانیف ہم تک بہت کم پہنچی ہیں ۔ کتب تصوف اس دور میں بھی کافی لکھی گئیں ۔ تاریخی کتابیں خود مختار حکومتوں کی سرپرستی میں زیادہ تالیف ہوئیں اس عہد میں فارسی زبان کے کئی لغت بھی مدون کئے گئے ۔

کتب تاریخ

تاریخ مبارک شاہی — یہ تاریخ شہاب محمد غوری سے لیکر سلطان سید محمد ۹۴۹ھ کے زمانے کے حالات پر مشتمل ہے واقعات کے بیان میں اختصار سے کام لیا گیا ہے مصنف کا نام یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی ہے یہ کتاب ۸۵۰/۱۴۴۲ء کے قریب لکھی گئی اور سید خاندان کی مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے ۔

مآثر محمود شاہی — یہ کتاب مالوہ کے بادشاہ سلطان محمود خلجی ۸۳۹ھ — ۸۷۳ھ / ۱۴۳۶ — ۱۴۶۹ء کے عہد حکومت کی ایک مفصل تاریخ ہے مصنف کا نام علی بن محمود کرمانی اور شہاب حکیم اس کا لقب تھا ۔ یہ تاریخ اس نے سلطان کی وفات کے بعد اس کے جانشین سلطان غیاث الدین کی فرمائش پر لکھی کتاب کا انداز تحریر پر تکلف ہے نثر میں عربی فارسی اقوال و اشعار کی آمیزش ہے ۔

طبقات محمود شاہیہ — یہ تاریخ محمود شاہ بیگڑا گجراتی ۸۶۳ھ — ۹۱۷ھ / ۱۴۵۹ — ۱۵۱۱ء کے ایما پر لکھی گئی ۔ یہ کتاب ایک فاتحہ اور نو طبقات پر مشتمل ہے فاتحہ میں حضور اکرم صلعم کا ذکر ہے ہر طبقے میں ایک صدی کے حالات سال بسال دیئے گئے ہیں ۔

تاریخ ناصری یا ناصر شاہی یہ تاریخ مالوہ کے بادشاہ سلطان ناصر الدین ۹۰۶-۹۱۶ھ / ۱۵۰۰-۱۵۱۱ء کے عہد حکومت کے واقعات پر مشتمل ہے۔

کتب تصوف و مذہب

سیر العارفین یہ شیخ فضل جمالی کنبوہ ۹۴۲ھ کی تصنیف ہے یہ ہندوستان کے اولیاء کرام کا تذکرہ ہے اس میں زیادہ تر چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کا ذکر ہے ملتان کے سہروردی سلسلے کے کچھ اولیاء کے حالات و کرامات بھی سیر العارفین میں بیان ہوئے ہیں۔

مناقب غوثیہ یہ کتاب شیخ عبد القادر جیلانی غوث الاعظم کے مناقب پر ۸۰۰ھ میں محمد صادق شہابی نے لکھی۔

مناقب شاہ مینا یہ لکھنؤ کے مشہور صوفی محمد بن قطب چشتی جو شاہ مینا ۸۸۴ھ کے نام سے مشہور ہیں یہ کتاب ان کے حالات زندگی اور تعلیمات پر مشتمل ہے مؤلف کا نام محی الدین بن حسین رضوی ہے۔

منبع الانساب یہ کتاب ۱۴۲۷ / ۸۳۰ھ کے لگ بھگ تالیف ہوئی مؤلف کا نام سید معین الحق ہے اس میں نسب ناموں کے علاوہ تصوف سے متعلق کئی موضوعات پر مفید معلومات ملتی ہیں۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد ۸۲۵ھ کی تصانیف کی تعداد ایک سو پانچ بتائی گئی ہے لیکن ان کی اہم کتابوں کے نام یہ ہیں (۱) تفسیر القرآن (۲) شرح فصوص الحکم (۳) شرح آداب المریدین (۴) شرح تعرف (۵) وجود العاشقین (۶) رسالہ اذکار (۷) حدائق الانس (۸) اسماء الاسرار (۹) حظائر القدس۔

حضرت شیخ سماء الدین دہلوی ۱۴۹۶ / ۹۰۱ شیخ جمال کے مرشد تھے۔ انہوں نے شیخ فخر الدین عراقی کی کتاب لمعات پر حواشی لکھے ایک اور رسالہ مفتاح الاسرار بھی ان کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔

سید محمد مکی الدہلوی ۱۴۸۶ / ۸۹۱ کی تصنیف بحر المعانی کا شمار تصوف کی اہم کتب میں ہوتا ہے۔

قاضی شہاب الدین احمد دولت آبادی ۱۴۴۵ / ۸۴۹ بڑے فاضل شخص تھے۔

جونپور کا بادشاہ ابراہیم شرقی ان کی بہت عزت کرتا تھا ان کی تصانیف ہیں، تفسیر بحر مواج بڑی اہمیت رکھتی ہے طرز بیان انتہائی سادہ ہے۔

علوم

معدن الشفا یا طب سکندری مؤلف کا نام میاں بھوہ ہے اس کا شمار سکندر لودھی کے جلیل القدر امراء میں ہوتا ہے۔ کتاب کا موضوع طب تھا۔ میاں بھوہ نے سنسکرت کی مختلف کتابوں سے استفادہ کر کے ۹۰۸ھ میں اس کتاب کو مرتب کیا۔

لغت

ادات الفضلاء قاضی خان محمد بدر دہلوی نے ۱۴۱۹ء/ ۸۲۲ھ میں اس لغت کی تدوین مکمل کی۔ زیادہ الفاظ شعرا کے دواوین سے جمع کئے گئے ہیں۔ اسی لئے فارسی میں عام استعمال ہونے والے الفاظ کے معانی اس میں نہیں ملتے لغت میں مفرد الفاظ اور مرکب کلمات کے معانی دو الگ الگ حصوں میں دیئے گئے ہیں۔ ترتیب الفاظ میں پہلے اور دوسرے حروف کی رعایت رکھی گئی ہے۔

زفان گویا بدر ابراہیم کی یہ تالیف ۸۲۲ – ۸۳۷ھ کے درمیان مکمل ہوئی اس کے دنیا میں دو نسخے موجود ہیں ایک بانکی پور پٹنہ کی خدابخش لائبریری اور دوسرا لینن گراڈ میں محفوظ ہے اس کی تدوین میں مستند فرہنگوں سے مدد لی گئی ہے۔

مفتاح الفضلا مؤلف کا نام محمد بن داؤد ہے اور اس نے یہ لغت مالوہ کے بادشاہ محمود خلجی کے زیر سرپرستی ۱۴۶۹ء/ ۸۷۳ھ میں تالیف کی اس کا انداز پرانی فرہنگوں جیسا ہی ہے۔

شرفنامہ منیری مؤلف کا نام شیخ ابراہیم قوام فاروقی ہے اس نے لغت کا نام اپنے مرشد سید شرف الدین احمد یحییٰ منیری ۶۹۸ء/ ۷۸۱ کے نام پر رکھا ہے شیخ ابراہیم نے اس لغت میں ہر فصل کے آخر میں ترکی الفاظ الگ دیئے ہیں ۱۴۶۲ء/ ۸۶۷ھ میں مکمل ہوا۔

تحفۃ السعادت یہ لغت محمود بن ضیاء الدین نے سکندر لودھی کے عہد میں ۱۵۱۰ء/۹۱۶ھ میں مدون کی اس میں الفاظ کی تعداد محدود ہے۔

موید الفضلا محمد بن شیخ لاد دھلوی نے اسے ۹۲۵ھ میں مکمل کیا۔

منشآت

خواجہ عماد الدین محمود گاواں متقول ۱۴۸۱ء/۸۸۶ھ سلطنت بہمنیہ کا ایک ممتاز وزیر تھا۔ عالم و فاضل شخص تھا۔

مناظر الانشاء اور ریاض الانشاء اس کی دو کتابیں ہیں۔ مناظر الانشاء میں اس نے انشا کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ریاض الانشاء اس کے عزیزوں اور دوستوں کے نام خطوط کا مجموعہ ہے جس کی نثر بے تکلف ہے۔

فارسی ادب وادیٔ جموں وکشمیر میں

خلجی اور تغلق بادشاہوں کے معاصر عہد میں فارسی زبان کشمیر میں رواج پذیر ہونے لگی۔ کشمیر اور ایران قدیم کے درمیان اگرچہ قبل از اسلام ایام میں بھی روابط قائم رہے۔ اور اسلام کی آمد سے ان روابط میں اضافہ ہوا۔ مگر آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے اوائل سے قبل فارسی ادب وادی میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکا۔ اس دوران حضرت سید شرف الدین عبدالرحمٰن بلبل شاہ ترکستانی (م ۷۲۷ھ) حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہانگشت (م ۷۸۵ھ) حضرت میر سید علی ہمدانی شاہ ہمدانی (م ۷۸۶ھ) اور آخر الذکر کے ساتھیوں جیسے میر سید حسین سمنانی، میر سید تاج الدین سمنانی وغیرہم کے ذریعے اشاعت اسلام اور اشاعت فارسی (وعربی) کا کام آگے بڑھا۔ کشمیر کا پہلا مسلمان حاکم سلطان صدر الدین (م ۷۲۸ھ) تھا۔ اس کے پندرہ سال بعد ۷۴۳ھ میں شاہمیری سلاطین کی حکومت قائم ہوئی جو ـــــــ تک قائم رہی۔ مختصر عرصے کے لئے چک سلاطین برسر اقتدار اور اس کے بعد ۹۹۳ھ/۱۵۸۶ء میں یہ خطہ اکبر اعظم کی مغلیہ حکومت کا جزو قرار پایا۔

شاہمیری اور چک سلاطین کے عہد میں کشمیر میں فارسی زبان و ادب کی خاطر خواہ ترویج ہوئی۔

تفصیل کی خاطر مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

۱ کشمیر (انگریزی دو جلد) مؤلفہ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی مرحوم

۲ کشمیر سلاطین کے عہد میں (انگریزی نیز اردو ترجمہ) مصنف پروفیسر محب الحسن

ہم یہاں ایک اجمالی خاکہ پیش کئے دیتے ہیں۔

شعراء

۱: سید محمد امین اویسی اویسیؔ:- میر بابا اویس کے نام سے مشہور تھے۔ کبرویہ سلسلے کے صوفی تھے۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ نے ان کی بیٹوں کی طرح تربیت کی۔ مگر جوان ہو کر وہ دنیوی امور سے متنفر ہو گئے۔ "واقعات کشمیر" اور تاریخ حسن (ج ۲) میں آپ کا ایک ترجیع بند ملتا ہے جس کا ترجیعی بیت یہ ہے ؎

بعد ازیں دلیس ترک گفت و شنود   کنج کرد و عبادت و طاعت معبود

آپ کے دو شعر یہ ہیں ؎

ز ماسوای تو آنانکہ فارغ البالند   بعالمی تفرد شدند ذوق تنہائی

گناہ ما ز عدم گر نبیا مدی بوجود   وجود عفو تو، در عالم عدم می بود

آپ خطۂ بیہق سے نسبت اور علم منطق سے غیر معمولی شغفت رکھنے کی بنا پر منطق بیہقی بھی کہے جاتے ہیں۔ صاحب کرامات بزرگ تھے۔

۲: حضرت شاہ ہمدانی، میر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ/۱۳۸۵ء):- آپ علی اور علائی تخلص کرتے تھے۔ آپ کی نثری کتابیں (عربی و فارسی) سو سے متجاوز ہیں۔ اور ان میں سے آپ کے شعر بھی ملتے ہیں۔ جداگانہ طور پر آپ کی اہم غزلیں اور ۹ دو بیتیاں دستیاب ہیں۔ اور یہ "انتشارات وحید" تہران کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں (۱۹۷۰ء)

شاہ ہمدانی، ہمدان کے رہنے والے تھے۔ ۲۱ برس تک روحانی سفر کیا۔ کئی سال ختلان (کولاب) واقع تاجکستان میں رہے۔ اور ۷۷۴ھ میں کشمیر آئے۔ وادی اور بلتستان و گلگت وغیرہ میں آپ نے کوئی دس برس تک تبلیغی و اصلاحی خدمات انجام دیں اور ہزاروں افراد کو مسلمان کیا ہے۔ آپ کو علی ثانی اور محاوری کشمیر کے القاب سے بھی یاد کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں آپکی خدمات کو سراہا ہے کہ ؎

خطّہ را آن شاہ دریا آستین   داد علم و صنعت و تہذیب و دین

یہاں ہم تبرکاً آپ کی ایک غزل کے چند اشعار اور ایک دو بیتی پیش کرتے ہیں ؎

راحت ار خواہی بیا با درد او ہمراز شو　　　　دولت ار جوئی، بہ سوز عشق او جانباز شو

ساز را عشق، سربازی و بدنامی بود　　　　گر سر این راہ داری، در پی این ساز شو

بر تن و جان چند نازی چون نیرزی ارزنی　　　　صعوہ بار ز تن گذار و در پرورش شہباز شو

تا بکی ہمچون زنان این رلہ و رسم و ننگ و بوی　　　　راہ رندان گیر و با صاحب دلان ہمراز شو

چون زنی تا چند باشی بستۂ مردار تن !　　　　در ہوای سیر جان یک لحظہ در پرواز شو

قفل این در شد علائی و کلید آن نیاز　　　　گر نیازی داری این جا بر سر یہ ناز شو

عیبی است بلند بر کشیدن خود را　　　　وز جملۂ خلق برگزیدن خود را

از مردمک دیدہ باید آموخت　　　　دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

۳: سلطان یوسف شاہ چک :- سلطان یوسف، فارسی کے علاوہ ہندی اور کشمیری میں بھی شعر کہتا تھا۔ اس کی ملکہ حبہ خاتون، جو سلطان کی رومان پرور طبیعت کی بنا پر ایک ادنیٰ دیہاتی عورت کے درجے سے گزر کر ملکہ تقریبی، کشمیری زبان کی اچھی شاعرہ اور خوش آواز مغنیہ تھی (ملاحظہ ہو "آئینہ کشمیر" لاہور میں اس پر مقالہ) یوسف شاہ نے مثنوی اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی اور ایک منظوم خط میں حماسی شان جلوہ گر ہے۔ یہاں ہم "واقعات کشمیر" سے سلطان کی غزلیات کے دو شعر نقل کرتے ہیں ؎

دل پر درد من جانان بسان غنچہ پر خون است　　　　چہ بی رحمی نہ پرسیدی کہ احوال دلت چون است!

لیلی حجاز را بر مجنون بخود نخواند　　　　زور کمند جذبۂ نہانی اوست

۴: بابا داؤد خاکی (م ۹۹۴ھ/۱۵۸۵ء) :- صوفی صافی اور عالم دین تھے۔ حضرت مخدوم شیخ حمزہ (م ۹۸۹ھ / ۱۵۸۱ء) کے مرید تھے۔ ان کے عالمانہ و عارفانہ قصائد معروف ہیں۔ ورد المریدین اور دستور السالکین آپ کی صوفیانہ تالیفات ہیں۔ حضرت خاکی (گنائی) کی غزل کے دو اشعار کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

گر بہ مسجد روم و گاہ بہ میخانہ شوم　　　　من بی چارہ، ترا می طلبم از ہر سو

نتوانم کہ شمارم کرم و نعمت تو　　　　گر زبانم شود اندر تن من از ہر مو

۵: شیخ یعقوب صرفی (م ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء) :- گنائی خاندان سے تھے۔ اور علم الصرف میں مہارت کی بنا پر صرفی کہلاتے تھے۔ اپنے وقت کے بڑے عالم، مصنف، شاعر اور عارف تھے۔ برصغیر اور ایران کے علما و فضلا آپ

کے مداح رہے۔ حافظ قرآن تھے۔ مولانا آفی، مولانا جامی کے شاگرد معتیم کشمیر کے تلمذ سے استفادہ کرتے رہے۔ برصغیر اور ایران قدیم کے مختلف شہروں میں گذر کیا۔ اور علماء سے ملے۔ سفر حج میں شیخ ابن حجر کی سے سند حدیث حاصل کی۔ ترکستان میں شیخ حسین خوارزمی نے انہیں خرقۂ طریقت دیا۔ تاجیکستان میں آپ نے حضرت شاہ ہمدانیؒ کے مزار واقع ختلان (کولاب) کی زیارت کی۔ آگرہ میں آپ نے شیخ سلیم چشتی سے ملاقات کی۔ اور سفر حج میں ان کے ساتھ حرمین شریفین گئے۔ ایران میں آپ نے شاہ تہماسپ صفوی سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اتحاد کے بارے میں مفید بات چیت کی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے شیخ صرفیؔ سے درس حدیث لیا تھا۔

صرفیؔ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ فیضی کی بے نقط تفسیر قرآن 'سواطع الالہام' پر آپ نے قلم برداشتہ بے نقط تقریظ لکھی تھی۔ آپ نے 'صحیح بخاری' کی ایک شرح لکھی ہے۔ قرآن مجید کی ایک تفسیر 'مطالب الطالبین' کے نام سے لکھی مگر یہ نا مکمل ہے۔ دیوانِ شعر میں جملہ اصنافِ سخن شامل ہیں۔ آپ کے خمسہ (پنج گنج) نے آپ کو 'جامیؔ ثانی' کا لقب دلوایا ہے۔ ان مثنویوں کے نام لیلیٰ مجنون، مسلک الاخیار، مغازی النبیؐ، مقاماتِ مرشد اور وامق و عذرا ہیں۔ یہاں ہم حضرت صرفیؔ کی ایک غزل کا انتخاب درج کرتے ہیں۔

سنگ جفا بہ شیشۂ طاعت زدیم ما   ننگ اند اہل عالم و تنہا بریم ما
مست ابد شویم بہ میخانۂ شہود   صبح ازل چو یک دو سہ جامی زدیم ما
زاہد بکفر عشق، مسلمان کا مسلیم   اما بدین ناقص تو، مرتدیم ما
تا از حجاب کثرت رہی برآمدیم   فارغ ز زشت و خوب و قبول و ردیم ما
در کوی زہد پا نہ نہادیم مطلقا   سوی شراب خانہ ز سر آمدیم ما

۶: خواجہ میرم بزاز

میرمؔ کے حالاتِ زندگی دستیاب نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ کشمیر پر مغل اقتدار کے ابتدائی دور میں حیات تھے۔ آپ بزازی میں نامور تاجر تھے مگر حضرت مخدوم شیخ حمزہؒ کے شرف صحبت سے انہیں بااختیار فقر حاصل ہوا۔ "تذکرۃ المرشد" (مؤلفہ ۹۹۰ھ) میں آپ نے اپنے پیر و مرشد کے حالات جمع کئے ہیں۔ شاعری میں میرمؔ کا انداز بیان عارفانہ اور عارفانہ ہے۔ ان کی کم از کم تین غزلیں دستیاب ہیں۔ دو غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

از زلف تو بر کار دلم صد گرہ افتاد   دیگر مزن ای شوخ گرہ زلفِ دوتا را
آئینۂ انوار تجلی است جمالت   بنمای کہ بینیم در آن نورِ خدا را

از حالِ دلِ غمزدہ میرم مخدومِ غم رحمی بکن ای شاہِ بتان، حال گرا را

بہار و باغ و شب وصل خوش بود ساقی بیار بادۂ گلرنگ خوش گوار امشب

پ چشم و گیسوی زلفت قسم کہ مجنون را زخوابِ چشمِ تو ... قرارِ دل امشب

بگوی تو بہر شب واشتن ناری میرم فتادہ ماتبت آنجا چاک وزارا امشب

مغلیہ دور سے قبل کشمیر کا سرمایۂ نثر

یہ سرمایۂ نثر خاصا متنوع اور اہم ہے۔ پہلے بڑے مصنف حضرت شاہ ہمدان ؒ ہی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہمدان، ختلان (کولاب)، بلتستان، دگلگت اور وادی کے قیام کے دوران نیز سفر کی حالت میں کتابیں لکھی ہیں۔ آپ نے سلطان قطب الدین شاہمیری (۷۷۵-۷۹۶ھ) کے نام کئی فارسی خطوط لکھے، رسالہ "عقبات" یا "قدسیہ" اسی سلطان کے نام لکھا گیا۔ قرائن بتاتے ہیں کہ شاہ صاحب کی عظیم تالیف "ذخیرۃ الملوک" جس کی اقبال ؒ نے "جاوید نامے" میں تعریف کی اور اس کے اردو میں منتقل ہو جانے سے دلچسپی رکھی (انوار اقبال) کشمیر میں ہی لکھی گئی ہے۔ آپ کے خطوط اور رسالہ عقبات، ناصحانہ اور ناقدانہ ہیں۔ "ذخیرۃ الملوک" اخلاق، مدنیاتی سیاست اور اسلامی نظامِ عدل کے بارے میں دس ابواب پر مشتمل، ایک بے نظیر اور کم بدل کتاب ہے۔

شاہ ہمدان ؒ اور ان کے فرزند میر سید محمد ہمدانی ؒ (م ۸۵۴ھ) کے ہمراہ کوئی ایک ہزار ایرانی فضلا کشمیر میں وارد ہوئے۔ اور ان میں سے کئی حضرات صاحبِ تصنیف تھے۔ میر سید ہمدانی ؒ نے رسالہ "در تصوف" اور شرح "شمسیہ منطق" لکھی ہیں۔ حاجی ابراہیم ادہم طبی، آخری عمر میں مقیم کشمیر رہے (م ۱۴۳۳ء) ان کی کتاب "مقامات" اولیاء اللہ کے ذکر پر مشتمل ہے۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ، علوم و فنون کا غیر معمولی سرپرست اور مشوق تھا۔ وہ شاہزادگی کے دور میں کئی سال سمرقند میں رہے اور تیمور اور جانشینانِ تیمور کی تشریق علماء سے متاثر تھے۔ ان کے عہد میں سید محمد سامانی نے "تنویر السراج" اور سید محمد قادری نے شرحِ لمعات" اور "تحادہ نامہ" نامی کتابیں لکھیں۔ ملا احمد کشمیری نے بعض پنڈتوں کی مدد سے "مہابھارت" اور کلہن کی راج ترنگنی کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ اسی دوران میں محمد بن احمد نام کے ایک طبیب نے "کفایہ مجاہدیہ" (کفایہ منصوری) کے نام سے ایک طبی کتاب لکھی ہے۔

سید حسین بیہقی، بابا اویسی مذکور کے والد بڑے فاضل شخص تھے۔ ان کی تصنیف "ہدایت الاعمیٰ" اسلامی عقائد اور بعض عرفانی مسائل مثلاً سماع، غنا و مزامیر وغیرہ کے بارے میں ہے۔ ملا عبدالوہاب۔

چک سلاطین کے عہد کے ایک سربرآوردہ عالم تھے۔ ان کی تالیفات منطق کی کتب کے حواشی پر مشتمل ہیں۔ سید علی محمد کی "تاریخ کشمیر" اور قاضی ابراہیم کی "تاریخ تطہرہ کشمیر" (متوفہ ۹۲۰ھ / ۱۵۱۴ء) چک عہد میں لکھی گئی ہیں۔

چک عہد کے دوران کافی خلفشار رہا۔ اسی خلفشار کے دوران، شہنشاہ ہمایوں کے خالہ زاد بھائی مرزا حیدر دوغلت نے دو بار کشمیر پر چڑھائی کی۔ دوسری بار وہ کامیاب رہا اور کئی سال تک کشمیر کا بلا تاج بادشاہ رہا۔ "تاریخ رشیدی" اس نے یہیں لکھی ہے۔ اس عہد میں ملا حسین قادری نے بھی ایک "تاریخ کشمیر" لکھی ہے۔

بابا علی رینہ حضرت مخدوم شیخ حمزہ کے بھائی اور ارادت مند تھے۔ ان کے "تذکرۃ العارفین" کے نام سے ہی اس کا موضوع واضح ہے۔ حضرت مخدوم کے ایک دوسرے مرید، مولوی محمد جعفر نے "رموز الطالبین" کے نام سے ایک دلچسپ کتاب لکھی۔ اس میں سرود حلال و حرام، موسیقی، رقص، غنا کی حلت وحرمت اور سماع کے جواز و عدم جواز کے بارے میں بحث ملتی ہے۔ مؤلف کی نظر میں یہ سب کام مباح ہیں۔

میر حیدر تلوانی (م ۹۹۹ھ) نے ۹۸۲ھ میں قیام کشمیر کے دوران ہدایت المخلصین کے نام سے ایک عرفانی کتاب لکھی ہے۔ خواجہ میرم بزاز کے "تذکرۃ المرشد" کا ذکر ہو چکا ہے۔ آخر میں حضرت بابا داؤد خاکی کی "ورد المریدین" کا ذکر کر دیں۔ یہ موضوعات عرفان پر منظوم رسالہ ہے آپ نے "دستور السالکین" کے نام سے ایک دوسری کتاب میں ان مطالب کو واضح تر لکھا ہے۔

مندرجہ بالا اشارے اس امر کے غماز ہیں کہ قبل از مغل عہد کا کشمیر کا فارسی ادب، شعر، عرفان و تصوف اور تاریخ وغیرہ پر مشتمل ہے۔

مغلیہ سلطنت کا بانی شاہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر تھا۔ اس نے ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں سلطان ابراہیم خان لودھی کو شکست دیکر اپنی عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ سلطنت ہمایوں کے ایران میں پناہ گزینی کے پندرہ سالہ دور تعطل سے قطع نظر کسی نہ کسی صورت میں جنگ آزادی کے مشہور سال ۱۸۵۷ء تک باقی رہی۔ تقریباً تین سو سال کا مغلیہ عہد فارسی زبان و ادب اور فنون لطیفہ کا زریں عہد ہے۔ اس عہد کی مختلف حیثیتوں کے بارے میں بہت لکھا گیا ہے۔ مغل بادشاہ متعدد تھے اور ضرب پرور بھی۔ بابر ایک روشن خیال اور باذوق حکمران تھا۔ وہ ترکی اور فارسی زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ "توزک بابری" کے نام سے ترکی چغتائی میں اس کی سوانح عمری ہے جو دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور اس کے موضوعات بیان، خصوصاً معاصر شعراء و ادبا و علماء کا ذکر، مصنف کی باذوق شخصیت پر دلیل ہیں۔ بابر ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء میں آگرہ میں فوت ہوا اور وصیت کے مطابق کابل میں دفن ہوا۔ اس کے بیٹے نصیر الدین ہمایوں کو دیگر بھائیوں نے خلفشار میں

مبتلا رکھا۔ اور ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری افغان نے اسے یہاں سے ایران مار بھگایا۔ وہ تقریباً پندرہ برس بعد ۱۵۵۵ء میں واپس آیا۔ تخت سلطنت پر قبضہ لیا اور ایک سال بعد وفات پائی۔ ہمایوں بھی فارسی کا شاعر اور باذوق شخص تھا۔ اس کے بیٹے شاہنشاہ جلال الدین اکبر نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی، اور اس کا عہد علم و ادب اور دیگر ترقیات کا حامل رہا ہے۔ اس کے بیٹے نور الدین جہانگیر اور بالخصوص پوتے شہاب الدین شاہجہان کے عہد میں رعایا مرفہ الحال رہی۔ اور فنونِ لطیفہ نے بہت ترقی کی۔ عجوبۂ روزگار "تاج محل" اس کے عہد کی لازوال یادگار ہے۔ شاہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر دلیر و نیک تھا مگر جواں مرد بادشاہ نے اپنوں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور اپنے حدود سلطنت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جانے کے باوجود، نظم و نسق میں خلل نہ آنے دیا۔ عالمگیر نے علم و فن، خصوصاً علوم نقلی، کی سرپرستی کی مگر اس کی وفات (۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ عہد زوال و انحطاط کی جانب تیزی سے دوچار ہونے لگا یہاں تک کہ اس کے پورے ڈیڑھ سو سال بعد، برطانوی سامراج نے اس مقتدر خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

مغل شاہنشاہ اور فارسی

مغل شاہنشاہوں کو فارسی سے غیر معمولی رغبت تھی۔ بابر کی مادری زبان ترکی تھی مگر اس نے اکتسابی زبانوں عربی اور فارسی سے بڑی دلچسپی دکھائی۔ ہمایوں ترکی اور فارسی جانتا تھا مگر ۱۵ سالہ قیام ایران نے اسے ترکی کے علاوہ ایرانی فارسی سے بخوبی آشنا کیا۔ ایران کے صفوی بادشاہوں کے ادبی و مذہبی میلانات کا ذکر ہو چکا۔

ان حالات میں فارسی کے اکثر خوش فکر شاعروں نے برصغیر کی راہ لی اور بادشاہوں نیز ان کے امرا کی داد و دہش سے مستفید ہوتے رہے۔ ہمایوں کے عہد میں کم مگر اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں ایرانی شعراء و ادبا کی ایک بڑی تعداد برصغیر کو سدھاری ہے۔ مقامی باکمالوں کی ان کے عہد میں کمی نہ تھی۔ ہم یہاں کسی ایک طبقۂ خیال کے ہنرمندوں کا بھی خاطر خواہ ذکر نہ کر سکیں گے۔ اس گلستان میں گلوں کی اس قدر فراوانی ہے۔ کہ انتخاب مشکل نظر آ رہا ہے۔

مشہور شعرا

ہم مقامی اور ایرانی شعرا کا مختصر ذکر ایک ساتھ کریں گے۔ جہاں ضروری سمجھا گیا نمونۂ اشعار پیش کیا گیا ہے۔

خانخاناں بیرم خاں (م ۹۶۶ھ / ۱۵۵۹ء)

بیرم خاں شاہنشاہ ہمایوں کا معتمد اور اکبر کا اتالیق تھا۔ ترکی اور فارسی زبان میں اس کے مختصر دیوان موجود ہیں۔ اس کا کلام ہموار اور سادہ اثر پذیر ہے۔ ہمایوں کے ساتھ ایران گیا تھا، اور وہاں کے اہل زبان کے ساتھ معاشرت کے اس کے کلام پر اثرات نظر آتے ہیں۔ ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو:

حرفی نہ نوشتی، دلِ ما شاد نکردی　　ما را بہ زبان قلمی یاد نکردی

آباد شد از لطف تو صد خاطر ویران   ویرانۂ ما بود کہ آباد نکردی
آن لطف کہ گفتم بہ وصال تو رساند   فریاد بر قوم کہ چہ بیداد نہ کردی
ای کردہ فراموش ز غمخواری بیرم   حرفی نہ نوشتی و دلی ما شاد نہ کردی

عرفی شیراز میں پیدا ہوئے۔ اور جوانی میں برصغیر کو سدھارے

سید جمال الدین عرفی شیرازی (م ۹۹۹ھ / ۱۵۹۱ء)

طبیعت میں انانیت اور خودداری تھی۔ قصیدہ نویسی کو پسند نہ کرتے تھے ؎

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی   تو از قبیلۂ عشقی، وظیفہ ات غزل است

مگر قصائد لکھے خوب ہیں۔ غزل، قطعہ، مثنوی، ترکیب بند اور ترجیع بند میں بھی استادی دکھائی۔ اس کی مثنوی نظامی گنجوی کی مخزن الاسرار اور خسرو شیرین کے تتبع میں ہے۔ "نفسیہ" نامی نثری رسالہ، صوفیانہ مطالب کا حامل ہے۔

عرفی کی خود پسندی اور بد دماغی مشہور ہے۔ قصیدہ میں پہلے اپنی تعریف کرتا، اور اس کے بعد ممدوح کی۔ ایک دیوان شعر گم کر دیا تو کہا ؎

گفتہ گوشۂ کنم، شکر کہ ناگفتہ بجاست   از دو صد گنج یکی مشت گہر باختہ ام

اپنی نسبت شیراز کے بارے میں کہا ؎

نازش سعدی بمشت خاک شیراز از چہ بود   گر نمی دانست کہ باشد مولد و ماوای من!

اس کے کلام میں بے باکی وسعت کا درس ملتا ہے اور علامہ اقبالؒ کو مندرجہ ذیل شعر بے حد پسند تھے ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی   حدی را تیز تر می خوان چو محمل را گران بینی
گرفتم آنکہ بہشتم دہند بی طاعت   قبول کردن صدقہ نہ شرط انصافست
لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم   چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور
رنجم ز مدعی بقبول غلط ولی   در تابم از شکنجۂ طبع سلیم خویش

عرفی نے ۳۶ سال کی مختصر عمر پائی اور لاہور میں انتقال کیا۔ دیوان تہران میں طبع ہو چکا۔ یہاں ان کی ایک معروف غزل کے چند شعر نقل کیے دیتے ہیں ؎

در چمن حور وشان انجمنی ساختہ اند   چشم بد دور، بہشتی چمنی ساختہ اند
چون بہ سنجند بہ فرہاد مرا یا مجنون   کہ بہ بازیچۂ ہر یک انجمنی ساختہ اند
دلہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت   تا شبیہان تو گلگون کفنی ساختہ اند
لذت شعر تو عرفی ہمہ عالم گفت   کہ ترا مائل شیرین دہنی ساختہ اند

فیضی یا فیاضی اکبرآبادی (م ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) فیاضی عجم، حکیم ابوالفیض، اکبر کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ فیضی
اس کے والد شیخ مبارک اور چھوٹے بھائی ابوالفضل علامی کو دربار اکبری میں بڑا مقام حاصل تھا۔ فیضی نے سب اصناف سخن میں استادانہ طبع آزمائی کی۔ اس کی مثنویاں سلیمان و بلقیس، ہفت کشور، مرکز ادوار، نل و دمن اور "گیتا"، خمسہ نظامی کی تقلید میں ہیں۔ فیضی، امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی کا معتقد تھا۔ کہتا ہے ؎

وگر از ہیر ہی نظر چراغ ۔۔۔ درج فیاضی خسرو حسن است

فیضی کو حکمت و فلسفے سے شغف تھا۔ اس لئے اس کے بعض اشعار سے درس حکمت کا استنباط ہوتا ہے۔ اس نے "سواطع الالہام" کے عنوان سے قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھی اور اس میں صرف بے نقط الفاظ (جیسے "ا"، "ح"، "د"، "ر"، "س" اور "ص" وغیرہم) سے کام لیا ہے۔

فیضی کی غزلیات کی اہل ایران خاص طور پر داد دیتے ہیں۔ ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو ؎

تو ای پروانہ، این گرمی ز شمع محفل داری ۔۔۔ چو من در آتش خود سوز اگر سوز دل داری
درون قدسیان تحسین شد تعالی اللہ صیاری ۔۔۔ کہ چون جبرئیل از ہر غمزہ مرغ بسمل داری
عجب نبود اگر خار مغیلان دامنت گیرد ۔۔۔ براہ کعبۂ وصل او، ہوای منزل داری
نہ مجنون خراسانی عاقل ای سرگشتہ ہجران ۔۔۔ کہ ہر دم گوش بر بانگ درای محمل داری
شدی فیضی شہید یار شربت باد اگر قاتل ۔۔۔ بہ حشر این خون بہایت بس کہ چون او قاتل داری

نظیری نیشاپوری (م ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۳ء) حاجی محمد حسین نظیری جوانی ہی میں برصغیر میں وارد ہوا۔ میرزا عبدالرحیم خانخاناں نے بہت افزائی کی۔
اسی امیر کے توسط سے شاعر اکبر کے دربار میں داخل ہوا۔ اور اپنی موزون طبع کی خوب جولانی دکھائی۔ نظیری نے خانخاناں، شاہنشاہ اکبر، نورالدین جہانگیر اور شاہزادہ مراد وغیرہم کے زوردار قصائد لکھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ احمد آباد گجرات میں خانخاناں کے دربار میں بسر کیا۔ اس نے سارے اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی۔
تغزل و عشق کا دلدادہ تھا۔ حافظ شیرازی کی پیروی پر نازاں تھا۔ آخری عمر میں اسے حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد شاعر نے صوفیانہ اور متصوفانہ زندگی اختیار کی اور اسی حال میں احمد آباد گجرات میں انتقال کیا۔ نظیری کا ضخیم دیوان بڑے اہتمام سے چھپا ہے۔ (تہران، انتظیری رباعی)۔ قصیدہ اور غزل کا مسلم استاد ہے۔
ہم یہاں ایک مختصر غزل نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

گر بہ سخن در آوردم عشق سخن سرای را ۔۔۔ بر پر و دوش سروری مگریہ ہای ہای را
گل بہ خزان شکفتہ شد بعد وصل بستہ دل ۔۔۔ مدعی ناخن است فی بخت گرہ گشای را

نی ذوق بی خبر و هم، نی بدل اثر کنم | صورت نگار کاروان زمزمهٔ هوای را
بیزالی که صحبت تر دوری عاشقان شود | طعمه ز استخوان سزد حوصلهٔ همای را
وردی ادیب اگر بود زمزمهٔ تحقیق | جز بمکتب آورد طفل گریزپای را
پیش نظیری از فلک در دل بزم گر هست | پرورشه ترددی نالهٔ آن گدای را

ظہوری ترشیزی (م ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء)

نورالدین ظہوری، بیجاپور کے معارف پرور بادشاہ، ابراہیم عادل شاہ کا درباری شاعر تھا۔ ظہوری ترشیز میں پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ خراسان، شیراز اور بغداد میں رہا۔ پھر حیدرآباد دکن کی راہ لی۔ وہاں سے حج کرنے کو گیا اور واپس آگیا۔ باقی عمر بیجاپور و حیدرآباد دکن میں ہی گزاری۔ اس کا دیوان شعر شائع ہو گیا تھا البتہ متفرق اشعار دستیاب ہیں۔ ظہوری، مشہور شاعر و ادیب ملا ملک محمد قمی (م ۱۰۲۴ھ) کا داماد تھا۔ اس کا ساقی نامہ اور سہ نثر (یعنی تین نثری کتابوں۔ نورس، گلزار ابراہیم اور خوان خلیل کے دیباچے) اس کی دیگر شاعری سے زیادہ معروف ہیں۔ اقبال معترف ہیں کہ اسرار خودی کی تمہید لکھتے وقت انہوں نے اس ساقی نامہ کو پیش نظر رکھا تھا۔ یہ نظم احمد نگر کے حاکم نظام الملک کے نام معنون کی گئی اور حیدرآباد دکن کی عام زندگی کا مرقع بھی جا سکتی ہے۔ "ساقی سے خطاب" کے چند ابیات ملاحظہ ہوں ؎

بیا ساقیا بگذران روز را | بده آتش صفوت سوز را
گدازنی توبه دل زغم خورد | توان جان به تریاق عفو تو برد
ز تو خشوهٔ مرحت این توبه باد | که ذوق شکستن مرا توبه داد
بشر چهرهٔ خجلتم ماز گرد | که از توبه کردن دم توبه کرد
ترا توبه هم از ستم می دهم | طلایی ندارم قسم می دهم
بو شیرینی شهد کنج دهن | به جوش اسیران چاه ذقن

اب ہم ایک غزل کے چند ابیات نقل کر رہے ہیں۔

آنان که جان فدای نگاری نکرده اند | بیکار شان مباش که کاری نکرده اند
در سایهٔ نهال غمی چون طرب کنند | پژمردگان که فکر بهاری نکرده اند
خون زنگ دشنهٔ مژگان نمی چکد | ترکان چشم تازه شکاری نکرده اند
تا کی به عجز خویش ظهوری فغان کنی | خوبان بگوی رحم گزاری نکرده اند

طالب آملی (م ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۷ء)

محمد طالب آملی، دربار جہانگیری کا ملک الشعراء تھا۔ طالب نے ابتدائی زندگی آمل، مازندران، کاشان

اور مرو میں بسر کیا۔ مرو سے وہ برِصغیر میں وارد ہوا۔ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء میں اُسے ملک الشعرا بنایا گیا۔ طالب کو اپنی بہن "ستی خانم" سے بہت محبت تھی۔ طبرستانی لہجے میں "طالبا" نام کی ایک مثنوی مشہور ہے اور کہتے ہیں کہ اسے طالب نے اپنی بہن کے لئے لکھا تھا۔ طالب نے جوانی میں انتقال کیا اور اس کی اولاد کی سرپرستی مذکورہ بہن نے کی ہے۔

طالب آملی اپنے رنگ میں درجۂ اول کے شعراء میں شامل ہوتا ہے۔ جناب لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید نے اس کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے "تذکرہ طالب آملی مع انتخاب کلام"۔ اس کتاب سے ہم طالب کی ایک دعا نقل کر رہے ہیں۔

زفیضِ شکرستانِ سخن یارب نعیم دہ — بیانِ طوطیم داری، زبانِ عندلیبم دہ
غریبانِ وطنم زبلبلی است یارب در جہانِ سخن — غریبم در صفِ اہلِ سخن یعنی غریبم دہ
چون طفلان شوخ چشم بی ادب بودم درین مکتب — ادیم دادہ فیضی راز آداب ادیبم دہ
بجز راہِ سخن با دوست کانی نیست عاشق را — خدایا با حبیب خویشتن قرب قریبم دہ
خدایا نعمتِ دیداری می خواہم، نمی گریم — کہ از باغ بہشت خود ترنج و نار و سیبم دہ
چون طالب طبع سنی آتشِ زیم دادہ یارب — یکی در عیب گفتاری زبان دلفریبم دہ

منیر لاہوری (م ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۵ء)

ابوالبرکات لاہوری بڑا پرگو شاعر تھا۔ منظومات میں اس کے ایک لاکھ شعر ملتے ہیں۔ نثر میں "تذکرہ شعرائے ہند" اور "کارستان" اس کی تصانیف ہیں۔ اس نے ۴۲ سالہ عمر کا زیادہ حصہ لاہور میں گزارا۔ کچھ عرصہ کیلئے بنگال گیا اور اپنے بھائی ابوالفتح منیر کے ساتھ صوبہ دار بنگال سیف خان کے دربار میں رہا۔ بنگال کی تعریف میں اس کی ایک مثنوی اسی دور کی یادگار ہے۔ منیر کا کلام سادہ اور دلآویز ہے۔ ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو

صوفی و خم جبہ و دستار و دگر ہیچ — ما و ہوس دیدنِ دلدار و دگر ہیچ
چیدند گل و لالہ ازین باغ حریفان — شد قسمتِ ما سرزنشِ خار و دگر ہیچ
معشوق و خواہیدانِ مستانہ بعد ناز — ما و دہمین تہمتِ رفتار و دگر ہیچ
مستقیم منیر ازین میخانۂ معنی — داریم بکف نسخۂ اشعار و دگر ہیچ

قدسی مشہدی (م ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء)

حاجی جان محمد قدسی کی ایک نعت ہم اکثر سنتے رہتے ہیں کہ ؎

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی — دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

قدسی نے غزل، قصیدہ اور مثنوی میں طبع آزمائی کی۔ ۱۰۴۲ھ سے شاہجہان کے دربار کا شاعر تھا۔ بادشاہ

نے اس کی بڑی قدردانی کی۔ ایک قصیدہ لکھا تو اس کا منہ جواہرات سے بھروا دیا۔ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۶ء میں سونے میں تولا گیا تھا۔ قدسی نے چند سال تک اکبرآباد کے سرکاری مدرسے میں درس بھی دیا ہے۔ آپ کا انتقال لاہور میں ہوا تھا۔ ایک غزل نقل کر رہے ہیں ؎

نکہت غنچہ گرہ در عربدہ سازست ہنوز — چشم مخمور تو سرفتنۂ نازست ہنوز
تازہ شد دوستیٔ ما بہ خط تازۂ تو — تازگی ناز کہ آغاز نیازست ہنوز
خاک شد پیکر محمود ز تاثیر وفا — دل او در شکن زلف ایازست ہنوز
واو نزدیک حرم، سعی مرا باطل کرد — لیک شادم کہ رہ عشق درازست ہنوز
گرچہ نبود صوری ز حقیقت خالی — دل قدسی زپی عشق مجازست ہنوز

حبی کشمیری (م ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء)

خواجہ حبیب اللہ حبی۔ نواح سرینگر کے رہنے والے تھے۔ شیخ یعقوب صرفی کے شاگرد تھے اپنے مرشد کی سوانح حیات "مقامات حضرت ایشان" لکھنے کے علاوہ انہوں نے تصوف کے موضوع پر راحت القلوب اور تنبیہ القلوب نامی دو کتابیں لکھی ہیں۔ آپ بلا کے شاعر تھے۔ غزل، قصیدہ اور رباعی خوب لکھتے تھے۔ انہیں "فن تاریخ گوئی" سے دلچسپی تھی اور تاریخ اسلام کے اہم واقعات کی تاریخیں کہی ہیں۔ ان کی ایک غزل کے تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ای کہ بہشت بریں از تو عذابم عذاب — آتش دوزخ بہ ما تو گلابم گلاب
گرمی شوقت چہ کرد، نرمی ذوقت چہ کرد — سینہ کبابم کباب، دیدہ پر آبم آب
حبی بیچارہ بین، اشک فشان بر زمین — کردہ ز داغت چنین ز دست شرر با کباب

حبی کو حضرت میر سید علی ہمدانی (شاہ ہمدان) سے ارادت تھی اور فرماتے ہیں ؎

من بندۂ شاہ ہمدانی ہستم — پروردۂ آن علی ثانی ہستم
ہر کس کہ محب او شدہ از دل و جان — از صدق دلش محب جانی ہستم

سلیم تہرانی کشمیری (م ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء)

میرزا محمد قلی سلیم۔ شاہجہان کے عہد میں برصغیر میں آئے اور وادیٔ کشمیر میں مقیم ہوئے۔ پہلے صوبہ دار اسلام خان کی خدمت میں رہے اور اس کے بعد ظفر خان احسن کے پاس۔ سلیم کی مثنویاں "قضا و قدر" اور "کشمیر" معروف ہیں۔ اس کی غزل اور قصیدہ بھی استادانہ ہیں۔ غزلیات کے دو شعر ہیں۔

فغان از دانہ ہای سبحہ دانست — کہ دلہا را بہ دلہا راہ باشد
دل چو شد گرم ز بی جلوہ معشوق کند — مانا موم بہ آتش چو رسد آب شود

مثنوی کشمیر کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں ؎

تعالی اللہ درین باغ خدائی — کہ گرد و دست از خاکش حنائی
فضایش چون بساط نیک بختان — پر طوطی دود برگ درختان
بپای گل ز موج سبزہ زنجیر — بگویم سبزہ خواب شال کشمیر
بصحرایش گل و لالہ ہم آغوش — بباغش سرو و سبزہ دوش بدوش

سلیم سرینگر کے معروف قبرستان "مزار الشعرا" میں مدفون ہیں ؎

کلیم کاشانی (م ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء)

ابوطالب کلیم کا مولد ہمدان ہے مگر کاشان میں اپنے طویل قیام کی بنا پر وہ "کاشانی" کی نسبت سے معروف ہیں۔ کلیم نے علوم و فنون کی تحصیل شیراز میں مکمل کی تھی۔ جہانگیر کے عہد میں برصغیر آیا۔ وہ ایران لوٹ گیا اور دوبارہ برصغیر میں آ گیا۔ وہ امیر شاہ نواز خان اور میر جملہ شہرستانی کے وابستگان دربار میں سے رہا ہے۔ شاہجہان کے عہد میں وہ خلاق المعانی اور ملک الشعرائی کے القاب کا سزاوار بنا۔ جملہ اصناف سخن کا استاد مسلّم ہے۔ دیوان تہران سے شائع ہو چکا ہے۔ شاعری کی نازک خیالی، بلند فکری اور ایہام گوئی اب بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ کلیم نے شاہجہان کی ہمراہی میں وادیٔ کشمیر کی سیر کی اور یہاں کی فضا کا فریفتہ ہو گیا۔ آخری عمر میں بادشاہ کی اجازت سے وہیں رہنے لگا۔ اور وہیں انتقال کیا۔ سلیم تہرانی کی قبر سے متصل مدفون ہے۔ اس کی غزل کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں ؎

فزون از صبر ایوب است تاب محنت دوری — کہ در مجبوری نباشد آنچنان مشکل کہ مہجوری
چنان بی بردی تو دست و لم انکار خود ماند — کہ ساغر در کفم لبریز دمن مردم ز مخموری
ز گوشش این نکتہ پیر مغان بیرون نخواہد شد — کہ مستی خاکساری آورد، پرہیز مغروری
چنان عالم بہ بند اعتبار ظاہر افتادہ — کہ پروانہ نسوزد گر نباشد شمع کافوری
نگوئی بی اثر دیگر کلیم این اشک ریزی را — ز ناکم گریہ آخر ہم سیاہی بود ہم شوری

میر الٰہی ہمدانی کشمیری (م ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۲ء)

نام میر سید عماد الدین محمود الٰہی حسینی ہے۔ ہمدان سے برصغیر آئے اور شاہجہان کے دربار سے متوسل ہوئے۔ دربار شاہجہان میں آپ کا بڑا اقبال رہا۔ ظفر خان احسن، صوبہ دار کشمیر، کے ساتھ

کشمیر آئے اور بقیہ عمر یہیں بسر کی۔ مزار الشعراء مذکور میں مدفون ہیں۔ آپ قصیدہ، رباعی، مثنوی اور غزل کے استاد تھے۔ ایک غزل کے دو شعر ہیں ؎

چشمت از ہر گردشی بابار عہد تازہ بست | خط شکیفت کتاب حسن را شیرازہ بست
نشہ از تندی او دارم کہ چاک سینہ ام | چون خمار آلودہ تماند لب از خمیازہ بست

کشمیر کی توصیف آپ نے بھی جی بھر کر کی ہے۔ وصف کشمیر میں آپ کی مثنوی کا نمونہ حسب ذیل ہے:

چنارش چون زساعد افگند ظل | شود در گردن جوزا حمائل
سرِ شاخش بساق عرش پیوند | بشاخ گاو ماہی ریشہاش بند
بفرق آفتاب از مہربانی | زہر برگی کشیدہ سائبانی

شاہزادہ داراشکوہ "قادری" (م ۱۰۶۹ھ/۱۲۵۹ء) قادری شاہجہان کا بڑا بیٹا تھا۔ تخت نشینی کی جنگ میں عالمگیر کا مقابلہ کرتے ہوئے ۴۴ سال کی عمر میں مارا گیا۔ وہ مزاجاً صوفی مشرب تھا۔ ملا شاہ بدخشی، حضرت میاں میر ولی کے خلیفہ کا مرید تھا۔ اس نے اپنے مرشد اور دیگر صوفیہ کے حالات لکھے۔ "مجمع البحرین" نامی رسالہ میں اس نے اسلامی تصوف اور ویدانت کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اس کے مذہبی عقائد اکبر سے ہم آہنگ تھے جبھی اقبال فرماتے ہیں ؎

تخم الحادی کہ اکبر پروریدہ | باز اندر فطرت دارا دمید

قادری کی ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

ندیدم در جہان از کس وفائی | وفا دیدم بدل دیدم جفائی
شدم بیمار جز حق کس نہ پرسید | سوای حق نہ آدم آشنائی
مرا این اثر با مذہب عقرب | بود لطف تو زخم را دوائی
ندیدم من نظیر تو توقع | نکردم بد اگر جویم سوائی
شفائی دگر اگر خواہی زحق خواہ | ترحم ای قادری داری خدائی

سرمد مقتول (۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء) حکیم سرمد یہودی الاصل ایرانی تھے۔ حکمت و فلسفہ کا دقیق مطالعہ کر رکھا تھا۔ عہد عالمگیری میں برصغیر میں وارد ہوئے اور ایک مدت تک سیر و سیاحت کرنے کے بعد دہلی کے صوفیہ کے زمرہ میں آ شامل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ سرمد خلاف شرع باتیں کرتا اور برہنہ رہا کرتا تھا۔ وہ داراشکوہ کے احباب میں بھی شامل تھا اس لئے علماء نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا۔ اور شاہنشاہ عالمگیر نے اس کی توثیق کر دی۔

سرمد نے غزل بھی کہی ہے مگر وہ رباعی کا شاعر ہے۔ ایران میں حکیم عمر خیام اور سحابی استرآبادی اس صنف کے امام مانے گئے ہیں۔ برصغیر کی فارسی شاعری میں سرمد اس فن میں ممتاز رہا ہے۔ دو رباعیات ملاحظہ ہوں ــ

دنیا نہ بجستم طلب کر گسترز خس است — با دولت دیدار تو دین ہم قفس است
خواہان دو عالم دہیں است سنی — در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

سرمد غم عشق بلہوس را ندہند — سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمری باید کہ یار آید بہ کنار — این دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

پنڈت برہمن لاہوری (م ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء)

نام چندربھان تھا۔ عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگرد تھے۔ شاہجہان کے دفتر انشا میں ملازم تھا۔ بعد میں دارا شکوہ کا "منشی خاص" مقرر ہوا۔ اس کے قتل کے بعد عالمگیر نے اس پر نظر عنایت رکھی۔ آخری عمر میں برہمن بنارس میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ اور وہیں فوت ہوا۔

برہمن سادہ نویس شاعر تھا۔ اس کی غزل مختصر اور دلآویز ہے۔ چند رویدات کے مضامین بڑی خوبی سے نظم کئے ہیں۔ فارسی کے ہندو شعرا میں برہمن کا پایہ بے حد بلند ہے۔ ایک غزل ملاحظہ فرمائیں ــ

فکر بیہودۂ غم ہای جہان نتوان کرد — خویش را در گرد سود و زیان نتوان کرد
بحر دنیاست و در وی سیل حوادث بسیار — تکیہ بر رہ گذر آب روان نتوان کرد
صورت حال نگاہ دل غمگین کافی است — شرح این راز بہ تقریر زبان نتوان کرد
راز عشق است در سینہ نہان باید داشت — بہ کسی مصلحت راز عیان نتوان کرد
برہمن جز رہ تسلیم سپردن نتوان — سعی در پردۂ تقدیر توان ! نتوان کرد

ظفر خان احسن (م ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء)

نام احسن اللہ بیگ تھا۔ نجیب الدین خواجہ ابوالحسن تربتی خراسانی کا فرزند تھا۔ اکبر کے عہد میں برصغیر کی راہ لی۔ شاہزادہ دانیال کے ساتھ رہا۔ حیدرآباد دکن کے دیوان کے فرائض حسن و خوبی سے انجام دیئے۔ ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں حکومت کابل کے ضمن میں اپنے باپ کی نیابت سنبھالی۔ شعر و ادب کا رسیا تھا اور کئی شعرا کو وہاں اکٹھا کر لیا۔ میرزا صائب اور کلیم بھی پہلے احسن سے وہیں متعارف ہوئے تھے۔

۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء میں خواجہ ابوالحسن کشمیر کا ناظم مقرر ہوا اور ظفر خان احسن بھی اس کے نائب کے طور پر وہاں آ گیا۔ سات سال بعد وہ خود ناظم کشمیر متعین ہوا۔ اس سے قبل کچھ عرصہ وہ حیدرآباد دکن کا ناظم رہا تھا۔ وہ بادذوق شخص جہاں بھی گیا۔ شعرا و ادبا کی تشویق کی۔ دارا جیون و کشمیر سے اسے خصوصی تعلق خاطر تھا اس لئے

مختلف ترقیاتی کاموں کے انجام دینے کے سلسلے میں اس نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ صائب تبریزی احسن کی توصیف میں کہتا ہے ـــ

خانخانان را به بزم و رزم صائب دیده‌ام — در سخا و در شجاعت چون ظفرخان تو کیست
هر که چون من از ظفرخان یافت فیض تربیت — می رسد گر در سخن دعوی "خاقانی" کند

احسن نے کشمیر کی تعریف میں مثنوی "ہفت منزل" لکھی۔ غزل میں وہ اساتذہ کی صف میں شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بلبل فغان بیهوده در باغ می کنی — یک ناله بهر سوختن آشیان بس است
در حرم کو دشمنی کفر و دین چراست — از یک چراغ کعبه و بتخانه روشن است

یک دسته گلست نگارم ز باغ حسن — حسن آفرین بدست خود این دسته بسته است
احسن ز روزگار کنی شکوه تا به کی — آنرا که نیست خاطرش، از غم فگار نیست

احسن کا بیٹا عنایت خان آشنا بھی کشمیر کا ناظم رہا اور اوسط درجے کا شاعر تھا۔

ملا غنی کشمیری (م ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء)

ملا محمد طاہر غنی برصغیر کے ایک بڑے شاعر تھے۔ کشمیر میں فارسی شعرا کے آپ گل سرسبد کہلانے کے لائق ہیں۔ غنی اسم باسمیٰ درویش مزاج تھے۔ بقول اقبالؒ ـــ

شاعر رنگین نوا طاہر غنی — فقر او ظاہر غنی، باطن غنی

زندگی کا بیشتر حصہ وادی میں گزارا۔ سرینگر شہر آپ کا مولد و مستقر تھا۔ نمایش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ غنی کے اساتذہ سے ایک ملا محسن فانی تھے۔ غنی نے ۳۹ سال کی عمر میں انتقال کیا ہے۔

غنی سلیقے کا شاعر تھا۔ حکیمانہ و عارفانہ مضامین کو بانداز مشکل نظم کیا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کا دیوان گم ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دیوان کے مرتب محمد علی ماہر نے مشکل اشعار حذف کر دیئے۔ مختصر دیوان نول کشور پریس نے شائع کروا دیا ہے۔ دیوان میں مثنوی، رباعی اور غزل وغیرہ شامل ہے۔ ہم ایک غزل کے انتخاب پر اکتفا کریں گے ـــ

جنونی کو که از قید خرد بیرون کشم پا را — کنم زنجیر پای خویشتن دامان صحرا را
به بزم می پرستان محتسب خوش عزتی دارد — که چون آید بمجلس شیشه خالی می کند جا را
اگر شهرت هوس داری اسیر دام عزلت شو — که در پرواز دارد گوشه گیری نام عنقا را
به بزم می پرستان سرکشی بی طاقتی زاهد — که می ریزند مستان بی محابا خون مینا را
شکست از بس در و دیوار می بارد گر گردون — ز رنگ چهره ام ریخت رنگ خانهٔ ما را

نظارہ راہ بگردون درج تا باشد نفس در تن | رسائی نیست در پرواز مرغ رشتہ بر پا را
غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن | کہ روشن کرد نور دیدہ اش چشم زلیخا را

صائب تبریزی اصفہانی (م ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۶ء)

میرزا محمد علی صائب، جسے لوگ پیار سے "صائبا" کہا کرتے تھے، مشہور عارف شمس الدین محمد شیرین مغربی تبریزی (م ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء) کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا والد تبریز کا تاجر تھا جس نے اصفہان میں سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ میرزا صائب کچھ عرصہ شاہ عباس کے دربار سے بھی وابستہ رہے۔ اس کے بعد شاہجہان کے عہد میں برصغیر کی راہ لی۔ ایک بار ایران جا کر پھر لوٹ آیا اور کئی سال برصغیر کے مختلف علاقوں میں رہا۔ کشمیر میں وہ سلیم، کلیم اور احسن اور غنی کا مصاحب تھا۔ وہ مثالیہ کا شاعر تھا اس کی دلآویزی اور بلند خیالی کی سب نے تعریف کی ہے۔ قصائد اور مثنویاں اوسط درجے کی ہیں مگر غزل میں استاد بے بدل تھے۔ صائب کا ضخیم دیوان اور اس کے کئی منتخبات ایران میں چھپ چکے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان میں صائب کے کلیات کی ایک فوٹوسٹیٹ نقل چھپی جسے خود شاعر نے لکھا ہے۔ اس کے قدردان پاکستان، ایران اور دوسرے ممالک میں لاکھوں موجود رہے ہیں۔ صائب کی ہر غزل میں چند اشعار ضرب الامثال کہلاتے یا امثال سائرہ اور دلپذیر باتوں کے حامل مل جاتے ہیں۔

صائب دوسری بار برصغیر سے ایران لوٹا اور شاہ عباس صفوی ثانی (۱۰۵۲ھ-۱۰۷۷ھ) کے دربار میں ملک الشعراء کے عہدہ پر فائز ہوا۔ آخری زندگی گوشہ گیری میں گزاری اور اصفہان میں انتقال کیا۔ اس کی قبر مدتوں گم نام رہی۔ تہران یونیورسٹی کے پروفیسر جلال الدین ہمائی سنا اصفہانی نے اس قبر کو ڈھونڈ نکالا اور چند سال قبل وہاں ایک شاندار مقبرہ تعمیر ہوا ہے۔ قبر کے پرانے کتبے پر تاریخ وفات وہی ہے جسے ہم نے اوپر ضبط کیا ہے۔ یہاں اس کی چھوٹی بحر والی ایک سہل غزل کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

اگر دل از علائق کندہ باشی | بمنزل بار دیگر افگندہ باشی
چنان گرم از بساط خاک بگذر | کہ شمع مردم آئندہ باشی
ہمین جا صلح کن با ما چہ لازم | کہ در محشر ز ما شرمندہ باشی
ترا دادست زیبائی تمامی | کہ در ہر جامہ ای زیبندہ باشی
کمن چون صبحدم در فیض تقصیر | کہ دائم با لب پر خندہ باشی
اگر شب را چو انجم زندہ داری | ہمیشہ با رخ تابندہ باشی

محسن فانی کشمیری (م ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء)

ملا محسن فانی، غنی کے استاد تھے۔ جوانی میں برصغیر کے مختلف شہروں اور بلخ کی سیاحت

کی۔ کچھ عرصہ شاہجہان کی طرف سے الہ آباد میں قاضی القضاۃ رہے۔ پھر کشمیر لوٹ آئے اور آخری عمر تک وہیں تدریس و تعلیم اور تالیف کتب میں معروف رہے۔ "دبستان مذاہب" ادیان کے تقابلی مطالعے کی اہم کتاب ہے اور ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی مرحوم نے "کشمیر" (انگریزی) میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ وہ ان ہی کی تالیف ہے۔ کتاب انگریزی اور کئی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ فانی کا دیوان تہران میں چھپا اور چہارگانہ مثنویاں، "ناز و نیاز"، "میخانۂ راز"، "مصدر الآثار" اور "ہفت اختر" کو دہلی سے پروفیسر ڈاکٹر امیر سید حسن عابدی نے شائع کر دیا ہے۔ مثنویوں میں انہوں نے خمسہ نظامی کی تقلید کی ہے۔ فانی کی ایک غزل کا انتخاب درج ذیل ہے:-

در گرد باد حادثہ یک مہربان بس است
گر دست بر زمین نرسد، آسمان بس است

بر خوانِ خود نشین، ز چو جہان عزیز باش
نان در دست گر نرسد نیم نان بس است

دشمن گر از خلاف برآید مدہ جواب
خاموشی تو چو بہر تیغ زبان بس است

اہل کمال عمر بہ سستی بسر برند
یعنی برای رزق ہما استخوان بس است

فانی دکانِ عشق بہر کوچہ وا مکن
یک دل متاع داری و یک آستان بس است

غنیمت کنجاہی (م ۱۱۰۷ھ/۱۶۹۶ء)

ملا محمد اکرم کنجاہ (گجرات، پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ اس کی مثنوی "نیرنگِ عشق" اس کی غزلیات سے زیادہ قابل قدر اور دلچسپ۔ مجموعی طور پر غنیمت نے دار الحکومت سے دور ہوتے ہوئے بھی اچھے شعر لکھے ہیں۔ اس کا کلیات چھپ چکا ہے۔ مثنوی "نیرنگِ عشق" سے چند ابیات، معاصر مغل شاہنشاہ اورنگ زیب کی تعریف کے حامل نقل کئے جاتے ہیں:-

بیا ای خامہ گرداری زبانی
بہ مدح شاہ سرکن داستانی

شہ اورنگ زیب کامرانی
چراغ دودۂ صاحبقرانی

سرافراز جناب بی نیازی
پناہ شرع، عالمگیر غازی

بہ دورِ عدل این شاہ ستم سوز
نگہ آید بہ در دزدیدہ ہر روز

بہ تختِ سلطنت ہم شوکت جمّ
بُود در خلوت ابراہیم ادھم

بُود روشن ز درویشی در عبادت
شکستِ رنگ چون صبح سعادت

بہ ذکرِ حق چو آید بر سر جوش
فلک را پرتش گوید کہ خاموش

ناصر علی سرہندی (م ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶ء)

علی سرہندی، حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے خلف و خلیفہ، شیخ محمد معصوم کا مرید تھا۔

نازک خیالی کے لئے مشہور ہیں چنانچہ شیخ حزین لاہیجی، ان کے اشعار اور بیدل کی نثر کو نا اہل فہم قرار دیتے تھے۔ اس کے باوجود، ناصر علی سرہندی کے ان سادہ اور دلآویز اشعار بھی ملتے ہیں۔ مثلاً

تو چون ساقی شوی دور تنگ ظرفی نمی ماند — بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلها
نظر اغافل و عالم پر از کیفیت حسنش — بود عکس پری در شیشه با رنگ شرابش را
بعشر حرف بی صرف است زیاد شهید نقش — نمیدانم کرداد این سرمه چشم نیم خوابش را

صادق کشمیری (م ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء)

شاہ صادق، صوفی صافی تھے۔ وہ کچھ عرصہ دہلی اور لاہور میں رہے اور باقی عمر اپنے وطن کشمیر میں گزاری۔ ان کی زندگی کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ ان کے کلیات کا ایک انتخاب ۱۹۶۰ء میں سرینگر سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی شہرت کا بیشتر دار و مدار ایک ترجیع بند پر ہے۔ جس کے ۲۰ بند ہیں۔ پہلا بند یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

چشمی کہ خیال تست دردی — کز مین ندیدہ غیر لاشی
صد کشتہ چشم تو بخیزد — بلبہات زند چو بانگ لاشی
آواز جرس بسی شنیدند — نی بردہ کسی بمنزلت پی
تنگی جہان چو دل بگیرد — مستی مدام خواہم از وی
حقا ز کسی طلب ندارم — جز رطل گران و جام پر می
از زہد ریا کنون گذشتم — تا رفتہ بپای خم بیفتم

میرزا اکمل بدخشی کشمیری (م ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء)

میرزا محمد اکمل الدین کامل کے آبا و اجداد بدخشان سے آکر وادیٔ جنت نظیر کشمیر میں آباد ہو گئے تھے۔ اکمل کشمیر میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں دہلی آئے۔ شاہجہان نے اکرام کیا۔ کشمیر لوٹ کر آپ خواجہ حبیب اللہ گنائی کے زمرۂ مریدین میں شامل ہو گئے اور ساری عمر زہد و فقر میں بسر کی۔

اکمل "رومی ثانی" کہلاتے ہیں۔ مولانائے روم کی مثنوی کی تقلید میں انہوں نے "بحر العرفان" لکھی جس کے ۸۰ ہزار ابیات ہیں اور چار جلدوں میں ہے۔ آپ علامہ اقبالؒ کی مانند اپنے آپ کو رومی کا مرید کہتے تھے۔ "مخزن الاسرار" آپ کا ایک طویل عرفانی قصیدہ ہے جس میں عوالم ناسوت، لاہوت اور جبروت کی توضیح ملتی ہے۔ "بحر العرفان" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

صوفی آنکہ باحق است مسرور — او ز تعظیم خلق باشد
نیست وقت جہاد در این عہد — اہل دین را چو داشت در دین جہد

منزوی رو بدشت و طاعت کوش — طاعت حق ز خلق و خورد می پوش
گر به صوفی گیری شوی مشهور — شہرت خلق سازدت مغرور
از غرورت چو نفس سر برداشت — حق پرستی دگر ز سر بگذاشت

منقولہ اشعار سے واضح ہے کہ اکمل کے ہاں مثنوی معنوی کا زور بیان ہے اور نہ معنوی بلندی۔ آخر روکش روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود اکمل کے اچھا شاعر ہونے کے بارے میں کلام نہیں ہے۔

جویا تبریزی کشمیری (م ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء)

جویا کشمیر میں پیدا ہوئے۔ مگر اپنے آباء و اجداد کے وطن کی نسبت سے تبریزی کہلاتے رہے۔

جویا کا دیوان ڈاکٹر محمد باقر کی کوشش سے چھپ چکا۔ (لاہور ۱۹۵۹ء) اور اس میں "دیوان صائب کی مانند" بجلا صاف سخن موجود ہیں۔ جویا، صائب کا معتقد تھا مگر اس کے کلام کی پختگی، جزالت اور ولاویزی مسلم ہے۔ اس کے بیان کردہ مضامین میں اکثر تازگی نظر آتی ہے۔ تراکیب و امثال کے استعمال میں بھی ندرت دکھاتا ہے۔ شاعر کا استعمال کشمیر میں بہ کثرت ہوا ہے۔ یہاں ہم اس کی ایک غزل کا انتخاب، نمونہ کلام کے طور پر، نقل کرتے ہیں۔

ملاحت از نمک پروردہ‌ای اوست می دانم — تبسم خانہ زاد آن لب کم گوست می دانم
قیامت دوش بر دوش خرام سرو آزادش — رعونت سایہ پرورد نہال اوست می دانم
ز جوش بی دماغی نکہت گل بر نمی تابم — سرم سودائی آن زلف عنبربوست می دانم
ز سیر گلشن کشمیر گلہای توان چیدن — نسیمش از ہواداران آن گیسوست می دانم
وفا از دور گردان نگاہ او بود جویا — تغافل پیشہ آن نرگس جادوست می دانم

نعمت خان عالی (م ۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء)

عالی، عہد عالمگیری میں داروغہ مطبخ اور حاکم خزانہ رہے۔ "مقرب خان" آپ کا لقب تھا۔ وقائع نعمت خان اور مضحکات میں انہوں نے اپنے عہد پر انتقادات لکھے ہیں۔ ان کے دیوان میں شہر آشوب بھی ملتے ہیں جن میں وہ معاصر حالات کے ناقد نظر آتے ہیں۔ ان کے قصائد میں اورنگ عالمگیر کی فتوحات کے واقعات تاریخیاً بیان کئے گئے ہیں۔ عالی کی غزل بھی اچھی ہے، ایک انتخاب پیش خدمت ہے۔

شد آمدنم رفتن چون موج بر آب اندر — نادیدنِ من دیدن، چون چشم بہ خواب اندر
پیدایم و پنہانم چون معنی ہر لفظی — موجودم و معدومم، کیفم بہ شراب اندر
ہم دردم و ہم نزدیک چون عکس بگرد چشم — ہم عشرت و ہم حسرت چون وصل بہ خواب اندر
بنمایم و ننمایم چون قطرۂ آئینہ — پیدایم و پنہانم، آبم بہ شراب اندر

حالی چو کتاب من، ہم خامش و ہم گویا ۔۔۔ مضمون سالم من، پنہان بہ حجاب اندر

شیخ راہو محمد چشتی (۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء)

کشمیر کے اشائی قبیلے کے ایک عارف فرد تھے، "تصوف" اور اس کے متعلقات کے بارے میں ہزاروں پختہ شعر کہے ہیں۔ مثنوی "گنج فقر" میں آپ نے فقر و تصوف کے رموز بیان کئے ہیں۔ "کنز العشق" میں آپ نے صوفیہ کے جذبۂ محبت و عشق کی رموز گنائی ہیں۔ "سراج السالکین" کا نام ہی اس کے موضوع کا غماز ہے۔ "عروۃ الوثقی" نامی آپ کا ایک دوسرا فقریہ منظوم رسالہ ہے جس میں کلمہ طیبہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ اس آخری رسالے کے ابتدائی اور اختتامی اشعار ملاحظہ ہوں:

ہست بہر لقای پاک اللہ ۔۔۔ عروۃ، لا الہ الا اللہ
این مراد بلند گر خواہی ۔۔۔ ذکر کن لا الہ الا اللہ
شمع راہ ہدایت نبوی ۔۔۔ نور دین لا الہ الا اللہ
ختم کار ہمہ سعادت باد ۔۔۔ بہ یقین لا الہ الا اللہ
ختم کار محمد چشتی ۔۔۔ باد بر لا الہ الا اللہ

بیدل عظیم آبادی (م ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء)

ابو المعالی میرزا عبد القادر بیدل، اپنے عہد کے بے نظیر شاعر تھے۔ آپ ترک چغتائیوں میں سے تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے اور زندگی کا بیشتر حصہ شاہجہان آباد میں گذارا، اور وہیں مدفون ہیں۔ بیدل کی نثری تالیفات سے قطع نظر، ان کے ضخیم کلیات میں ہر صنف سخن موجود ہے۔ کلیات کی چار ضخیم جلدیں چند سال قبل کابل سے شائع ہوئیں۔ افغانستان اور روس کے فارسی زبان کے علاقوں میں کلام بیدل کا خاص تداول ہے۔ پاکستان میں ڈاکٹر عبد الغنی نے بیدل کے بارے میں اردو اور انگریزی میں اچھی کتابیں لکھی ہیں۔

بیدل ایک عارف، بیدار دل، خود شناس اور خود نگر شخص تھے۔ امرا و سلاطین سے تعارف کے باوجود آپ نے کبھی کسی کی مدح نہیں کی۔ تفکر و تفلسف آپ کا شعار و دثار رہا۔ آپ کے اشعار لاکھ سے متجاوز ہیں۔ اور ان میں تفکر و نظر کا عمق نظر آتا ہے۔ برصغیر کے عظیم شعرا میں سے میرزا غالب اور علامہ اقبال بیدل کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔ بیدل کی مشکل پسندی ایک مسلمہ ہے۔ ان کے معانی والفاظ بھی خاص ہیں۔ بیدل کے خاص موضوعات درس عرفان، خودداری، تحیر اور تحیر طلب ہیں۔ یہاں ہم آپ کی ایک غزل کا انتخاب درج کرتے ہیں:

راحت جاوید عشاق از فضول دشمنی است ۔۔۔ سجدۂ شکر کہ چشم از تماشا بستنی است

از کشاکش نیست این یک نفس فرصت شمار — کار رنگ شیشۂ ساعت زیاد نشستن است
تا چہ زاید صبحدم کامشب بہ بزم نوبہار — غنچہ چون مینای می از خون عیش آبستن است
شرمی از آزار دلہا کن کہ در ملک وفا — بہر ناموس مروت رنگ ہم بشکستن است
از مکافات عمل ایمن نباید زیستن — سر بریدہ نہالی نامی عبرت دل جستن است
ہمچو اشک از انفعال دستگاہ مادمی — آب باید شد کہ آخر و بختی از خود رستن است
زانقلاب دہر بیدل کارم از طاقت گذشت — بعد ازین از سخت جانی سنگ بر دل بستن است

مشتاق کشمیری (م ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۱ء)

محمد رضا مشتاق، ایک استاد شاعر تھے۔ خطاطی جانتے تھے اور مثنوی و دیگر نسخے لکھ کر روزی کماتے تھے۔ درویش صفت شخص تھے۔ کسی کی مدح لکھی نہ ہجو۔ آپ کا دیوان شعر ۱۹۶۳ء میں ایک کشمیری سکالر شمس الدین احمد نے ترتیب کیا ہے۔ آپ کی مثنوی "قضا و قدر" اپنی داستان اور انداز بیان کے اعتبار سے بہت پسند کی جاتی رہی ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے ایک برہمن زادہ اور برہمن زادی کے ناکام عشق کی دلگداز داستان لکھی ہے۔ اس داستان کو میرزا علی لطف نے "نیرنگ عشق" کے نام سے اردو مثنوی میں منتقل کیا تھا۔ اور یہ چھپ چکی ہے۔ یہاں ہم مشتاق کی ایک ایسی غزل کا انتخاب درج کرتے ہیں جو حضرت امیر خسرو کی تقلید میں ہے۔

ادب مہر لب دل بود، شب جائی کہ من بودم — تمنا مرغ بسمل بود شب جائی کہ من بودم
بقیدم ای شوق کشتن گرد سر نازی — نسیم غنچۂ دل بود شب جائی کہ من بودم
چہ می پرسی زند ہوشان نشان غمزۂ ساقی — خبر بیرون محفل بود شب جائی کہ من بودم

ایک دوسری غزل کے تین شعر ہیں۔

کردیم سیر گلشن، تا ما و یار ہر دو — گفتند بلبل و گل بی اعتبار ہر دو
چشم سیاہ مستش لعل قدح بدستش — از عاشقان ربودند، صبر و قرار ہر دو
آیا بود کہ روزی این آرزو بر آید — خسپند مست باہم مشتاق و یار ہر دو

ساطع کشمیری (م ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء)

عبدالحکیم ساطع، جویا کے شاگرد بتائے جاتے ہیں[1]۔ واقعات کشمیر، مثنوی، قصیدہ، رباعی اور غزل لکھے ہیں۔ کلام میں جدت و ندرت کے نمونے ملتے ہیں۔ ساطع غنی کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

---

[1] مرا چو نیز استادان بری نکتہ سنجیدن — ہمین بس بہجت ساطع کہ جویا بود استادم
(ساطع)

فرماتے ہیں:

نکتہ پردازی اگر ہست غنیؔ است امروز	پیش ازیں عہد شنیدم کہ غنی ہم بوداست

کلام کے نمونہ کی خاطر دو شعر ملاحظہ ہوں۔

دست ہمت اگر خواہی عار از گریہ مست	ابر چند انکہ بارد ، بحر پرمایہ شود
وز ترک نشاط است اگر ہست نشاطی	آرام ندارد دل من غیر تپیدن

محمد اشرف بلبلؔ (م ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء)

بلبلؔ کا مولد و مدفن کشمیر ہے۔ جیسا کہ ان کے سالِ وفات سے ظاہر ہے۔ انہوں نے مغلوں کے علاوہ افغان عہد (۱۷۵۲ء۔ ۱۸۱۹ء) کے چند سال دیکھے ہیں۔ آپ مثنوی کے شاعر تھے۔

مغلوں کے حاکم افراسیاب خان نے افغان عہد کا زینہ فراہم کیا۔ اس کے ایما پر عبداللہ خان نے حملہ کرکے کشمیر کو افغانستان کا ضمیمہ بنا لیا اور افغان عہد نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک برقرار رہا۔

محمد اشرف بلبلؔ درویش منش شخص تھے۔ معاصر سیاسی انتشار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے۔ وہ شعر و سخن کی دنیا میں محو رہے۔ انہوں نے خمسہ نویسوں کی تقلید میں خمسہ لکھا۔ اور "نظامئ کشمیر" کہلائے ان کی مثنویوں کے نام مہر و ماہ ، وزن دہیہ مال ، رضا نامہ ، ہشت تمہید اور ہشت اسرار ہیں۔ پہلی دو مثنویاں عاشقانہ ہیں۔ اور آخری دو صوفیانہ۔ بیچ کی مثنوی ، رضا نامہ ، مذہبی حماسہ ہے جس سے شہدائے کربلا کے واقعات شہادت نظم کئے گئے ہیں۔ اسی مثنوی سے ایک نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

حسینؑ بیکس دبی حد و بی پدر	سراسیمہ در ماندۂ خونِ جگر
نہ آبش دہندو نہ راہش دہند	غم و درد در جان پاکش نہند
چو خورشید در بر لباس سیاہ	ہمی گفت زاری و می کرد آہ
چنان کرد زاری کہ جبرئیل ہم	فرو ماند رنگیلیت در رنج و غم
بہ تعزیتِ سرورِ انبیاء	موافق شدہ یافت جانش ضیاء

ملا لعل محمد توفیقؔ (م ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء)

توفیقؔ ، جامع مسجد سرینگر سے متصل رہتے تھے۔ ساطعؔ اور درشانؔ کے شاگرد تھے۔ کشمیر کے حاکم ، سکھ جیون مل نے انہیں ملک الشعراء کا لقب دیا تھا۔ اس حاکم نے شاہنامہ کشمیر لکھوانے کے لئے سات شعرا کا ایک بورڈ بنایا تھا۔ جن میں ایک توفیقؔ شامل تھے۔ انہوں نے کوئی دو ہزار شعر لکھے تھے۔ کہ جیون مل قتل ہو گیا اور شاہنامہ کشمیر کا کام رک گیا۔ توفیقؔ نے قصائد ، غزلیات اور رباعیات بھی لکھی ہیں۔ ان کا مختصر دیوان بیشتر خواجہ حافظؔ اور میرزا صائبؔ کے رنگ میں ہے۔ حافظؔ کی تقلید میں آپ

کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے ؎

دوش بر عشق چون سیماب براتم دادند | نقد آرام گرفتند و حبابم دادند

تصنیفات کے حال دو شعر ملاحظہ ہوں،

بہ غزلِ خواجہ را گوید توفیق | "دوش رفتم بدر میکدہ خواب آلود"
دل برد از من مصرعِ صائب کہ گفت | "راہِ صوفی پیش طوطی ہمچو شکر داشتم"

توفیق کے دو مزید شعر ہیں ؎

ما راہِ عشق طی بطریقِ دگر کنیم | خلق آنچہ می کنند بہ پا، ما بہ سر کنیم
چون اہلِ کیمیا قرو شمس ما بجاست | در عشق، کی نگاہ بہ شمس و قمر کنیم

حزیں لاہیجی اصفہانی (م ۱۱۸۱ھ/ ۱۷۶۷ء) شیخ محمد علی حزیں، اصفہان میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں ایران و عرب کی سیاحت کی اور آخر بر صغیر کا رُخ کیا، اور بنارس میں ایسے مقیم ہوئے کہ یہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔ لوحِ مزار پر ان کے دو شعر مرقوم ہیں ؎

زباندانِ محبت بودہ ام، دیگر نمی دانم | ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامی شنید اینجا
حزیں از پای رہ پیما بسی سرگشتگی دیدم | سرِ شوریدہ بر بالینِ آسائش رسید اینجا

جس غزل کے یہ شعر ہیں، اس میں حزیں نے کہا تھا،

از بنارس نہ روم، معبدِ عام است اینجا | ہر برہمن بچہ، لچھمن و رام است اینجا

آپ کی دو مشہور تالیفات تذکرۂ حزیں اور تاریخِ حزیں ہیں۔ جس میں وہ برصغیر کے لوگوں سے خاص تعصب دکھاتے ہیں۔ حزیں نے شعر میں چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ ان دواوین کو آپ نے خود مرتب کیا تھا۔ آپ ایک نادر کلام شاعر ہیں۔ ایک غزل کا انتخاب درج ذیل ہے ؎

می گزشتیم بجانان سرِ راہی گاہی | او ہم از لطف نہان داشت نگاہی گاہی
چہ عجب گر نگہش داشت سرِ الفتِ ما | برقِ رحمت نوازش بگیاہی گاہی
این گران آمدہ باشد بدلِ نازکِ او | می شود بار بخاطر پرِ کاہی گاہی
دوسہ روز است کہ روز دید نگہ دین بجہت | نہ توان زمن آید، نہ گناہی گاہی
لیک نومیدنیم از آن نگہِ بندہ نواز | می شود روز، ز بختِ سیاہی گاہی

عبدالوہاب شائق سرہنگیری (م ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء) شائق کے مفصل حالاتِ زندگی نامعلوم ہیں۔ شائق نادر کشمیر کے

میں آپ ملا محمد توفیق کے معاصرین میں شامل تھے۔ مگر آپ کی شہرت کا دارومدار مثنوی "ریاض الاسلام" پر ہے جس کے چالیس ہزار ابیات ہیں۔ اور شاعر اسے "شاہنامۂ اسلام" قرار دیتا ہے۔ یہ طویل مثنوی کشمیر کے صوفیا اور سادات وغیرہم کی منظوم تاریخ ہے۔ ابتدا میں شاعر نے "شاہنامۂ فردوسی" کا ذکر کیا ہے۔

نیم ہمچو فردوسی پاک دین — کہ شہ نامہ گوییم بلفظ یقین
ملا توبہ آن سخنور کجاست! — میزان او گنج گوہر کجاست!

مثنوی "ریاض الاسلام" کے چند منتخب ابیات ملاحظہ ہوں:

بحق ہر کہ سودا کند، سود اوست — ندارد زیان، جملہ بہبود اوست
بسودای عشقش بود سود کس — ہمین مایہ اصل سود است و بس
بسودای دنیای دون دل مبند — گرفتار این دام باشی تو چند!
بلی اصل دنیاست نقشی بر آب — کہ گردد بیادی بیکدم خراب
بود اصل گوہر یکی قطرہ آب — ولی در نظرہا نماید سراب
با این گوہر و دریا بر مپیچ — کہ این عقدہ گرواکنی نیست ہیچ

واقف بٹالوی (م ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء)

نورالعین واقف، سراج الدین علی خان آرزو کے قلمی شاگرد تھے۔ آپ ڈاک کے ذریعے ان سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ واقف نے آزاد بلگرامی (مقیم اورنگ آباد دکن) اور حزین لاہیجی سے ملاقاتیں کیں۔ بابا احمد شاہ ابدالی کی دعوت پر کابل گئے۔ کچھ عرصہ نواب بہاول پور کے دربار سے وابستہ رہے اور آخری عمر میں وہیں گوشہ گیری اختیار کی۔ واقف کا انتقال بہاول پور میں ہوا ہے۔ آپ اوسط درجے کے غزل گو ہیں۔ قصیدے اور رباعیات بھی خاصی کہی ہیں۔ ایک مسلسل غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

بیاد آرم چو صحبت ہای یاران — مژہ از دیدہ ریزم ہمچو باران
کشم از خمار، خار گلعذاران — ہزاران نالہ مانند ہزاران
نماند امروز غیر از شمع زندہ — کسی از دودۂ شب زندہ داران
دل نگذاشت باکس از تطاول — کمند گیسوی این دل شکاران
بروز وصل واقف اشک شادی — چو باران است در فصل بہاران

منت دہلوی (م ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء)

ملک الشعرا میر قمرالدین منت نے جوانی دہلی میں اور لکھنؤ میں گزاری۔ آخری عمر کلکتہ میں بسر کی۔ اور وہیں فوت ہوئے۔ منت کے کلام میں سادگی، صفائی اور دلآویزی پائی جاتی ہے۔ ان کے دور میں

سبک اصفہانی (ہندی) کی دشواری عام تھی مگر وہ اس سے محترز رہے ہیں۔ ایک غزل کا انتخاب دیکھیں، چھوٹی بحر اور سادہ الفاظ میں بہ تقلید سعدی کیا جادوگری کی ہے ـــ

خوبی ز تو خوب تر نباشد ۔ با خوبی تو بشر نباشد
ہر کس کہ ترا پری کند نام ۔ از دیو دیوانہ تر نباشد
ہر چند کہ جمال پاکت ۔ مقدور بشر نظر نباشد
پنہان نگہی کنم بہ دوریت ۔ زان سان کہ ترا خبر نباشد
عشق از تیغ او چو سعدی ۔ روزی بر ود کہ سر نباشد

محمد حسن قتیل لاہوری (م ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۷ء)

قتیل فارسی کے علاوہ اردو کے بھی شاعر اور فن انشا کے ماہر تھے۔ ان کی شاعری اوسط درجے کی ہے مگر بعض فارسی غزلیں مرصع اور دلپذیر ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں ـــ

غم عشق تو پایانی ندارد ۔ چہ درد است اینکہ درمانی ندارد
جنون را گو کہ سوی ما نیاید ۔ کسی اینجا گریبانی ندارد
اثر در گریۂ مجنون مجوئید ۔ کہ لیلی چشم گریانی ندارد
چہ داند رتبۂ خار مغیلان ۔ بسی روزی کہ دامانی ندارد
مسلمانان! مسلمانش مگوئید ۔ قتیل کافر ایمانی ندارد

"را بہانہ ساخت" ردیف کے ساتھ قتیل نے معروف غزلیں کہی ہیں۔ اور ان کے مطلعے حسب ذیل ہیں:

ما را بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت ۔ خود سوی ما ندید و حیا را بہانہ ساخت
سویم نگند تیر و خطا را بہانہ ساخت ۔ تیرہ گر کشید و ادا را بہانہ ساخت

قتیل لاہور کے رہنے والے تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ شاہجہان آباد میں بسر کیا اور لکھنؤ میں فوت ہوئے۔

حمید کشمیری (م ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء)

فردوسی کشمیر، ملا حمید اللہ نے افغانستان کے علاوہ وادی جموں و کشمیر کے سکھ حکمرانوں کا عہد (۱۸۱۹ء- ۱۸۴۶ء) بھی دیکھا۔ وہ سکھوں کا مخالف اور افغانوں کا مداح تھا۔ انہی لئے اس نے مثنوی "اکبر نامہ" میں حاکم کابل، دوست محمد خان کے والد کی شجاعت و دلاوری کا ذکر کیا ہے۔ اس طویل مثنوی نے اسے "فردوسی کشمیر" کا لقب دلوایا ہے۔ اور اس نے چند دیگر مثنویاں بھی لکھیں: "چای نامہ"، "شکرستان" اور "بی یوچ نامہ" وغیرہ۔ اس آخری مثنوی اور ایک منثور کتاب "ناپرسان نامہ" میں حمید نے معاصر سکھ حکمرانوں کا شہر آشوب لکھا اور معاشرتی بدحالی کا استہزا کیا ہے۔ حمید کی مثنوی "اکبر نامہ" کشمیری فارسی مثنویوں میں بلحاظ رزم بے نظیر ہے۔

شاعر نے، فردوسی طوسی کی کامیاب تقلید کی۔ اور دلآویزی دکھائی ہے۔ مندرجہ ذیل نمونہ، دوست محمد خاں کے نام ہری سنگھ نلوا کے خطوط سے ماخوذ ہے ؎

بنام خدا زندۂ آسمان — کہ تر تیغ را داد تیر و کمان
زمین را کند تیر باران فلک — تگر صاعقہ توپ و تندر تفنگ
بر آنم من ای سرور کابلی — کہ یک بار چون رستم زابلی
بہ ترکان چنین ترکتازی کنم — بہ گردون یکی نیزہ بازی کنم
شبیخون بہ بلخ و بخارا زنم — سنان بر سر سنگ خارا زنم
خبر کردمت پیش پیشانی گوش — عنان سر سری، ہوش کن ہوش ہوش
بہ خدمت کمر بستہ یا در گریز — وگرنہ من و کابل و تیغ تیز
کہ چون از میان برکشم تیغ کین — نہ غزنین گذارم، نہ کابل زمین

حضرت نیاز بریلوی (م ۱۲۵۰ھ / ۱۸۸۵ء)

پیر و مرشد حضرت نیاز بریلوی کا نام نیاز احمد تھا، عالم فاضل اور صاحب نفوذ بزرگ تھے۔ کئی سلاسل صوفیہ میں بیعت تھے اور ارشاد خلائق کو اپنا مطمح نظر بنا رکھا تھا۔ ان کا دیوان، جس میں فارسی کے علاوہ اردو اور ہندی کا کلام شامل ہے۔ ۱۳۸۹ھ/ میں جناب شفیق بریلوی نے کراچی سے شائع کروایا ہے۔ اس میں کئی اصناف سخن شامل ہیں۔ آپ کا فارسی کلام پرسوز اور ہموار ہے۔ نمونہ غزل سے انتخاب کیا گیا ہے ؎

ہر لحظہ رخ جانانم این چنین — آئینہ دار دیدہ حیرانم این چنین
یارب روان ز نشتر مژگان کیست این؟ — فوارۂ روان ز رگ جانم این چنین
تا بستہ ام خیال رخ و زلف آن نگار — چرانم این چنین و پریشانم این چنین
لب خشک و تشنہ کام و جگر تفتہ ام ہنوز — حالانکہ غرق قلزم عرفانم این چنین
زین پیشتر تو من شدی، الحال من توام — بود از برای شکر تو شایانم این چنین
درد من ای نیاز بردی نمی رسد — در مجمر سپہر سپندانم این چنین

نیاز نقشبندی (م ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء)

خواجہ شاہ نیاز نقشبندی، کشمیر کے ایک صوفی شاعر تھے۔ ان کے والد خواجہ عبدالرحیم کلان صوفی باصفا تھے۔ نیاز نے ایک بار ترکستان کا سفر کیا اور بقیہ عمر وادی میں ہی بسر کی۔ مرفہ الحال تھے۔ غزل گوئی کے علاوہ

آپ نے ایک دلچسپ مثنوی "جاہی نامہ" لکھی ہے۔ غزل کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

تیزی خنجر مژگان تو بی چیزی نیست	شوخی نرگس فتان تو بی چیزی نیست
غمزهٔ خونریز و بیت جان رہ و زلف زنجیر	شوخی من این سروسامان تو بی چیزی نیست
میل دل بردن خوبان گلستان داری	جلوه سرو خرامان تو بی چیزی نیست
شوخ چشمی نگر از دست تو دل برد نیاز	آه این گریهٔ پنهان تو بی چیزی نیست

میرزا مهدی مجرم (م ١٢٥٣ھ/١٨٥٦ء)

مجرم، کشمیر کے سربرآوردہ شعرا میں سے ایک تھے۔ علامہ اقبال ان کی شاعری کے بے حد مداح تھے۔ ان کی مثنوی غزل اور رباعی ایک سے ایک بہتر ہے۔ ان کا ضخیم کلیات ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ دو غزلوں میں سے دو دو اشعار کا انتخاب دیکھیں۔

بیا کہ سوزدم از غم نفس نفس بہ قفس	ز نالہ بستہ بنالم جرس جرس بہ جرس
سوارہ می رسی ای شہسوار، می خواہم	کہ ہم عنان تو تازم فرس فرس بہ فرس

شمع کہ بہر محفل، می سوزم و می نازم	نم از مژہ غم و درد دل اندوزم و اندازم
از نرگس فتانت ، مخمورم و مفتونم	با سنبل پیچانت ، ہمدردم و ہمرازم

مجرم نے اپنی حالت عمر اور کہنہ مشقی کا ذکر یوں کیا ہے ۔

بہ فکر شعر مویم شد سفید ای خاک بر فرقم	ازین گل پاک کن سرچشمهٔ طبع روانم را

میرزا غالب دہلوی (م ١٢٨٥ھ/١٨٦٩ء)

میرزا نوشہ، اسد اللہ خاں غالب، جو اسد کو بھی دونوں تخلص کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اردو اور فارسی کے نظم و نثر اساطین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے بارے میں اردو اور انگریزی میں درجنوں اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ١٩٦٩ء میں ان کی وفات کو صد سال گذر جانے کی مناسبت سے پاکستان، ہندوستان، افغانستان، روس، ایران، انگلستان اور امریکہ میں ان کے بارے میں گرانقدر مقالے پڑھے گئے اور "غالبیات" کے شعبے میں نمایاں اضافہ ہونے کی صورت سامنے آئی۔

غالب اپنے آپ کو بنیادی طور پر فارسی کا شاعر جانتے تھے۔ مگر اہل زمانہ نے ان کے اردو دیوان کا فارسی کے مقابلے میں کہیں زیادہ استقبال کیا ہے۔ قاطع برہان، مہر نیمروز، مکاتیب اور کلیات نثر فارسی، غالب کی زندہ جاوید یادگاریں ہیں مگر یہاں ہمیں ان کے کلیات نظم فارسی سے ربط سخن ہے۔ غالب کے اس فارسی کلیات کے علاوہ اس زبان کی چھوٹی بڑی گیارہ مثنویاں موجود ہیں۔ کلیات میں جملہ اصناف سخن موجود ہیں۔

غزلیات، قصیدہ، قطعات، ترجیع و ترکیب بند اور رباعیات وغیرہ۔

غالبؔ، بے نظیر دل و دماغ کے مالک تھے۔ انہوں نے فارسی ادب کی روایات کو بڑی فعالیت سے جذب کیا اور انہیں اپنی نظم و نثر میں سمویا ہے۔ انہوں نے فارسی کے متعدد نادر کلام شعراء کے کلام پر تضمین کی ہیں۔ رومیؔ، سعدیؔ، خسروؔ، حافظؔ، جامیؔ، عرفیؔ، فیضیؔ، نظیریؔ، ظہوریؔ اور بیدلؔ کے نام ان کے کلیات میں اکثر موجود ملتے ہیں۔ بیدلؔ سے ان کو خصوصی تعلق تھا۔ اگرچہ انہوں نے بیدلؔ کی دشوار پسندی کا اظہار کیا۔ اور ان کی تقلید سے احتراز برتنے کا اشارہ کیا ؎

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خان قیامت ہے

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدت العمر تقلید بیدلؔ سے آزاد نہ ہو سکے۔ اقبالؔ۔ بیدلؔ کی توصیف کے ساتھ: غالبؔ کے فکر و فن کے مداح تھے۔

غالبؔ، مغلیہ تہذیب کا ایک مینار کہے جا سکتے ہیں۔ فکر و فن کی بلندی کے ساتھ، ان کے کلام میں معاصرہ تقاضے منعکس ہیں مثلاً فارسی کی کساد بازاری کے بارے میں یہ دو شعر ؎

بیا ورید اینجا گر بود زباندانی — غریب شہر سخنہای گفتنی دارد

ہی چہ میگریم اگر اینست وضع روزگار — دفتر اشعار باب سوختن خواہد شدن

یہ چند سطریں مقام غالبؔ کے اظہار کی خاطر نارسا ہیں مگر اس کتاب کے اسلوب کے مطابق، غالبؔ کی غزل کا ایک انتخاب درج ہیں ؎

ای ذوق نواسنجی بازم بخروش آور — غوغای شبیخونی بر بنگہ ہوش آور

گر خود نجہد از سر از دیدہ فرو بارم — دل خون کن و آن خون را در سینہ بجوش آور

ہان ہمدم فرزانہ، دانی رہ ویرانہ؟ — شمعی کہ نخواہد شد از باد خموش، آور

شورابۂ این وادی تلخ است، اگر داری — از شہر عبوری من سرچشمۂ نوش آور

دانم کہ رزی داری، ہرجا گذری داری — می گر ندہد سلطان، از بادہ فروش آور

گاہی بہ سبک دستی از بادہ ز خویشم بر — گاہی بہ سیہ مستی از نغمہ بہوش آور

غالبؔ کہ بقایش باد ہمپایۂ تو گر ناید — باری غزلی فردی زان موئینہ پوش آور

اس دور کا انشاء و ادب

عہد مغلیہ انشاء و ادب کی کتب کے لحاظ سے مالا مال ہے۔ ابوالفضل علامی اکبرآبادی (م ۱۰۱۱ھ) کے مکتوبات جہانگیر کی تزک، اورنگ زیب عالمگیر کے رقعات، حکیم سعد اللہ خان اور ابوالفتح گیلانی کے مکتوبات، ظہوری ترشیزی کے سہ گانہ رسائل اور "سہ نثر" اور وقائع نعمت خان عالی جیسے چھپے اور فارسی انشاء و ادب کا اعلیٰ نمونہ

پیش کرتے ہیں۔ شاہنشاہ ظہیر الدین بابر کی "تورک" کو پہلے شیخ زین العابدین وفائی خوافی (م ۱۰ ۹۴۳ھ) نے فارسی میں منتقل کیا، اور اس کے بعد عبدالرحیم خانخاناں (م ۱۰۳۳ھ) نے۔ خانخاناں خود بھی ادیب اور شاعر تھا۔ منیر لاہوری کی "کارستان" حکایات و داستانوں کی عمدہ کتاب ہے۔

حزین لاہیجی کے کچھ منشآت دست یاب ہیں۔ سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۱۵۵ھ) بیدل کے شاگرد تھے۔ انہوں نے "مثمر" میں زبان و ادب کے بارے میں گرانقدر معلومات جمع کی ہیں۔ بیدل کے "رقعات" حکیمانہ بصیرت پر دلالت کرتے ہیں اور ان میں ایجاز اور حسن بیان دیکھا جاسکتا ہے اسی دوران وادیٔ جموں و کشمیر کی اساسی تاریخ "راج ترنگنی" کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوا۔ مترجم مولانا محمد شاہ، شاہ آبادی ہیں۔ "عیار دانش" مولفہ ابوالفضل علامی "کلیلہ و دمنہ" کے عربی اور فارسی نسخوں کی "تہذیب اور ترتیب نو" ہے۔ حکیم فتح اللہ شیرازی نے عہد اکبر میں فارسی انشا و ادب کا نیا نصاب ترتیب دیا تھا۔

امام ربانی، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی "عہد اکبری و جہانگیری کے بہت بڑے عالم اور مصلح تھے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں   اللہ نے جس کو کیا بروقت خبردار

آپ کے مصلحانہ خطوط "مکتوبات امام ربانی" کے نام سے معروف ہیں۔ اور علم و حکمت کی باتوں کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی سے پُر ہیں۔ برہمن لاہوری، ملا طغرائی مشہدی، ملا جبر نیوری اور زیب النساء بیگم بنت عالمگیر کے "منشآت" فارسی انشا کا عمدہ نمونہ مانے جاتے ہیں۔

۱۸۴۳ء تک فارسی برصغیر کی سرکاری زبان رہی۔ اس سال کے بعد بھی قدآور ادبا و علما نے اسی زبان کو اظہار بیان کا ذریعہ بنائے رکھا۔ میرزا غالب کے اردو خطوط کی اہمیت مسلم، مگر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے فارسی خطوط بھی، بیان کی مشکل کے باوجود، بے حد دلآویز ہیں۔ غالب کی "دستنبو" "مکتوبات علامی" کی مانند "فارسی سرہ" (خالص فارسی) کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ مکتوبات اور دستنبو میں عربی یا مقامی زبانوں کے الفاظ کا استعمال، بالذہنیت کم ہے۔ "دستنبو" میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات مندرج ہیں اور زبان و بیان بے حد شیریں اور دلآویز استعمال ہوئی ہے۔ یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے۔ "دستنبو" اس چیز کو کہتے ہیں، جس کے ہاتھ میں رکھنے سے ہاتھ خوشبودار ہو جاتا ہے۔

ظفر خان احسن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے دیوان کا جو طویل دیباچہ لکھا ہے۔ وہ انشا پردازی کا عمدہ نمونہ مانا جاتا ہے۔ شاہجہان کے ایک منشی، ملا یوسف کادر کشمیری، اچھے انشا پرداز تھے۔

دین و تصوف

تصوف کے ہمہ گیر رواج کی بنا پر اس عہد میں "دین و تصوف" کی کتابیں معرض نظر آئی ہیں۔ شطاریہ، نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، صابریہ اور کبرویہ سلسلے کے صوفیہ نے اپنے اپنے اسلوب طریقت کے بارے میں کافی لکھا ہے۔ عہد اکبری کے دین و تصوف کی حالت اور دین الٰہی کی بدعت کو طبقات اکبری مؤلفہ بخشی نظام الدین، تاریخ حقی مصنفہ شیخ عبدالحق محدث، زبدۃ التواریخ مؤلفہ شیخ نورالحق محدث اور اکبرنامہ نیز آئین اکبری مؤلفہ ابوالفضل میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ عہد اکبری کی بدعات کے زور کو حضرت احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) اور ان کے ہم خیال علماء نے توڑا ہے۔ حضرت مجدد کے احوال و مناقب زبدۃ المقامات اور حضرات القدس نامی فارسی کتابوں میں موجود ہیں۔

حضرت مجدد کے "مکتوبات" کا ذکر ہو چکا۔ ان کے تین دفتر ہیں اور مکتوبات کی تعداد ۵۰۰ سے متجاوز ہے۔ ان مکتوبات کے دفاتر کے نام درالمعرفت، نورالخلائق اور معرفت الحقائق ہیں۔ آپ نے رسالہ تہلیلیہ، کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے فضائل میں لکھا ہے۔ اس میں توحید صوفیہ اور وحدت شہود کے مبادی بھی درج ہیں۔ معارف لدنیہ، اثبات النبوت اور مبداء و معاد آپ کے دیگر رسائل ہیں جن میں طریقت و شریعت ہم پہلو نظر آتی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) حضرت مجدد کے معاصر تھے۔ آپ نے حرمین شریفین کا سفر کیا۔ اپنے عہد کے باکمالوں سے آپ نے مخلصانہ روابط برقرار رکھے۔ اور تصنیف و تالیف میں کمیت و کیفیت کے اعتبار سے بڑا مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی عربی تالیفات سے صرف نظر کرتے ہوئے، انکی فارسی تصانیف کی تعداد بھی خاصی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اشعۃ اللمعات کے نام سے مجموعہ حدیث مشکوٰۃ شریف کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ان کے فرزند نے خدمت حدیث کے والہانہ جذبے سے سرشار ہو کر صحیح بخاری کا فارسی ترجمہ پیش کیا تھا۔ "مدارج النبوۃ" اور "جذب القلوب فی دیار المحبوب" حضرت محدث دہلوی کی مشہور فارسی تالیفات میں پہلی کتاب سیرۃ النبی ہے۔ اور دوسری مدینہ منورہ کی تاریخ۔ آپ نے شیخ عبدالقادر گیلانیؒ غوث الاعظم کی فتوح الغیب کی شرح لکھی۔ اور غنیۃ الطالبین کا ترجمہ کیا۔ اخبار الاخیار، تذکرہ صوفیہ ہے۔ جس کی ابتدا میں تبرکاً حضرت غوث الاعظم کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ شیخ عبدالحقؒ کی فارسی نثر سہل اور شستہ ہے۔

عہد عالمگیری کا لازوال کارنامہ فتاوی عالمگیری ہے۔ فقہ کی اس اہم کتاب کو شیخ نظام کی سربراہی میں متعدد علماء نے مرتب کیا۔ بعض حنفیہ کے نزدیک یہ ہدایہ کے بعد دوسری اہم کتاب ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر اور حضرت مجدد کے صاحبزادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات بھی دین و تصوف کے اہم مطالب کے حامل ہیں۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) اورنگ زیب کے کئی جانشینوں کے ادوار کی

اہم ترین شخصیت تھے۔ وہ مشہور عالم اور صوفی، شاہ عبدالرحیم کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے متداول علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔ حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ اور ۲۹ سال کی عمر میں واپس آئے۔ آپ نے درس و ارشاد کے ساتھ ساتھ تصنیف کتب کا کام شروع کیا۔ احیائے ملت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں دردِ دل دیا تھا۔ قرآن مجید اور علوم اسلامی پر آپ کی گہری نظر تھی۔ آپ نے قرآن فہمی کی تسہیل کی خاطر قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ پہلا تجربہ تھا۔ جس کے بعد دوسروں نے بھی تراجم قرآن پیش کئے ہیں۔

آپ نے مؤطا حضرت امام مالکؒ کی فارسی میں "المصفیٰ" کے نام سے شرح لکھی ہے۔ "تفہیمات الٰہیہ" اور "انفاس العارفین" تصوف کے بارے میں ہیں۔ "الانتباہ فی سلاسل اولیا" فارسی میں سلاسل صوفیہ اور ان کے اوراد وظائف کے بارے میں آپ کی ایمان پرور کتاب ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے نامور بیٹوں، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی دین و تصوف کے سرمایۂ فارسی میں اضافہ کیا ہے۔

خواجہ حبیب اللہ حبی کی کتابیں "راحت القلوب" "تحفۃ القلوب" اور "مقامات حضرت ایشان" کا ذکر ہو چکا یہ تصوف کے موضوع پر ہیں۔ ابوالفقرا بابا نصیب الدین غازی (م ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء) کا نور نامہ حضرت شیخ نورالدین رشی کشمیری کی منظوم سوانح عمری ہے۔ خواجہ محمد پارسا کشمیری کا رسالہ "تحقیقات" ایک دینی کتاب ہے جس میں فرائضِ دینی کا بیان ہے۔ محسن فانی سے منسوب "دبستانِ مذاہب" میں ایشیائی مذاہب کا موازنہ اور تقابلی مطالعہ ملتا ہے۔ اس کتاب میں زرتشتیوں کے عقائد مندرج ہیں۔ اور ایک چوتھائی میں فرق ہندوان کے۔ ایک باب سکھوں (نانک پنتھیوں) کے بارے میں ہے۔ عیسائی مذہب، بدھ مت، یہودیت اور فرق مسلمانان کے بارے میں اجمالی بیان ملتا ہے۔ اورنگ زیب کے معاصر خواجہ معین الدین نقشبندی (م ۱۰۸۵ھ) نے "مرأۃ طیبہ" نامی عرفانی کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کی عبارت سلیس اور عالمانہ ہے۔ بابا داؤد مشکاۃ (م ۱۰۹۷ھ) "مشکاۃ شریف یعنی مصباح المصابیح کے حافظ ہونے کی بنا پر "مشکاتی" کہلاتے تھے۔ "اسرار الابرار" ان کی اہم عارفانہ تصنیف ہے جس میں ان کے پیر طریقت بابا نصیب الدین غازی کے احوال و مناقب درج ملتے ہیں۔ ملا احمد کی "خوارق السالکین" (مولفہ ۱۱۰۸ھ) کا دوسرا نام "تاریخ اوری" ہے اور بزرگان کشمیر کے حالات پر مشتمل ہے۔ ملا صفی الدین اردبیلی کئی سال کشمیر میں رہے۔ زیب النسا بنت عالمگیر ان کی سرپرست تھی۔ انہوں نے امام رازی کی تفسیر کبیر کا "زیب التفاسیر" کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

تاریخ و تذکرہ

تاریخ اور تذکرہ لکھنے کے اعتبار سے یہ دور بہت ممتاز ہے۔ ہم چند کتابوں اور مصنفوں کا ہی ذکر کر سکیں گے۔ اس ذکر سے اتنا ظاہر ہو جائے گا کہ برصغیر کے اس اہم دور پر تحقیق کرنے کی خاطر فارسی دانی کی کس قدر اہمیت ہے۔

ہمایوں نامہ: از گلبدن بیگم (م ۱۰۱۱ھ/ ۱۶۰۳ء) گلبدن، ہمایوں کی بہن تھی۔ یہ تاریخ اس نے اپنے بھتیجے اکبر شاہ کی فرمائش پر لکھی ہے۔ یہ شاہی خاندان کی دلچسپ تاریخ ہے۔ زبان آسان اور شستہ ہے۔

تاریخ رشیدی: مؤلفہ میرزا حیدر دوغلت (م ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۱ء) مصنف شاہنشاہ ہمایوں کا خالہ زاد بھائی تھا۔ اس نے کشمیر پر دو بار حملہ کیا۔ دوسری بار کامیاب ہوا اور کئی سال تک سیاہ و سفید کا مالک رہا۔ البتہ مقامی بادشاہوں کے سلسلے کو جوں کا توں رہنے دیا۔ تاریخ رشیدی کا حصہ اول مغلوں کی تاریخ ہے اور حصہ دوم برصغیر کے بارے میں مصنف کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ کتاب ابھی چھپی نہیں۔ مگر اس کا معتدبہ حصہ انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کی زبان آسان اور دلآویز ہے۔ ایک مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔

نفائس المآثر: مؤلفہ میر علاء الدولہ کامی قزوینی۔ کتاب ۹۷۳ھ/ ۱۵۶۵ء میں لکھی گئی۔ اس میں بابر تا اکبر (تا دم تحریر) کے عہد کے چشم دید واقعات درج کئے گئے ہیں۔ ابوالفضل علامی اور عبدالقادر بدایونی اپنی تواریخ میں اکثر اس کتاب سے استناد کرتے رہے ہیں۔

تاریخ ہمایوں: مؤرخ بایزید بیات ہے۔ اس تاریخ میں ہمایوں اور اکبر کے عہد کے جزوی حالات (۹۳۹/ ۹۹۹ھ) ملتے ہیں۔ کتاب آسان فارسی میں ہے اور ابھی مخطوطات کی صورت میں۔

ابوالفضل علامی کی تواریخ: ابوالفضل کی کتب کے نام اکبر نامہ اور آئین اکبری ہیں۔ یہ کئی بار چھپنے کے علاوہ اردو اور فارسی وغیرہ میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

اکبر نامہ کی جلد اول اکبر کی تخت نشینی تک تیموری خاندان کی تاریخ ہے۔ اس کی دوسری اور تیسری جلد میں اکبر کے عہد کے مفصل حالات ہیں۔ آئین اکبری دراصل اکبر نامہ کی چوتھی جلد ہے اور پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلی تین جلدیں اکبر کے عہد کے امراء، فضلاء، شعراء، افواج اور عمال عدلیہ نیز اکبر کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہیں۔ آخری دو جلدیں معاصر عہد کی علمی اور ادبی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ ان کتابوں کی زبان، ابوالفضل کی دیگر کتب کی مانند ادق ہے۔ مگر معانی و مطالب کے لحاظ سے یہ بے حد اہم ہیں۔

تاریخ اکبری: مؤلفہ محمد عارف قندھاری۔ اکبری عہد کی ۹۸۷ھ/ ۱۵۷۹ء تک تاریخ ہے۔

اکبر نامہ: مؤلفہ شیخ الہداد فیضی سرہندی۔ عہد اکبری کی ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۱ء تک تاریخ ہے۔

مآثر رحیمی: مؤلف خواجہ عبدالباقی نہاوندی (م ۱۰۴۲ھ/ ۱۶۳۲ء) ہے۔ کہنے کو تو یہ عبدالرحیم خان خاناں کی سوانح عمری ہے مگر اس میں برصغیر کی تاریخ کا بڑا حصہ سما گیا ہے۔ کتاب کی چار فصلیں اور ایک خاتمہ ہے۔ اس میں عبدالرحیم خانخاناں، بیرم خان اور دیگر عمائد ارکان کے حالات تک کے علاوہ عہد غزنویان سے زمان جہانگیر تک کی تاریخ ہے۔ اس کے علاوہ بنگال، جونپور، مالوہ، سندھ، گجرات، دکن، اور کشمیر کی تاریخ کی جزوی باتیں ملتی ہیں۔ کتاب کی زبان آسان ہے۔

منتخب تواریخ: یا تاریخ بدایونی - عبدالقادر قادری بدایونی (م ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء) اکبر کے عہد میں لکھی جانے والی اہم ترین تاریخوں میں سے ایک ہے۔ کتاب کی زبان سہل اور انداز بیان جرأت مندانہ ہے۔ سلطان محمود کے والد سبکتگین کے آغاز سلطنت (۳۶۷ھ/ ۹۹۸ء) سے لے کر اکبر کے چالیسویں جلوس (۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء) کی ناقدانہ تاریخ ہے۔ معاصر علماء و شعراء کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اکبر کی بدعات اور "دین الٰہی" کی گمراہی کے بارے میں مصنف نے بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔

تاریخ الفی: عہد اکبری کی مفصل ترین تاریخ ہے جو ابھی تک چھپی نہیں۔ یہ ابتدائے اسلام سے ۹۹۲ھ/ ۱۵۸۸ء تک کی تاریخ ہے جسے کئی اشخاص نے ترتیب دیا ہے۔ ان میں ملا احمد ٹھٹھوی اور ملا عبدالقادر بدایونی بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کی زبان آسان ہے۔ مخطوطے کافی موجود ہیں۔

طبقات اکبری: مؤلفہ خواجہ نظام الدین احمد (م ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۴ء) اس کتاب کو تاریخ نظامی اور طبقات اکبر شاہی بھی کہتے ہیں۔ اس کے نو طبقات ہیں اور آخر میں جغرافیائی معلومات لکھی گئی ہیں۔ یہ اہم کتاب آسان فارسی میں ہے۔ اور معاصر سلاطین و حکام کے حالات پر مشتمل ہے۔ نو طبقات میں بالترتیب دہلی، دکن، گجرات، بنگال، جونپور، کشمیر، سندھ اور ملتان کے عنوانات ہیں۔ کتاب مطبوعہ ہے۔

تاریخ حقی یا ذکر الملوک: شیخ عبدالحق حقی، محدث دہلوی کی تالیف ہے۔ معزالدین بن سام سے اکبر کے زمانے تک کی تاریخ ہے۔ معاصر حالات مفصل تر لکھے گئے ہیں۔

اخبار الاخیار فی اسرار الابرار: شیخ عبدالحق کی تالیف ہے۔ اولیاء اللہ اور صوفیہ کے سلاسل اور ان کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ فارسی میں طبع ہونے کے علاوہ اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اہم کتاب ہے۔

تاریخ سندھ: مؤلفہ سید محمد معصوم نامی (م ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶ء) چار حصے ہیں۔ سندھ میں اسلام کی آمد سے اکبری کی فتح سندھ تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ چند سال قبل شائع ہوئی ہے۔

توزک جہانگیری: مؤلفہ شاہنشاہ سلیم نورالدین جہانگیر۔ سادہ اور بے تکلف انداز میں لکھی گئی ہے لطائف و ظرائف، منظر کشی اور شعر و ادب کی باتیں خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہمارے ہاں متداول ہو چکا ہے۔

زبدۃ التواریخ: مصنف نورالحق المشرقی الدہلوی (م ۱۶۶۳ء) ہیں۔ تاریخ حقی کے انداز پر معزالدین بن سام سے جہانگیر کی تخت نشینی (۱۶۰۵ء) تک کے حالات مندرج ہیں۔

گلشن ابراہیمی یا تاریخ فرشتہ: میر قاسم ہندو شاہ فرشتہ استرآبادی کی عمومی تاریخ جو ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۱۰ء میں مکمل ہوئی۔ یہ تاریخ اپنی بعض خامیوں، تسامحوں کی اغلاط کے باوجود بڑی اہم ہے۔ متعدد بار چھپی۔ اردو میں

بھی منتقل ہو چکی ہے۔ اس میں مفصل مقدمہ، "اور خاتمے" کے علاوہ بارہ مقالے ہیں جن میں برصغیر کے مسلمان حکام کے ادوار کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ لاہور، دہلی، دکن، گجرات، مالوہ، بنگال، سندھ، مالابار، ملتان اور کشمیر وغیرہ ریاستوں کے حکام کے بارے میں اہم معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔

بہارستان شاہی: مؤلف نامعلوم ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ کسی کشمیری نے لکھی ہے۔ کتاب کشمیر کے اسلامی عہد (سلطان صدرالدین) سے شروع ہو کر عہد جہانگیر کے سال ۱۶۱۴ء پر ختم ہوتی ہے۔ اس کی عبارت مرصع اور رنگین ہے۔ ابھی چھپی نہیں۔

"تاریخ کشمیر" یا تاریخ حیدر ملک: حیدر ملک (م ۱۶۲۱ء) یوسف شاہ چک کا مصاحب تھا۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں وہ بنگال میں مامور رہا۔ شیر افگن کی موت کے بعد مہرالنساء (نور جہاں) کچھ دن اس کے گھر میں پناہ گزین رہی تھی۔ یہ کشمیر کی مفصل ترین فارسی تاریخ ہے۔ اور بظاہر ۱۶۱۸ء میں مکمل ہوئی ہے۔ اس میں آغاز سے اکبر کے عہد کی مکمل تاریخ کشمیر ہے۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہے۔

بادشاہ نامہ یا شاہجہان نامہ: مؤلفہ محمد امین قزوینی۔ عہد شاہجہان کے ابتدائی دس سالوں کی مفصل تاریخ ہے۔ اس کی فارسی نثر معتدل ہے۔ مشکل نہ آسان۔ سنجیدہ اور متین انداز تحریر ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں موجود ہے۔

بادشاہ نامہ (۳ جلد) از عبدالحمید لاہوری (م ۱۶۵۴ء) عہد شاہجہان کی مفصل ترین تاریخ ہے۔ پہلی دو جلدیں عبدالحمید نے لکھیں اور تیسری اس کے شاگرد محمد وارث (م ۱۶۸۰ء) نے۔ اس کتاب میں مشاہدات پر مبنی سیاسی معاشرتی اور ادبی حالات ملتے ہیں۔ کتاب کی زبان ادبی ہے۔

عمل صالح: مؤلفہ محمد صالح کنبوہ لاہوری (م غالباً ۱۶۷۵ء) عہد شاہجہان کی مفصل تاریخ ہے۔

صبح صادق: چار جلدوں میں ہے۔ مؤلف میرزا محمد صادق صادق (م ۱۶۵۱ء) ہے جو شاہجہان کا وقائع نویس اور بنگال کا ایک جاگیردار تھا۔ پہلی دو جلدوں میں شاہجہان کے عہد تک کی اسلامی تاریخ ہے۔ تیسری جلد علماء فضلاء کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اور چوتھی اسلامی ممالک کے جغرافیہ پر۔

ریشی نامہ: از نصیب کشمیری (م ۱۶۳۷ء) کشمیر کے عرفاء (ریشیوں) کا مفصل تذکرہ ہے۔

زبدۃ المقامات یا برکات الاحمدیۃ الباقیہ: از محمد ہاشم بدخشانی۔ یہ کتاب جو ۱۶۲۰ء میں مکمل ہوئی۔ حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی مجدد الف ثانی کا مفصل تذکرہ ہے۔ محکمۂ اوقاف پنجاب لاہور نے حال ہی میں اس کتاب کو اردو صورت میں شائع کروایا ہے۔

مجمع الاولیاء: از میر علی اکبر حسینی اردستانی۔ یہ پندرہ سو عرفاء صوفیہ کا تذکرہ ہے جو ۱۶۴۳ء میں مکمل ہوا۔ اس کا بظاہر ایک ہی مخطوطہ ہے جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ اس تذکرہ میں مختلف سلسلوں کے

تصوف کا جداگانہ ذکر ملتا ہے۔

حضرات القدس، از شیخ بدرالدین سرہندی۔ آپ حضرت مجدد الف ثانی کے شاگرد تھے۔ یہ کتاب جو ۱۰۴۳ھ میں مکمل ہوئی نقشبندی سلسلے کے صوفیہ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ چھپ چکا ہے۔ اس سے قبل ۱۰۳۵ھ میں مؤلف نے مجمع الاولیاء نامی ایک تذکرہ مکمل کیا جس میں ۱۵۰۰ عرفا کا ذکر موجود ہے۔

مرآۃ الواصلین، مؤلفہ میر محمد فاضل اکبرآبادی (م ۱۰۹۳ھ)، عہد عالمگیری کا تذکرہ عرفا ہے۔ اس میں شروع سے ۱۰۹۲ھ تک معروف عرفا کے حالات مندرج ہیں۔ اس کے طبع ہوجانے کا علم نہیں۔ مخطوطات بکثرت موجود ہیں۔

ذخیرۃ الخوانین، مؤلفہ شیخ فرید بھکری۔ اس میں اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے عہد (تا سال ۱۰۷۰ھ) کے چند ممتاز امرا کا ذکر ملتا ہے۔ تذکرہ تین جلدوں میں ہے۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے دو جلدیں شائع کرا دی ہیں اور تیسری جلد زیر طبع ہے۔

عرفات العاشقین و عرصات العاشقین، مؤلفہ تقی اوحدی۔ ۳ ہزار عرفا کا یہ تذکرہ ۱۰۲۴ھ میں مکمل ہوا۔ مؤلف اس وقت آگرہ میں قیام پذیر تھا۔ تذکرہ حروف تہجی کی ترتیب سے لکھا گیا ہے۔ اس کے متعدد مخطوطے موجود ہیں۔ کتب خانہ ملی ملک تہران میں ایک نفیس مخطوطہ موجود ہے۔

مجمع النفائس، از سراج الدین علی خان آرزو اکبرآبادی (م ۱۷۵۵ء) شعرا کا قابل قدر تذکرہ ہے جو ابھی مخطوطات کی صورت میں موجود ہے۔ آرزو نے شعراء کا مختصر ذکر کیا اور نمونۂ کلام پیش کیا ہے۔

مآثر الامراء، صمصام الدولہ کی مشہور تالیف ہے جس کا اردو ترجمہ (مترجم محمد ایوب قادری) حال ہی میں لاہور سے شائع ہوا ہے

تذکرۃ الواقعات، از جوہر آفتابچی۔ عہد عالمگیر میں لکھا گیا۔ اس کا اردو ترجمہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۵۱ء میں چھپ گیا تھا۔ اور متداول ہے۔

منتخب اللباب، مؤلفہ خوافی خان، مصنف عالمگیر کا معاصر تھا۔ عہد عالمگیر کی عمدہ کتابوں میں سے ہے۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کے ہاں اس کا انگریزی ترجمہ زیر اشاعت ہے۔

فرحت الناظرین، از محمد اسلم پسروری (پسروری) کی کتاب ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۱ء میں لکھی گئی۔ یہ عہد مغلیہ کی عام تاریخ ہے۔ انداز نگارش پر تکلف ہے۔ جناب محمد ایوب قادری نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو ۱۹۷۲ء میں کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

واقعات کشمیر یا تاریخ اعظمی، مؤلفہ محمد اعظم دیدہ مری ہیں۔ کتاب ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں مکمل ہوئی۔ کتاب مختصر ہے مگر سال تصنیف تک کشمیر کے اہم واقعات کی حامل ہے۔ کتاب اب تک دوبار چھپ چکی ہے۔

سیر المتاخرین، مؤلفہ سید غلام حسین طباطبائی، اورنگ زیب کی وفات سے ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء تک کے

واقعات تاریخ پر مشتمل ہے۔ سال تصنیف ۱۷۸۳ء ہے۔

تذکرہ ہمیشہ بہار: کشن چند اخلاص کا تذکرہ شعرا ہے (مؤلفہ ۱۷۲۳ء)

تذکرۃ الشعرائے کشمیر: از اصلح مرزا۔ سال تصنیف تقریباً ۱۷۴۳ء ہے۔ پیر سید حسام الدین راشدی نے اسے مع چار جلد تکملہ کے اقبال اکادمی پاکستان، کراچی کی طرف سے شائع کروایا ہے۔

تذکرہ حسینی: میر حسین دوست سنبھلی کا تذکرہ ہے جو ۱۷۶۹ء میں لکھا گیا ہے اور چھپ چکا۔

تذکرہ مردم دیدہ: خواجہ عبدالحکیم حاکم لاہوری کا مشہور تذکرہ ہے۔ ۱۷۶۱ء میں لکھا گیا اور طبع ہو چکا ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرے: خزانۂ عامرہ، سرو آزاد اور ید بیضا معروف تذکرے ہیں اور چھپ چکے۔

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (م ۱۸۰۸ء) کے تذکرے: یہ شام غریباں اور گل رعنا نام کے تذکرے ہیں۔ دونوں مطبوعہ ہیں۔

علی ابراہیم خان خلیل کے تذکرے: ان کے لکھے ہوئے تذکروں کے نام خلاصۃ الکلام، گلزار ابراہیم اور صحف ابراہیم ہیں۔ ان کے متعدد مخطوطات موجود ہیں۔

تذکرۂ خوطات یا تذکرہ ریاض حسنی: مؤلف خواجہ عنایت اللہ فتوت (م ۱۷۵۵ء) ہیں۔

طبقات شاہجہانی: مؤلفہ محمد صادق کشمیری۔ کتاب ۱۰۴۶ھ/ ۱۶۳۶ء میں لکھی گئی۔ کتاب کے دس طبقات ہیں۔ آل تیمور کی تا عہد شاہجہان اہم تاریخ ہے۔ مگر ابھی چھپی نہیں۔

منتخب التواریخ: مؤلفہ پنڈت نرائن کول عاجز۔ انداز تحریر پر تکلف ہے۔ سال تصنیف ۱۱۲۲ھ/ ۱۷۱۰ء ہے۔ کشمیر اور برصغیر کے بعض واقعات کی عام تاریخ ہے۔

گوہر عالم: مؤلفہ محمد اسلم منعمی۔ منشی محمد اعظم دیدہ مری کے فرزند تھے۔ گوہر عالم میں انہوں نے اپنے باپ کی تالیفات "واقعات کشمیر" کے مقابلے میں کشمیر کی زیادہ مفصل تاریخ لکھی ہے۔ اس میں انہوں نے ابتدا سے اپنے عہد تک کے حالات لکھے ہیں۔

مہر نیمروز: مؤلفہ اسد اللہ خان غالب۔ بہادر شاہ ظفر کے حکم سے غالب نے خاندانِ مغلیہ کی تاریخ لکھی ہے۔ ۱۹۶۹ء میں پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل کر کے کراچی سے شائع کروا دیا ہے۔

ادب اور انشاء

یوسف بن محمد ہروی کے رسائل: مصنف شاہنشاہ بابر اور ہمایوں کا ذاتی طبیب تھا۔ ریاض الانشاء مؤلفہ ۹۳۶ھ/ ۱۵۲۹ء بظاہر کتاب انشاء معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس میں ادویات کا استعمال درج ملتا ہے۔

بدائع الانشاء مؤلفہ ۱۵۲۲ء، اسی مصنف کا فن انشاء پر رسالہ ہے۔

انشائے فارسی : فیضی فیاضی اکبر آبادی کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ فیضی کی فارسی نثر سادہ اور دلچسپ ہے۔

سہ نثر ظہوری : ملک الشعرا ظہورالدین محمد ظہوری کے تین دیباچے اسے نثر ہیں۔ ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ عبارت مشکل اور مسجع ہے۔ سہ نثر ظہوری کے اقتباسات ہمارے کئی امتحانات میں شامل نصاب ہیں۔

ابوالفضل علامی کی کتب : انشائے ابوالفضل، تین دفتروں میں خطوط کا مجموعہ ہے۔ عبارت مسجع اور رنگین ہے۔ خطوط کیا ہیں! علم و ادب اور مختلف مباحث پر مقالے ہیں۔ کشکول، ابوالفضل کا مرتب کردہ، نثر و نظم کا انتخاب ہے۔ سنسکرت کی کتاب "پنچ تنترا" کے فارسی اور عربی تراجم "کلیلہ و دمنہ" کے نام سے موجود ہیں۔ مولانا حسین واعظ کاشفی نے اسی کی مدد سے "انوار سہیلی" ترتیب دی تھی۔ ابوالفضل نے اسے "عیار دانش" کے نام سے از سر نو ترتیب دیا ہے۔

مکتوبات امام ربانی : حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے ایمان افروز اور استعجابی ملاّ دیز خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے تین حصے ہیں اور متعدد بار چھپ چکے ہیں۔ یہ خطوط معاصر امراء و علماء وغیرہم کے نام لکھے گئے اور ان کی ایک ایک سطر سے مصنف کا حسنِ ایمان مترشح ہے۔ زبان اور انداز بیان کے اعتبار سے بھی یہ مکتوبات فارسی ادب کا سدا بہار سرمایہ ہیں۔ یہ خطوط اکبر اور جہانگیر کے عہد میں لکھے گئے ہیں۔

رسائل ملا طغرا : ملا طغرا مشہدی، عہد شاہجہان کے مشہور شاعر اور انشا پرداز تھے۔ حکام کشمیر، ظفر خاں احسن اور شاہزادہ مراد بخش کے مصاحب رہے ہیں۔ ان کے رسائل مرصع اور دلآویز اسلوب میں لکھے گئے اور کلاسیکی فارسی ادب کا بے بدل سرمایہ ہیں۔

انشائے منشی : عہد عالمگیر کے کشمیری انشا پرداز، محمد رفیع منشی کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے۔

رقعات عالمگیری : شاہنشاہ محمد اورنگ زیب عالمگیر کے دلآویز خطوط کا مجموعہ ہے۔ ان خطوط میں ادبی چاشنی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ، عالمگیر کی حق پرست سیرت اور پر کار زندگی جلوہ گر ہے۔

رقعات گیلانی : اکبر کے معاصر حکیم ابوالفتح گیلانی کے رقعات ہیں جو حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔

رقعات میرزا کمال : میر کمال الدین اندرابی رسوا، معاصر اورنگ زیب کے خطوط ہیں۔ ان خطوط کو مؤلف کے ایک ہند و شاگرد لچھیرام نے مرتب کیا ہے۔ یہ خطوط ابھی مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں۔

دستنبو : مرزا غالب کی کتاب ہے۔ اس میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ادبی لحاظ سے اہم ہے۔ غالب نے خالص فارسی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ انداز بیان رنگین اور والہانہ ہے۔ میرزا کے فارسی خطوط، ان کے فارسی کلیات کا دیباچہ اور چند دیگر تحریریں، فارسی ادب کا قابل قدر سرمایہ ہیں۔

لغت و فرہنگ

اس عہد میں فارسی کے جو لغت لکھے گئے۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

جامع اللغات علامی : ابوالفضل نے اس لغت کو بچپن میں مرتب کیا تھا۔

اور چنداں اہم نہیں ہے۔

جواہر الافاضل: مصنف شیخ اللہ داد فیضی سرہندی ہے۔ اس ضخیم جلد میں ترکی، عربی اور فارسی کے اہم الفاظ یکجا ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد باقر نے اس کی چند جلدیں شائع کرا دی ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ پورا لغت بڑی تقطیع کے کوئی ۲۰ ہزار صفحات پر مشتمل ہو گا۔ مؤلف اکبر کا ہمعصر تھا۔

فرہنگ جہانگیری: عہد جہانگیر میں اسے میر جمال الدین حسین شیرازی معروف بہ "میر عضد الدولہ" نے ۱۰۱۷ھ میں مکمل کیا۔ مؤلف نے اس لغت کو ۱۲ برس میں مکمل کیا۔ اس ضخیم لغت میں مؤلف، الفاظ کے معنی کے شواہد شعر کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ مقدمے میں لکھتا ہے کہ اس لغت کی تیاری میں اس نے ۴۴ کتب لغت سے استفادہ کیا ہے۔ جہانگیر "تزک" میں اس لغت کی تعریف کرتا ہے۔ یہ لغت ابھی جزوا چھپی ہے۔

فرہنگ رشیدی: یہ لغت تہران میں چھپ گیا ہے۔ مؤلف عبدالرشید مرنی ٹھٹھوی ہیں اور سال تالیف ۱۰۶۴ھ، یہ قابل اعتماد لغت ہے۔ مؤلف نے فرہنگ جہانگیری اور کئی دیگر فرہنگ پیش نظر رکھتے ہیں۔

بہار عجم: ٹیک چند بہار (م ۱۷۶۶ء) کا مشہور لغت ہے۔ جو چھپ چکا۔ علامہ آزادؒ اس لغت کی اہمیت کے بے حد قائل تھے۔ اور الفاظ کی بحثوں میں اکثر اس کے حوالے دیتے رہے ہیں۔

غیاث اللغات: مؤلف محمد غیاث الدین رامپوری ہیں۔ سال تالیف ۱۲۴۲ھ ہے۔ اس لغت کی تدوین میں مؤلف کے ۱۴ سال لگے۔ ترکی، عربی اور فارسی کے کثیر الفاظ کا ذخیرہ ہے۔ اس لغت میں علوم و فنون کی خاص اصطلاحات بھی مندرج ہیں۔ ہندوایران میں چھپ چکا ہے۔

خان آرزو اکبر آبادی کے لغت اور فرہنگی تحقیق: سراج الدین علی خان آرزو کی "مثمر" قواعد زبان اور لسانیات کی کتاب ہے۔ سراج اللغات اور چراغ ہدایت لغت کی کتابیں ہیں۔ داد سخن ان کی تنقید شاعری کی کتاب ہے۔ عطیہ کبریٰ اور موہبت عظمیٰ علم بیان اور معانی کے بارے میں ہیں۔

قاطع برہان از میرزا غالب: محمد حسین برہان تبریزی کے مشہور لغت "برہان قاطع" (مؤلفہ ۱۰۶۲ھ) کے جواب میں ناقدانہ لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی تالیف اور دیگر واقعات کو حالی کی "یادگار غالب" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ "برہان قاطع" مطبوعہ تہران کے مرتب، پروفیسر ڈاکٹر محمد معین مرحوم نے غالب کے کئی اعتراضات کو قابل قبول مانا ہے۔

مغلیہ دور کے بعد اب تک

انیسویں صدی عیسوی میں خاندان مغلیہ اور فارسی زبان و ادب کا زوال انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کلکتے کا فورٹ ولیم کالج اردو کی ترویج کے لئے کام کرنے لگا۔ اور فارسی کی سرکاری سرپرستی مسلمان حکام وامراء نے

بھی تقریباً ترک کر دی۔ ۱۸۳۱ء میں حضرت سید احمد شہید بریلوی، حضرت سید اسمٰعیل شہید دہلوی اور ان کے رفقاء نے سکھوں (اور حقیقتاً انگریزوں) کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر شہادت پائی اور مسلمانوں کی قوت کو غیر معمولی دھچکا لگا۔ اس واقعہ کے تین سال بعد ۱۸۳۴ء میں فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کر دی گئی اور مراسلت اور تعلیم کا ذریعہ انگریزی قرار دی گئی۔ یاس اور مصائب کے دور میں مسلمان اس فیصلے کے خلاف کوئی مؤثر آواز نہ اٹھا سکے۔ خاندان مغلیہ کا آخری تاجدار ابوالمظفر سراج الدین ظفر اپنے کئی پیشروؤں کے مقابلے میں زیادہ بیدار مغز اور جری تھا۔ مگر اپنے ۲۰ سالہ دورِ حکومت (۱۸۳۷ء-۱۸۵۷ء) میں اسے کئی جھمیلوں سے سابقہ پڑا۔ مئی ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے نتیجہ میں مقامی حکمرانوں اور مغل شاہنشاہوں کا اقتدار ختم ہو گیا۔ آخری مغل تاجدار کی زندگی کے آخری ایام جلاوطنی کے عالم میں رنگون میں بسر ہوئے اور وہیں ۱۸۶۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ بعد کے سالوں کے اہم واقعات میں سرسید احمد خاں کی کوششوں سے علی گڑھ کالج کا قیام (۱۸۷۵ء) ہندو مسلمانوں کی مشترک جماعت "کانگرس" کی تاسیس (۱۸۸۵ء) مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت کی تشکیل (۱۹۰۶ء) تصورِ پاکستان اور قیامِ پاکستان (۱۹۴۷ء) ہے۔ فارسی ادب کے اس دورِ انحطاط میں بڑے شعراء، ادباء اور دیگر مصنفین کی تخلیقات و تالیفات کی مختصر کیفیت درج ذیل ہے۔

فارسی شاعری

اس دوران میں کئی اردو شعراء نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ فارسی شاعری کے نمایاں نام مندرجہ ذیل ہیں

عبید جہانگیر نگری (م ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۴ء)

مولانا عبید اللہ عبیدی سہروردی بنگال کے ضلع دیناپور کے ایک قصبے کے رہنے والے تھے۔ کلکتہ میں تعلیم پائی اور ڈھاکہ کے مدارس میں پڑھاتے رہے۔ آپ کا مدفن بھی ڈھاکہ ہے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ فارسی گوئی میں بھی آپ ممتاز رہے۔ ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

عمر بپایان رسید نقد خوبان ہنوز — دل ز جہان سرد شد سوزش پنہان ہنوز
قوت عہد شباب رفت و شدم بلکہ پیر — لیک نرفت از دلم عشق جانان ہنوز
خشک و ترم ہر چہ بود رفت بیاد او ہا — خشک لب و چشم تر در غم جانان ہنوز
برد پریشانی از گیسوی او شانہ دگر — در غم ہر پیچ او حالت پریشان ہنوز
گو طبیعت تر اگرچہ بہ پیری است خشک — لیک دعوای عبید نوری غلطان ہنوز

آزاد جہانگیر نگری (م ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۷ء)

نواب سید محمد آزاد کا مسکن بنگال ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ مختصر دیوان چھپ چکا۔ ناقدین فن کی رائے ہے کہ آزاد کا کلام منتخب اور دلآویز ہے۔ جتنا کلام ہم نے دیکھا اس

کی بنا پر ہم اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ آپ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

دل آسودہ ز ہر عشق نشانی دارد — ہر کجا خاطرِ جمعی است جہانی دارد
ہر زمان کاری و ہر کار زمانی دارد — حیف پیری کہ سرِ دعویٔ جوانی دارد
جان بری نتوان قدر انداز محال است محال — کز ابرو و مژہ تیر و کمانی دارد
یارب اندر چمن و ہر گل خاطر گیست — کز سموم غم ایام امانی دارد
چون نہ نازیم بہم عرفی و حافظ، آزاد — بلکہ مانیز زبانی و بیانی دارد

شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء)

شمس العلماء محمد شبلی، امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت اور مذہب حنفی سے غیر معمولی تعلقِ خاطر کی بنا پر "نعمانی" کہلاتے ہیں۔ موضع بندول، اعظم گڑھ (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ اردو ادب کے عناصر خمسہ میں شامل اور شگفتہ ترین اردو نثر لکھنے والے ہیں۔ سوانح عمری، تاریخ، علم کلام، سیرۃ النبی، فارسی شاعری کی تاریخ، اردو مراثی اور کئی دیگر موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اور ہر میدان کے مردِ خاص رہے۔ آپ کی اردو شاعری بیشتر سیاسی ہے۔ فارسی شاعری آپ کو عمدہ غزل گوؤں کی صف میں جگہ دیتی ہے۔ شبلی کے بارے میں بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سید سلیمان ندوی مرحوم کی حیاتِ شبلی اور ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم کی شبلی نامہ (نقشِ ثانی یادگارِ شبلی) شبلی نے فارسی شاعری میں چار مختصر مجموعے یادگار چھوڑے ہیں۔ دیوان شبلی، دستہ گل، بوئے گل اور برگِ گل۔ اب یہ مجموعے "کلیات شبلی" (فارسی) میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ کلیات میں سرسے نامہ، غزلیں، قصیدے، مرثیے، ترکیب اور مختصر مثنویاں وغیرہ شامل ہیں۔

شبلی نے عاشقانہ اور دلآویز غزلیں قیامِ بمبئی کے دوران لکھی ہیں۔ ان غزلوں کی زبان سادہ اور بیان میں سوز ہے۔ بمبئی کے دوران پر رونق ماحول کے بارے میں آپ نے مہدی حسن الافادی کو لکھا تھا۔ "یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا"۔ شبلی یہاں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ بہنوں نازلی بیگم، زہرہ بیگم اور عطیہ بیگم کے ہم نشین تھے۔ ان خواتین کے والد نواب حسن آفندی شبلی کے قدردان تھے۔ شبلی سفرِ قسطنطنیہ میں ان سے ملے تھے۔ یہاں کے ماحول کے بارے میں شاعر کہتا ہے:

ہر سو از ہجوم دلبران شوخ دلی پروا — گوشتی از سرپرشکل افتادست رہ ہر درا
ہشت چل سالہ کہ بیہودہ نگہ داشتمت — تا ز بر سنگ زنم شیشۂ تقوی چہ کنم!
حافظ زہد چو بر تافت من راست نبود — شیشۂ تقویٰ سی سال بہ سندان زدہ ام

علامہ شبلی کی ایک کیف آور غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

۱ — امسی نامۂ خلوتیان مجاز را — دیدی تطاول خمِ زلفِ دراز را!

هرگز کسی به خوبی و رعنائی تو نیست — ما دیده‌ایم، گنجِ نهان طراز را
بیچاره نکته‌دان لطائف عشق نیست — فاش مکن به غیرِ نگه های راز را
هر چند جور نیز ز معشوق خوش بود — ما بنده‌ایم دلبرِ عاشق نواز را
آوردیم که کار ز اندازه در گذشت — دستِ دراز گشته و آغوشِ باز را

مظفر خان اعظم (م ۱۹۱۳ء) علاقہ چترال کے ممتاز فارسی گو شاعر تھے۔ والد کا نام وزیرزادہ مظفر خان تھا۔ آپ حکمرانِ چترال اور حکمران خاندان کے دیگر افراد کے اتالیق تھے۔ فارسی ادب و شعر سے بڑا شغف رکھتے تھے۔ ان کا دیوان شعر دستیاب ہے۔ ان کے کلام میں دلآویزی اور نکہت جلوہ گر ہے۔ سبک ہندی کے اثر سے خالی ہیں۔ ایک غزل کا انتخاب درج ذیل ہے:

هیهات چو مجنون رہ صحرا نگرفتم — مقصودِ دلِ خویش زلیخا نگرفتم
مانند درختی که بود بر سرِ کهسار — شوقِ چمن و منتِ دریا نگرفتم
روزی که شدم معتکف گوشۂ هستی — غیر از غم تو در دلِ شیدا نگرفتم

ویری کشمیری (م ۱۹۰۰ء) پنڈت راجا کول عرض بیگی ویریؔ، سرینگر کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے رسمی تعلیم کم ہی پائی تھی، مگر ماحول اور خاندانی اثرات کے تحت فارسی اچھی جانتے تھے۔ وہ تحصیلدار تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں وہ اپنے والد پنڈت رام چند کول کی مانند "عرض بیگی" اور وقائع نگار رہے۔ ان کا دیوان ہندوستان میں طبع ہو چکا۔ اس میں قصائد، غزلیات اور تاریخی قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے قصائد میں مبالغہ کی شان اجاگر ہے۔ یہاں ہم ان کے قصیدہ کشمیر کے چند شعر درج کرتے ہیں۔ یہ قصیدہ ظفر خاں احسن کے قصیدہ کی تقلید میں لکھا گیا ہے:—

جهان شگفته ز رنگِ بهار کشمیر است — نگارخانهٔ چین، لاله زار کشمیر است
سحر به باغ نشاطم، نسیم صبح آورد — که آبروی جهان، شالیمار کشمیر است
شنیدم از لب فواره، بارها دریاب — که آب ریز بهشت، آبشار کشمیر است
چرا به درگهِ کس سر فرو کند ویریؔ — غلامِ بارگهِ شهریار کشمیر است

میرزا اسعد الدین سعدؔ (م ۱۹۰۲ء) سعدؔ، اردو اور فارسی کے شاعر، سرینگر کشمیر کے طبقۂ علما میں سے تھے۔ شبلی نعمانی کے گہرے دوست تھے۔ شبلی سیاحتِ کشمیر کے دوران ان ہی کے ہاں مہمان رہے۔ شبلی کے "قصیدہ کشمیریہ" کے جواب میں آپ نے ایک قصیدہ لکھا۔ اور اس میں شبلی کی علالت اور کشمیر سے جلد چلے جانے کے اشارے بھی کئے ہیں۔—

امسال چو درین گلکدہ گل رخت بر بست / گر از گل بودش، شکوہ ز آب و ہواست
چارہ گر بیش دوا دیدہ تجربہ می گفت / کاین دل بیمار بود، جلد حبیب دواست
درد تنہائی و رنج سفر و فکر علاج / بہ اداہی کہ ادا کردہ، جگر سوز اداست

سعد کے مندرجہ ذیل اشعار، مسائل کشمیری مسلمانوں کا گویا "شہر آشوب" ہیں۔

خوان میر رعیت نہ حیثیت در مسلمانان / کہ در کشمیر بودہ پیش در عہد مسلمانی
گہی بر غسل نماز متفق کاین بہتر از مسجد / بازار است تعطیلش بما واجب نگہبانی
گہی از نان مسجد را چو میراث پدر دانیم / برای ہضم آن صد حجت آریم ز کتاب والی
شکایت کردہ ام در نوحۂ اول ز میر و پیر / خدا شاہد ز حب قوم، نہ ز اغراض نفسانی۔

غلام قادر گرامی جالندھری (م ۱۹۲۷ء)

مولانا گرامی گگے زئی خاندان سے تھے۔ خلیفہ محمد ابراہیم معروف بہ ملک الشعراء کے شاگرد تھے۔ بعد میں لاہور کے اورینٹل کالج میں پڑھتے رہے۔ جوانی میں حیدرآباد دکن گئے۔ اور نظام دکن میر محبوب علی کی طرف سے شاعر خاص مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ ہوشیارپور میں مقیم رہے۔ اور نظام دکن سے وظیفہ پاتے رہے۔ میر عثمان علی خان نے انہیں پھر دکن طلب کیا مگر وہ نہ جاسکے۔ آخری عمر میں بیمار رہنے لگے تھے۔ اور اسی حالت میں ۱۹۲۷ء میں انتقال فرمایا۔

گرامی بلا کے زود گو شاعر تھے۔ فارسی اساتذہ کا کافی کلام ازبر تھا۔ ان کی غزلیات قصائد اور رباعیات کے مختصر مجموعے چھپ چکے۔ سارا کلام ہموار اور دلآویز ہے۔ علامہ اقبال سے گرامی کی بے تکلف دوستی تھی۔ "مکاتیب اقبال بنام گرامی" جو ۱۹۶۹ء میں جناب محمد عبداللہ قریشی کے تعلیقات کے ساتھ شائع ہوئے، فارسی کے ان دونوں شاعروں کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ گرامی لاہور میں طویل قیام فرماتے اور اقبال کے مہمان رہتے۔ گرامی تغزل محض کے دلدادہ تھے۔ مگر کہیں کہیں انہوں نے فکر و پیغام کا حامل ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے اقبال کی توصیف میں گرامی نے متعدد اشعار کہے اور ان کے بعض اشعار پر تضمینیں لکھی ہیں مثلاً:

درس ما مغنی از کتاب حال گیر / ساغر از خمخانۂ اقبال گیر
حضرت اقبال، آن بالغ نظر / دارد از یورپ و نیمہ ملل خبر
از نوائش بزم یورپ در خروش / حکمت امریکا اور ا سفتہ گوش
در دیدۂ معنی نگہبان حضرت اقبال / پیغمبری کرد و پیمبر نتوان گفت
جام جم گیر کہ در میکدہ خوش گفت اقبال / "دست بادہ با مذاقہ جام است اینجا"
جلوہ افروز گرامی ست نہ مالک پنجاب / "آفتابیست ولی بر لب بام است اینجا"

گرامی کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ یہ فنکاری گرامی کی کئی غزلوں میں موجود ہے۔

نشان در بی نشان گم شد مکان در لامکان گم شد قیامت سر بکار در آن باین و این بآن گم شد

نہانش را عیان گفتم عیانش را نہان گفتم عیان اندر نہان گم شد نہان اندر عیان گم شد

برآن بودم کہ از سر دہانش نکتہ بر خوانم سخن تا بر زبان آمد زبان اندر دہان گم شد

بصحرای محبت گم شدن باری عجب نبود درین رہ ای حریفان کاروان در کاروان گم شد

گرامی از نگاہی دل ز دستم برد آن کافر دل و دین آشنا آخر بچشم نکتہ دان گم شد

عزیز لکھنوی (م ۱۹۱۵ء) خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی، کشمیری الاصل تھے۔ اردو و فارسی دونوں زبان کے شاعر تھے۔ صاحب دل اور قرآن مجید کے مطالعہ و تفکر پر مداومت کرنے والے تھے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں:

گل از ظہوری و ز نظیری رسد عزیز فیضی کہ از کلام الٰہی بما رسید

عزیز کے قصائد قاآنی شیرازی کے قصائد کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ وہی فطرت ودستی اور منظر کشی کار فرما ہے

ایک بند ملاحظہ ہو۔

سحرگہان بیاد حق زطائران فرق فرق غزل سرایان نسق کہ کودکان ہم سبق

شقیق شگفتہ دشت چنانکہ در دانق شفق شگفتہ گل ورق ورق بہ سی ابر در عرق

بہر ورق طبق طبق گہر کند نثار ہا

علامہ اقبال کو آپ کا کلام پسند تھا (انوار اقبال ص ۵ تا ۷) آپ کے کلیات میں جو طبع ہو چکا۔ قصائد، غزلیات اور مثنویاں موجود ہیں۔ ان مثنویوں میں تاریخ کشمیر کے کئی واقعات بھی منظوم ملتے ہیں۔ سرینگر کی خانقاہ معلی (جامع مسجد) کی توصیف میں آپ کے چند اشعار کا نمونہ درج ذیل ہے:۔

اگر در مسجد جامع درآئی بادنیٰ پایہ طاقی برائی

عیان شانِ حق از کاشانۂ او چو صاحب خانہ الحق خانۂ او

ستونہا کاندرو برپایہ بینی حریف سدرہ و طوبیٰ بر جبینی

شمارش سر صد و شصتین ز ہفتاد بہ باغ دین بجای سرو و شمشاد

معلّی خانقاہی ہمسر اوست کہ خلقی جبہہ فرسای در اوست

ز بس انبوہ مردم بہ بیخ نوبت نباشد راہ وردی را بی صعوبت

خود این تعمیر آئینہ ما راست کہ از سلطان اسکندر یادگار است

زہر سنگ عیان عیش گری ہست   زنگ بہ آئینۂ اسکندری ہست

حضرت مہر گولڑوی (۱۹۳۷ء)

حضرت سید مہر علی شاہ گولڑہ (راولپنڈی) کے مقیم اپنے وقت کے بہت بڑے پیرو مرشد اور عالم دین تھے۔ آپ نے متداول علوم اپنے والد محترم سید نذیر الدین شاہ سے حاصل کئے۔ راہ طریقت میں آپ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی کے مرید تھے۔ آپ حرمین شریفین بھی تشریف لے گئے تھے۔ آپ کی دینی خدمات اور روحانی فیض خاص و عام میں مشہور ہے۔

حضرت مہر علی شاہ کبھی کبھار پنجابی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ آپ کے پنجابی اشعار اور خصوصاً ایک نعت بے حد معروف ہیں۔ ایک فارسی غزل کا نمونہ تبرک کے طور پر ملاحظہ ہو۔

صبا ز طرہ شبرنگ مہوش طناز   گشود نافۂ مشکین بروئے اہل نیاز

ازین ساقی چشمش کہ جرعہ بخشد باز   زجام چہرہ ترکان مہوشان غماز

سواد ہر مستان راز ازل سرشتہ است   نقاب زن زدا خط خود بین کنایت محرم راز

اگرچہ حسن تو از مہر غیر مستغنی است   من آن نیم کہ ز ایمان خویش آیم باز

علامہ اقبال (م ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء)

اقبال کو شروع میں لوگ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کہتے ہیں اور اس کے بعد آپ شاعر مشرق، علامہ، ترجمان حقیقت، شاعر فلسفی، دانائے راز، حکیم الامت اور مصور پاکستان وغیرہ القاب سے ملقب ہوئے۔ آپ کشمیری الاصل تھے۔ وطن سیالکوٹ ہے مگر چونکہ زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں بسر کیا۔ اس لئے ایرانی انہیں "لاہوری" کہتے ہیں۔ اقبال کی تاریخ ولادت مختلف فیہ ہے۔ کئی سال تک مصنفین کا ۲۲ فروری پر اصرار رہا۔ اب بزم اقبال لاہور والے ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء بتاتے ہیں اقبال اکادمی کراچی کے ارباب کو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء پر اصرار ہے دیکھیں آپ کی تاریخ ولادت پر قوم کو کب اتفاق ہوگا!

اقبال نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ علوم اسلامی و السنہ شرقیہ کے لئے انہیں حضرت مولانا سید میر حسن جیسا بے بدل فاضل استاد میسر آیا تھا۔ بی اے اور ایم اے کے درجے انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھ کر حاصل کئے۔ عربی اور فلسفہ ان کے خاص مضامین تھے۔ مگر فارسی تھوڑی کی خاطر بھی انہوں نے بے حد محنت کی ہے (اقبال نامہ ج ۱)۔ اقبال نے ۱۹۰۵ء تک اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کی۔ اس دوران آپ نے "علم الاقتصاد" کے عنوان سے اردو میں ایک کتاب لکھی اور چھپوائی (۱۹۰۳ء)۔ مذکورہ سال میں آپ یورپ تشریف لے گئے اور اپنے تین سالہ قیام

کے دوران جرمنی سے ڈاکٹریٹ اور لندن سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں آپ وطن لوٹ آئے۔ واپسی پر آپ نے کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کی تدریس کی۔ اس کے بعد ملازمت ترک کر دی۔ اور تمت العمر وکالت کے ذریعے، گزر اوقات فرمائی ہے۔

اقبال زمانۂ طالب علمی سے ہی اردو میں اچھے شعر کہتے تھے۔ ۱۹۰۵ء تک ان کا کافی کلام ہو چکا تھا اس میں چند شعر فارسی کے بھی تھے۔ یورپ سے واپسی کے بعد آپ نے فارسی گوئی کی طرف زیادہ توجہ مبذول کی۔ فارسی زبان کی ترکیبی خوبیاں اور وسعت ایک طرف اور اس کے ذریعے عالم اسلام اور جہان مستشرقین میں اپنا پیغام پہنچانے کی سہولت دوسری طرف یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے تقریباً ۱۵ ہزار اشعار میں سے کوئی ۹ ہزار شعر فارسی میں کہے ہیں۔

اقبال بیسویں صدی عیسوی کے عظیم ترین شاعر ہیں اور شاید ان کی عظمت کا سکہ کئی صدیوں بلکہ ابدالآباد تک چلے گا۔ ایرانی شعرا نے موجودہ صدی کو "قرن اقبال" قرار دیا ہے۔

قرن حاضر خاصۂ اقبال بود   کز تپاشش قدرت ایمان، فزود
قرن حاضر خاصۂ اقبال گشت   واحدی کز صد ہزاران برگذشت

اردو اور فارسی شاعری میں آپ کی عظمت کی بنیادیں فنی اور معنوی خوبیوں کی بنا پر ہیں۔ خالص شاعرانہ رنگ بے نظیر ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ پیغام و فکر و فلسفہ بے بدل و انقلاب انگیز ہے۔ اقبال کے بارے میں دنیا کی مختلف زبانوں میں اتنا لکھا گیا، اور ان کے موضوعاتِ شاعری اتنے متنوع ہیں کہ ان میں سب باتوں کا اشارۃً تذکرہ کرنا بھی کارے دارد ہے۔

اقبال کے افکار کا نقطۂ محور خودی ہے۔ اس لفظ کی عام فہم تعبیر اپنے آپ کو جاننا اور اپنی صلاحیتوں سے اعلیٰ صورت میں استفادہ کرنا ہے۔

خودی سے مردِ مسلمان کا جلال و جمال   کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں

خودی سے اقبال نے بے خودی، حریت، سخت کوشی، انسان دوستی اور عشق شاعری کے موضوعات کا رشتہ جوڑا اور اپنا فلسفۂ حیات پیش کیا ہے۔ اس فلسفے میں اسلامی تعلیمات پر پورے خلوص سے عمل کرنا شامل ہے۔

اقبال اپنی ابتدائی شاعری میں وطنیت (ہندوستانیت) کے داعی رہے۔ بعد میں آپ نے ایک علیٰحدہ اسلامی مملکت (پاکستان) کا تصور پیش کیا اور ساتھ ساتھ سارے عالم اسلام کے اتحاد کا درس دیتے رہے ہیں۔

تصانیف

اقبال نے تین شعری کتابیں اردو میں لکھی ہیں۔ بانگ درا (۱۹۲۴ء) بال جبریل (۱۹۳۵ء) اور ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) ارمغان حجاز کلام کا مجموعہ شاعر مشرق کی وفات کے چند ماہ بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں چھپا اور اس کا آخری ایک تہائی حصہ اردو میں ہے اور باقی فارسی میں۔ پہلی تین کتابیں

اور اس کتاب کے اردو حصے میں کئی اشعار اور مصرعے فارسی میں ہیں۔ اقبال کی فارسیت اور فارسی تراکیب کا غیر معمولی استعمال ایک دلچسپ موضوع ہے۔ سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے دیباچہ بانگِ درا میں اسی مناسبت سے لکھا ہے۔ کہ اقبال کا رہوارِ قلم فارسی کی طرف رواں دواں ہے۔ مگر آپ کس قدر تکلف سے اس کی باگ اردو کی طرف موڑ رہے ہیں۔

کتبِ فارسی

اسرار و رموز: اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی نام کی مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مثنویاں بالترتیب ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء میں چھپی تھیں۔ اور ۱۹۲۵ء میں یکجا کر دی گئیں۔ پہلی کا موضوع انفرادی خودی ہے اور دوسری کا اجتماعی (معاشرے کے کام آنا)۔ ظاہری ہیئت میں آپ نے مثنوی رومی، حضرت بو علی قلندر کی مثنوی۔ اور ظہوری ترشیزی کے ساقی نامہ کا اتباع کیا ہے۔ اور معنوی اعتبار سے جدت و ابتکار تمام کارفرما نظر آتا ہے۔

ہیچکس رازی کہ من گویم نگفت — ہمچو فکر من دُرِ معنی نسُفت
بر دریدم پردہ از راہِ خودی — وانمودم سرِّ اعجازِ خودی

پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء) اس کتاب میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن آ گئے ہیں۔ یہ جرمن شاعرِ حیات، گوئٹے کے "دیوانِ شرقی" کا جواب ہے۔ پیامِ مشرق کی غزلیات دلآویز ہیں۔ اور دوبیتیاں (لالۂ طور) باباطاہر عریان ہمدانی کی "دوبیتیات" کا نمونہ ہیں۔

زبورِ عجم (۱۹۲۷ء) ابتدائی دو حصے غزلیات پر مشتمل ہیں۔ اور آخری دو حصے مثنوی گلشنِ راز جدید اور مثنوی بندگی نامہ پر مشتمل ہیں۔ گلشنِ راز جدید: شیخ محمود شبستری تبریزی کی مثنوی گلشنِ راز کا جدید رنگ میں جواب ہے۔ اقبال نے اس مثنوی میں مندرج ۱۵ سوالوں میں سے ۱۱ کا انتخاب کیا۔ انہیں ۹ سوالوں کی صورت دی۔ اور جواب لکھا ہے۔ یہ سوال و جواب، اسرارِ وحدت، سیر و سلوک، انا الحق، سیرِ باطنی اور دیدارِ ذات وغیرہ مسائل کے بارے میں ہیں۔

اقبال کو کتاب زبورِ عجم (غالباً اس کی غزلیات) پر ناز تھا۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم — فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

اور ان کا یہ ناز بجا تھا۔

جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) یہ کتاب اقبال کا ایک شاہکار ہے۔ یہ سیاحتِ افلاک اور فضائے علوی و عقلائے جہان کی تمثیلات کی حامل کتاب ہے۔ اس کا آخری باب، نئی نسل کے لئے پند و اندرز پر مشتمل ہے۔

آنحضرت ﷺ کے واقعۂ معراج کی پیروی میں کئی صوفیہ اور شعراء نے اپنے روحانی سفر نامے لکھے ہیں:-
ایسے لوگوں میں عرب شاعر ابو العلا معری (م ۴۴۹ھ) سنائی غزنوی (مثنوی سیر العباد الی المعاد) اور

محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اطالوی شاعر ڈانٹے (م ۱۳۲۱ء) کی ڈیوائن کیمڈی میں مذکورہ مصنفین کی خوشہ چینی ملتی ہے۔ اقبال نے "جاوید نامہ" میں انداز بیانات وہی اختیار کیا۔ مگر مسائل و معانی وہ پیش کئے جو فرد اور قوم کے لئے چراغِ راہ بلکہ نشانِ منزل ہیں۔ اس کتاب میں از اول تا آخر مولانا رومیؒ اقبال کے راہنما ہیں۔ یہاں اس کتاب کے موضوعات سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ البتہ مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم کی رائے کی تائید کر دیں کہ شاہنامہ فردوسی، مثنوی معنوی، گلستانِ سعدی اور دیوانِ حافظ کے بعد یہ پانچویں فارسی کتب ہے۔ جسے مطالعہ کرتے ہوئے سیری نہیں ہوتی (نوادرات)

مثنوی "مسافر" اور مثنوی "پس چہ باید کرد" (۱۹۳۶ء) پہلی مثنوی ۱۹۳۳ء میں چھپی تھی اور ۱۹۳۶ء میں دوسری مثنوی کے ساتھ ملا کر شائع کی گئی۔ "مسافر"، سفرِ افغانستان کی یادگار ہے۔ اقبال اواخر اکتوبر اوائل نومبر ۱۹۳۳ء میں اعلیٰ حضرت پادشاہ افغانستان نادر خان شہید کی دعوت پر اس ملک میں تشریف لے گئے۔ اور اس سفر کے تاثرات، اس مثنوی کے موضوعات ہیں۔ دوسری مثنوی، مثنوی رومیؒ کی تضمین جدید کہی گئی ہے۔ پانچ سو اشعار میں علامہ مرحوم نے دین و سیاست، حکمت فرعونی و کلیمی، مقامِ مردِ مومن اور نظریات توحید و رسالت کی معنویت وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر گہر افشانی فرمائی ہے۔

ارمغانِ حجاز: اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ابتدائی تین حصے میں فارسی دو بیتیاں ہیں جن میں مناجات، آرزوئے حج، عشقِ رسولؐ اور اس کے آداب نیز دیگر موضوعات پر علامہ کے انتہائی موثر اور رقت انگیز خیالات ملتے ہیں۔

باقیاتِ اقبال (نقشِ ثانی) میں اقبال کا غیر مطبوعہ اردو فارسی کلام ملتا ہے۔ اس سے قبل اقبال کے غیر مطبوعہ کلام کے جو مجموعے چھپے (تبرکات، رختِ سفر اور سرود رفتہ وغیرہ) مقابلے میں یہ جامع ہے۔

یہاں ہم اقبال کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعیات" ان کے انگریزی میں سات خطبات، تقاریر، خطوط اور یادداشتوں وغیرہ پر تبصرہ نہیں کر سکتے۔ آپ کی فارسی کتب کا مجموعہ کلیات، چند سال قبل تہران میں شائع ہوا تھا۔ اب سن ۱۹۷۳ء کے اوائل میں آپ کے اردو کلام اور فارسی کلام کے جامع مجموعے "کلیات اردو" "کلیات فارسی" (شیخ غلام علی اینڈ سنز) لاہور نے نفیس انداز میں چھپوائے ہیں: اقبال کے بارے میں مختصر و مفصل مزید لکھنا بھی تشنگی بحث کا مداوا نہیں کر سکتا۔ اس خاطر اس کتاب کی روایت کے مطابق آپ کے نمونہ کلام کی خاطر تبرکاً ایک غزل اور ایک دوبیتی نقل کر رہے ہیں۔

یاد ایامی کہ خوردم بادہ ہا با چنگ و نَے | جامِ مَے در دستِ من مینائے مَے در دستِ وَے
در کنار آئی خزانِ ما شود رنگِ بہار | دیدنی، فرودینِ افسردہ از گردِ دَی
بی تو جانِ من چو آن سازی کہ تارش در گسست | در حضور از سینۂ من نغمہ خیزد پی بہ پی

آنچه من در حرم شرق آوردم دانی که چیست؟ یک چمن گل، یک نیستان ناله، یک خمخانه می
زنده کن باز آن محبت را که از نیروی او بوریای ره نشین درافتد با تخت کی
دوستان خرم که بر منزل رسید آوارهٔ من پریشان جاده های علم و دانش کرده طی

هزاران سال با فطرت نشستم باو پیوستم و از خود گسستم
ولیکن سرگذشتم این دو حرف است تراشیدم، پرستیدم، شکستم

طغرائی امرتسری (م ۱۹۳۱ء) حکیم فیروز الدین احمد فارسی میں طغرائی اور اردو میں فیروز کرتے تھے۔ آپ حکیم الشعراء کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے طبیب تھے۔ خط نستعلیق میں سرورت خوش نویس بھی تھے۔ امرتسر کے کئی مشہور مجلوں مثلاً ایشیا، تہذیب الاخلاق، حاذق اور سیاکی ادارت ان کے ذمہ رہی ہے۔ فارسی میں آپ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ مگر ابھی آپ کا تھوڑا کلام چھپ سکا ہے۔ اشعار کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

کیفیت های برشگال پیری باده ها از سحاب می ریزد
حسنت از سرحد کمال گذشت از شبابت، شباب می ریزد

چه دگرگون است تنگ باشراع مهر ازان غبار دگرد بر دیدم طلوع سحر
بهم متصل است که کنجهای باشش الله [illegible] شام و سحر

مولانا ظفر علی (م ۱۹۵۳ء) مولانا ظفر علی خاں، مشہور صحافی، اردو و فارسی کے شاعر اور تحریک آزادی کے نمایاں رکن تھے۔ انہوں نے تقریباً نصف صدی تک اخبار زمیندار نکالا ہے۔

آپ کا مولد سیالکوٹ ہے۔ تعلیم و تربیت وزیرآباد، پٹیالہ، علی گڑھ اور لاہور میں حاصل کی۔ مدتوں حیدرآباد دکن میں ملازم رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے دوست تھے۔ ملت اسلامیہ کے لئے سچی تڑپ رکھتے تھے۔ اسی موضوع پر آپ کی ایک غزل کا انتخاب دیکھیں۔

بہ سلطان از غلامانش چنین یک التجا باشد که او دریای انعام است و در چشم ما باشد
مسخر کشور دل را نمود اقبال سلطانی همی نازیم جانها را که در راهت فدا باشد
فدای دشمنان ملت بیضا ازین ساعت که در دست امیر ما لوای مصطفیٰ باشد
اگر خونش حیات تازه بخشد جسم مذهب را بخون خلیفه وقت به کشش ما روا باشد

مولانا ظفر علی خاں کی اردو نعتیں معروف ہیں۔ فارسی میں بھی آپ نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ شیخ سعدی کے عربی قطعہ کی تضمین ملاحظہ ہو۔

سخنی آوردم زکمال او، ز شکوہ و جلال او — کہ ندیدہ چشم مثیل او، و نہ شنیدہ گوش مثال او
زعرب چکیدہ ملاحتش ز عجم رسیدہ صفد تبش — فلکی کہ ریخت جمال او، شکری کہ ریخت مقال او
بلغ العلیٰ بکمالہ، کشف الدجیٰ بجمالہ — حسنت جمیع خصالہ، صلو علیہ و آلہ

عظامی ہوشیار پوری (م ۱۹۵۷ء)

نام عزیز الدین احمد تھا۔ سال ولادت ہے۔ آپ نے دیوبند کے نامور اساتذہ، خصوصاً شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا سید انور شاہ کشمیری سے استفادہ کیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل (موجودہ فاضل فارسی) کا امتحان پاس کیا۔ تقسیم ملک کے وقت آپ جالندھر کے ایک ہائی اسکول میں فارسی پڑھاتے تھے۔ ہجرت کے بعد آپ ساہیوال (سابقہ منٹگمری) تشریف لے گئے۔ اور وہاں کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں فارسی پڑھانے پر مامور ہوئے۔ وہیں ۱۹۵۵ء میں آپ ریٹائرڈ ہوئے اور ۲ سال بعد انتقال فرمایا۔ فارسی شاعری میں آپ گرامی کے شاگرد تھے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

ستارہ سفتہ گرش در چرخ پا بوس زمین آمد — تعالی اللہ گرامی را عظامی جانشین آمد

آپ کے چند متفرق اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

بمنزل چون رسد واماندہ راہ طلب اے دوست! — بمقصد کی رسد آن کس کہ پیہم جستجو دارد
عشق است طلسمی کہ در، بام ندارد — آن کس کہ ازو یافت نشان، نام ندارد
صد حیف بر این عقل کہ در باغ تمنا — آن نخل نشاندیم کہ بی برگ و ثمر بود
چمن بی گل، سمن بی بو، صبا مشکل سموم اینجا — تو خود انصاف دہ من این چمن را چون چمن گویم؟
عقل است کہ از تاری صد نغمہ برون آرد — عشق است کہ یک نغمہ آورد ز صد تاری

میکش درانی (۱۹۵۹ء)

مرتضیٰ احمد خان میکش کا مولد جالندھر تھا۔ ۲۱ برس کی عمر میں ایک سال کے لئے کابل چلے گئے تھے۔ واپسی پر لاہور میں رہنے لگے۔ اور صحافت کو پیشہ بنایا۔ آپ کا قلم تند و تیز تھا۔ ۱۹۳۱ء میں ایک سال کے لئے جیل بھی بھیجے گئے تھے۔ بطور صحافی آپ نے برما۔ ملایا اور سنگاپور کا سفر کیا تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے۔

نہ از درد دل و بار گناہت یک جہان گفتم — سخن از فرط شوق و حرف مطلب رایگان گفتم
تو پنداری کہ از فرہاد و مجنون داستان گفتم — حدیث درد دل را کاروان در کاروان گفتم

بہ لاغری از حضور خود مرا با جور بی پایان — من از حسن گمان این شیوہ ات را امتحان گفتم
نمی ارزد بہ ظرف بیکرانم بادہ ات ساقی — غلط گفتم اگر جامم ترا رطل گران گفتم
شنیدم از زبان برگ گلہائی جہان میکشتی — سخن ہائی کہ در صبح ازل با سازوان گفتم

علامہ مشرقی (م ۱۹۶۳ء)

عنایت اللہ خان، امرتسر کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد عطا محمد خان، روسائے شہر میں سے تھے۔ اور کئی مشاہیر فضلا مثلاً ذوق، غالب، جمال الدین افغانی، سر سید احمد خان، مولانا شبلی اور مولانا حالی کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم تھے۔ عنایت اللہ خان، جنہیں "علامہ مشرقی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ادبیات اور سائنسی علوم میں تبحر رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم لاہور اور انگلستان (کیمبرج یونیورسٹی) میں ہوئی تھی۔ جناب مشرقی محکمہ تعلیم کے بلند ترین عہدوں پر فائز رہے۔ بعد میں آپ نے انقلابی، خاکسار تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے مقاصد میں برصغیر کی آزادی حاصل کرنا اور مسلمانوں کے عزم و ایمان کو بیدار کرنا شامل تھا۔

علامہ مشرقی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی فارسی شاعری کا مختصر دیوان طبع ہو چکا۔ ایک غزل کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

بیا بہ میکدہ امروز شیخ کہ خوش جائی است — بہیچ در غم فردا کہ کار فردائی است
متاع جان و دلم عرض ناز او کردم — سواد چشم نگر باز در تقاضائی است
وقار حسن اجازت بر تفننش ندہد — خرام ناز نگر باز محو یکتائی است
بہ "مشرقی" تو مدہ شیوۂ ز حسن بازیگری ۔ — کہ عاشقی است بہر شیوہ مرد ہر جائی است

ضیاؔ جعفری پشاوری (م ۱۹۷۰ء)

سید عنایت علی شاہ ضیاؔ جعفری اردو اور فارسی کے صاحب دل اور با ذوق شاعر تھے۔ پشاور کے علمی و ادبی حلقوں کی روح رواں تھے۔ خوش صورت تھے۔ اور شیریں گفتار۔ اردو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ کلام کے کئی مختصر مجموعے چھپے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں مجلس یادگار ضیاؔ نے آپ کے احوال و آثار پر مشتمل ایک عمدہ کتاب شائع کی ہے۔ فارسی کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

ز عشق نالۂ مرغ ہزار چون بہ سر دارم — ز گلروئی صد بہارستان در نظر دارم
بیاد حسن گندم گون تو ای ہمدم چو کبک دری — مثال دانۂ گندم شگافی در جگر دارم
مرا باور نمی آید از حرف وفا قاصد — دروغ مصلحت آمیز می گوئی خبر دارم

بیاد شوخ کج ابرو چو می پرسی توای ہمدم — شب غم من بجای تکیہ بر شمشیر سر دارم

بیاد زلف مشکینش بر آرم از جگر دودی — بعشق سرمۂ چشمش ز لب گفتار بردارم

حیرت کاملی کشمیری (پیدائش ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء)

مولانا شمس الدین حیرت، کشمیر کے کاملی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرینگر کے محلہ "باندان" کے رہنے والے ہیں۔ اس لئے باندانی کہلاتے ہیں۔ عربی و فارسی زبانوں کے عالم، موسیقی و عروض کے ماہر اور تصوف و عرفان میں دلچسپی رکھنے والے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ کشمیری زبان کے معروف شاعر ہیں۔ مثنوی رومی کا کشمیری نظم میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ فارسی مثنوی "شاہنامہ بڈشاہی" میں انہوں نے سلطان زین العابدین کے حالات اور کارنامے لکھے ہیں۔ فارسی غزل میں آپ اساتذہ کا مقام رکھتے ہیں۔ وصفیہ اور بہاریہ قصائد میں آپ خاقانی شروانی اور قاآنی شیرازی کے پیرو ہیں۔ غزل کا منتخب نمونہ حسب ذیل ہے ؎

ای بدور چشم تو پیمانہ نرگس خراب — جام و ساغر در خمارستان تو وردِ شراب

صبح شب ای وصالت اول شام غمت — صبحدم بیدار و پنہان شد ز چشم آفتاب

حسن تا شد جلوہ آرا، عشق آمد اشک ریز — ابر گردد دُر فشان تا برق باشد بی سحاب

حیرت از گلزار حسن کیست گل چین بہار — می چکد از ساغر چشمش چنین سیل گلاب

داراب کشمیری (پیدائش ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء)

خواجہ محمد امین داراب بھی سرینگر کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد خواجہ نور الدین "داراب" اگرچہ تاجر پیشہ تھے (پشمینہ فروش) مگر علم و ادب کے شائق۔ آپ کشمیر کے پہلے مسلمان بادشاہ، سلطان صدر الدین کی اولاد میں سے تھے۔ خواجہ عزیز لکھنوی بھی، جن کا مختصر ذکر ہو چکا، اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

امین داراب، فارسی کے دلآویز شاعر ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے "کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ" نامی کتاب میں لکھا ہے (ص ۳۱۹) کہ ان کے اور حیرت کاملی مذکور کے کلام کو سن کر، ایران کے مایہ ناز محقق اور عالم، پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے بے حد تعریف کی تھی۔ ان کی ایک غزل کے تین شعر دیکھیں، کس قدر ایجاز اور سلاست کار فرما ہے ؎

بمحفل آمدم چون شمع، دل پروا ختم رفتم — ستادم سوختم بگریستم، بگداختم رفتم

چہ می پرسی چہ بودہ حاجتم زین بزم افروزی — نظر انداختم، گردن شبی افراختم، رفتم

"تکاپوئی زدم در وادی امید بی حاصل　　دویدم، ماندم، افتادم، نفس در باختم، رفتم"

داماب نے علامہ اقبال کی کتاب "زبورِ عجم" (حصہ ہائے غزلیات) کی پیروی کی اور اس کا جواب لکھا ہے۔ شیخ محمد ایوب رحمن کا ذکر آ رہا ہے، ان کے بعد زبورِ عجم کا جواب لکھنے والے آپ دوسرے شخص ہیں۔ نمونہ یہ ہے:-

اقبال: سوز و گداز زندگی لذتِ جستجوی تو　　راہ چو مار می گزد گر نروم بسوی تو
من بتلاش تو روم یا بتلاش خود روم　　عقل و دل و نظر ہمہ گمشدگان کوی تو

داماب: سیر سلوک من ببین عشق و جنون من نگر　　پوئیم من براہ حق، روی دلم بسوی تو
روز و شبم چسان گذشت، ہست حساب مختصر　　شب بطواف کوی تو، روز بگفتگوی تو

خواجہ داماب نقاد اور محقق بھی ہیں۔ غنی کشمیری کے دیوان کو انہوں نے ناقدانہ ایڈٹ کیا ہے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (پیدائش ۱۸۹۹ء)

صوفی تبسم کشمیری الاصل ہیں۔ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ اور زندگی کا بڑا حصہ لاہور میں گذارا ہے۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے رہے ہیں۔ ایران کے چند سفر کر چکے ہیں۔ اردو اور فارسی کی تدریسی کتب کی تدوین میں آپ اب تک تعاون کر رہے ہیں۔ اردو، پنجابی اور فارسی تینوں زبانوں میں آپ خوب شعر کہتے ہیں۔ ابھی تک دیوان طبع نہیں ہوا مگر کلام ریڈیو سے نشر ہونے کے علاوہ، ادبی مجلات میں اکثر چھپتا رہا ہے۔ ذیل میں آپ کی ایک غزل کے چند شعر اور ایک دو بیتی درج کی جاتی ہے:-

در کوی تو امروز نیاخفتہ سری نیست　　افتادہ بپا ہیم و کسی را خبری نیست
ای چرخ چہ فردا و چہ دیروز کہ از ہجر　　در خانۂ ما گردش شام و سحری نیست
از گریہ چہ حاصل کہ زبون است تبسم　　ای کاش بنالی کہ فغان را اثری نیست

حسن تو بہار شادمانی باشد　　وصل تو شباب زندگانی باشد
فانی است اگرچہ زندگانی لیکن　　یاد تو بہشت جاودانی باشد

شیدا کشمیری (پیدائش ۱۹۰۳ء)

میرزا کمال الدین شیدا۔ ایک علمی خاندان کے فرد ہیں۔ معتبر وضع کشمیری جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کے سیکرٹری رہے ہیں۔ کتب جمع کرنے اور فن خطاطی سے انہیں خاص لگاؤ ہے۔ وہ اردو کے شاعر ہیں مگر کبھی کشمیری اور فارسی

میں بھی کہتے ہیں۔ ان کے چند ناصحانہ شعر ملاحظہ ہوں۔

گل بروبان، واسیرِ گل مباش بی خبر از نغمہ ہای دل مباش
خام خون پختہ کن، از سوزِ برق زی بطوفان، کشتۂ ساحل مباش
بہر بالیدن ہلالی عید شو بہر کاہیدن مہ کامل مباش
جلوہ گاہ دوست کن دز خود تلاش از جنون گردیدۂ محمل مباش

حفیظ ہوشیارپوری (۱۹۱۲ء/۱۹۷۳ء)

شیخ عبدالحفیظ، قصبہ دیوانپور (جھنگ) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ہوشیارپور اور لاہور میں حاصل کی۔ فلسفہ کے ایم۔اے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے۔ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر و سخن اور ادب و انشا کا شوق تھا۔ اردو اور فارسی میں اچھے شعر کہے ہیں۔ ایران کا سفر کیا تھا۔ ان کی ایک فارسی غزل کا انتخاب درج کیا جاتا ہے:

سخن بگریم و ز آن یار دلستان گویم کہ مہربان نتوان گفت و مہربان گویم
مراست ہرچہ بدل در زبان نمی گنجد چہ گویم و زکجا گویم و چسان گویم
حدیث دوستی ار بار خاطرت باشد حکایتی کہ تو ہم دوستداری آن گویم
تو دلبرم شدی و ترکِ دل بگفتم من کنون کہ جان شدہ ای نیز ترکِ جان گویم

ڈاکٹر عرفانی سیالکوٹی (پیدائش ۱۹۰۷ء)

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی، قصبہ چغتاں وال ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ انگریزی کے پروفیسر رہے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں حکومت ہند کی طرف سے ایران میں پریس اتاشی مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ وہاں دوبارہ پریس اور کلچرل اتاشی مقرر ہو کر ایران گئے۔ قیام ایران کے دوران آپ نے پاکستان اور اقبال کے متعارف کرنے کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

ڈاکٹر عرفانی کی فارسی نثر کا ذکر آئے گا۔ آپ کی فارسی شاعری کا دیوان چھپ چکا مگر ابھی غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔ آپ کے کلام کی اہل زبان نے خاطر خواہ تعریف کی ہے۔ مجلہ "ہلال" کراچی میں مطبوعہ آپ کی چند دوبیتیاں ملاحظہ ہوں:-

فروغ حسن تو برمن عیان شد نگاہ شوق من، آتش زبان شد
چو یک پرتو ز نورت برمن افتاد بہای گوہر ہستی گران شد
وصال تو بخواب اندر فسانہ نبود آن گفتگوی محرمانہ
مرا دادہ است عشق آسانی ترا بخشیدہ است حسن جاودانہ

مرا پایان پذیرد زندگانی　　مرا آید بسر روز جوانی
ہمین انسان ای عشق و مستی　　بماند یادگار جاودانی

یہ دو بیتیاں بابا طاہر عریان کے رنگ میں ہیں۔ ڈاکٹر عرفانی نے تقلید بابا طاہر کا یوں اعتراف کیا ہے۔

بگفتم من حدیث عشق عریان　　کہ مست جامِ بابا طاہر ہستم

شیخ ایوب گورداسپوری (پیدائش ۱۹۰۹ء)

شیخ محمد ایوب وزارتِ خزانہ حکومتِ پاکستان سے منسلک ہے اور ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ چند بار حج کیا۔ ایران سے بھی ہو آئے ہیں۔ صاحبِ دل شخصیت ہیں فارسی شاعری میں آپ کی شہرت کا واحد مدار کتاب "نوائے فردا" پر ہے۔ یہ کتاب اقبال کی زبورِ عجم دحصہ ثانی غزلیات کے جواب میں ہے۔ زبور عجم پر اقبال کو ناز تھا اور فرماتے ہیں۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم　　فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

ایسی کتاب کا جواب لکھنا بڑا مشکل ہے۔ ایوب اگرچہ سبکِ اقبال اور آہ اقبال سے بہرہ مند ہے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

ایوب کہ از اقبال آموخت جگر سوزی　　با شعلۂ آہی نیست بی ذوقِ نگاہی نیست

گرحقیقت یہ ہے کہ "نوائے فردا" کے کم اشعار ہی زبور عجم [redacted] کتاب کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

اقبال: می شود پردۂ چشم پرِ کاہی گاہی　　دیدہ ام ہر دو جہان را بنگاہی گاہی
وادیٔ عشق بسی دور و دراز است ولی　　طی شود جادۂ صد سالہ بآہی گاہی
در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست　　دولتی ہست کہ یابی سرِ راہی گاہی

ایوب: تیرہ آید بہ نظر جلوہ ماہی گاہی　　می نماید چو گلستان پرِ کاہی گاہی
اندرین وادیٔ پرپیچ طلب دیدۂ پاک　　تا نہ تاراج شوی بر سرِ راہی گاہی
خس و خاشاک پریشانِ نیستانِ خرد　　می توان سوختن بیک شعلۂ آہی گاہی

الیاس عشقی (پیدائش ۱۹۲۰ء)

محمد الیاس خان عشقی ہے پورہ راجپوتانہ کے رہنے والے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے کراچی چلے آئے۔ اور ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ فارسی شاعری میں آپ کلاسیکی اور جدید دونوں شعر سیدیا مشرقی اور دونوں رنگوں میں کہتے ہیں۔ جدید فارسی ادب کا آپ نے گہرا مطالعہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر آپ نے دو عمدہ مقالے لکھے ہیں۔ آپ کا اسلوبِ شاعری مندرجہ ذیل چند شعروں سے اجاگر ہے۔

درین زمانهٔ ناقدری کمال عشق   هزار حیف برآنکس که آرزومندست

ای خوش آن روز که آهوی ختن باز آید   بوی پیراهن یوسف سوی کنعان برسد

مژدهٔ وصل به خوکردهٔ هجران برسد   کاش آن سرو خرامان به چمن باز آید

کس چه داند که بهر لحظه چسان یاد کنم   از خموشی چقدر نالهٔ فریاد کنم

ڈاکٹر سید اکرام (پیدائش ۱۹۳۴ء)

ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ اکرام، جواں سال اور جواں بخت محقق اور شاعر ہیں۔ آپ قصبہ "سوگنگاں والے" (نواح لاہور) کے رہنے والے ہیں۔ آپ نے علامہ اقبال پر تحقیقی مقالہ لکھ کر تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے۔ اور اس وقت یونیورسٹی اورینٹل کالج میں فارسی کے پروفیسر ہیں۔

اکرام خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کی غزل اور نظم میں بڑی دلآویزی پائی جاتی ہے۔ "پروازِ پندار" کے نام سے آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ تہران سے شائع ہوا اور اس پر استاد سعید نفیسی مرحوم نے "پیش لفظ" لکھا ہے۔ یہاں ہم ان کی ایک مسلسل غزل کے چند شعر نقل کر رہے ہیں۔ یہ غزل ماہنامہ 'ہلال' کراچی کے اگست ۱۹۷۱ء کے شمارے میں 'سروِ بی گل' کے عنوان سے چھپی تھی۔

بجان تو که مرا آرزو سوای تو نیست   بشوق کیست اگر زندگی برای تو نیست

مرا بجز سر کوی تو کو؟ سر پرواز!   که هر کجا روم بسرای دوست جز هوای تو نیست

اگر تو جور پسندی مراست جور پسند   رضای عاشق سرگشته جز رضای تو نیست

بهر فتنه و آشوب از نگاه تو خاست   که اصل فتنه بجز چشم فتنه زای تو نیست

نسیم با همه لطف و طراوت و خوبی   بعطر بیزی گیسوی مشکسائی تو نیست

"سرو بی گل" چمن با تمام زیبائی   برنگ و بوی برابر بخاکپای تو نیست

هلال عشق ترا می خرم بجان ای دوست   که زنده نیست هر آن دل که مبتلای تو نیست

وفا طلب ز تو کی میکند دگر اکرام   بکن جفا که مرا چشم جز جفای تو نیست

ادب، انشاء اور صحافت

اس عہد کا بیشتر ادب، دینی ادب ہے۔ دینی درسگاہوں میں ابھی عربی کے ساتھ ساتھ فارسی کا تداول رہا اور علماء و فضلا فارسی میں لکھتے رہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی (م ۱۸۹۹ء) نے فارسی میں خطوط لکھے اور دو رسالے وحدت الوجود اور ضیاء القلوب۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی (م ۱۹۲۱ء) کے فتاویٰ (۱۲ جلد) فارسی میں ہیں۔ مولانا عبداللہ غزنوی (اصل نام محمد اعظم) نے مسلک اہل حدیث کے بارے میں جو خطوط لکھے وہ بڑے اہم بتائے جاتے ہیں۔ آپ ۱۸۸۰ء میں فوت ہوئے ہیں۔ موضوع تصوف پر بھی اس دوران

چند کتابیں لکھی گئی ہیں۔ حاجی نجم الدین شیخ پاروی (م ۱۸۰۷ء) حافظ محمد علی خیرآبادی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ کی تصانیف میں "شجرۃ العارفین" "مختصر العارفین" اور "مناقب المحبوبین" معروف ہیں۔ آپ کے خلیفہ سید محمد حسن امروہوی (م ۱۹۰۵ء) نے فارسی میں قرآن مجید کی عرفانی تفسیر لکھی ہے۔ سلسلۂ چشتیہ کے نامور رکن حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی کے "ملفوظات طیبہ" چھپ چکے اور بڑے اہم ہیں۔ آپ "فصوص الحکم" کا باقاعدہ درس دیتے رہے۔ علامہ اقبال سے آپ کی خط و کتابت رہی ہے (اقبال نامہ ج ۱) احمدیت کے خلاف بھی آپ نے فارسی میں رسالے لکھے ہیں۔ فارسی انشا، گفتگو نامہ، آموز نامہ، مصادر نامہ اور قواعد یا بعض صناعی ناموں کے ساتھ کئی مصنفین نے کتابیں لکھی ہیں۔ مگر ان کے جداگانہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

برصغیر میں کئی فارسی اخبار و جرائد اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر سے جاری رہے، مگر ۱۸۵۷ء کے بعد کے رسائل و صحافت کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس ضمن میں مشہور اخبارات، رسائل اور جرائد کا ذکر درج ذیل ہے۔

مطلع خورشید: ہفت روزہ اخبار تھا جو ۱۹۲۵ء میں کراچی سے نکلا۔ اور ۱۹۰۶ء تک جاری رہا۔ اس کے مدیر مرزا مخلص علی مشہدی اور بعد میں ان کے فرزند تھے۔ یہ اخبار کچھ عرصے کے لیے سکھر سے بھی نکلتا رہا۔

حبل المتین: پہلے ہفت روزہ تھا۔ پھر روزنامہ ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں کلکتہ سے جاری ہوا۔ ایرانی عوام کی بیداری کی خاطر اسے سید جمال الدین افغانی کے ایک ہم خیال شخص سید جلال الدین نے اسی نام سے ۱۹۰۷ء میں تہران سے جاری ہوا۔

روزنامہ تمدن: بمبئی سے ۱۹۰۸ء میں جاری ہوا۔ اس کا مقصد وہی تھا جو حبل المتین کا رہا ہے۔

دعوت اسلام: پندرہ روزہ مجلہ تھا۔ اسے سید محمد علی فخر داعی الاسلام مرحوم نے نکالا تھا۔ یہ اسلامی موضوعات کا حامل رہا تھا۔ پہلے اس کا نام اسلام نامہ رہا۔ فخر داعی نے بعد میں اس میں اردو اور انگریزی زبانوں میں بھی چند مضمون کا اضافہ کر دیا تھا۔ اس رسالے کے مدیر نے شبلی نعمانی، سید امیر علی اور سر سید احمد خاں کی کئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

جہان آزاد: دوسری جنگ عظیم کے دوران دہلی سے جاری ہوا۔ سرکاری پرچہ تھا۔ چند سال تک صلیح الدولہ محمد حجازی اس کے مدیر رہے۔

سروش: قیام پاکستان کے بعد پہلے پشاور سے اور پھر کراچی سے ماہنامے کی صورت میں جاری ہوا۔ اس کا مقصد پاکستان اور افغانستان کے ادب و ثقافت پر مضمون شائع کرنا تھا۔ کئی سال سے بند ہے۔

ہلال: قیام پاکستان کے پانچ سال بعد ۱۹۵۲ء میں کراچی سے جاری ہوا۔ سرکاری رسالہ تھا۔ پہلے سہ ماہی تھا۔ بعد میں ماہنامہ ہوا۔ ایران و پاکستان کے نامور شاعر اور ادیب اس پرچے میں لکھتے رہے ہیں۔ اس کا آخری شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء کو نکلا اور اس کے بعد اسے بند کر دیا گیا ہے۔

صدائے پاکستان: ریڈیو پاکستان کا چھوٹا سا رسالہ ہے۔ فارسی میں نشر ہونے والے پروگرام اس میں چھپ جاتے ہیں۔ کراچی سے نکلتا ہے۔

پاکستان مصور: ۱۹۷۳ء کے اوائل میں 'ہلال' کی جگہ راولپنڈی سے نکلا ہے۔ اس رسالے میں پاکستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ اس کے مدیر سید مرتضیٰ موسوی اور معاون مدیر بنت زہرا نقوی ہیں۔

: یہ رسالہ مرکز تحقیقات فارسی راولپنڈی عنقریب جاری کرے گا۔ مطالب فارسی کے علاوہ انگریزی اور اردو میں بھی ہوں گے۔ اس کا نام "فارسی" ہوگا۔

تاریخ و تذکرہ

تواریخ اور تذکرے (خاص اور عام) اس دور میں کافی لکھے گئے۔ ہم اہم تر کتابوں اور مصنفوں کا مختصر ذکر کر رہے ہیں:

دیوان کرپا رام (م ۱۸۷۶ء) کی تاریخ "گلزار کشمیر" سلیس فارسی میں ہے۔ مسلمانوں کے ذکر میں مصنف نے تعصب دکھایا ہے (یہی مصنف 'رد اسلام' رسالے کا مصنف ہے) ملا احمد سہروردی کشمیری نے ایک طویل مثنوی میں تاریخ اسلام کے اہم واقعات کو نظم کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۸۳ھ/۱۸۹۶ء میں لکھی گئی۔ اور چار جلدوں میں ہے۔ اس کا نام "تاریخ جدید (احمدی)" یا خلافت نامہ ہے۔ جونپور نامہ، خیرالدین محمد الٰہ آبادی کی مصنفہ تاریخ جونپور ہے جو ۱۷۹۶ء میں لکھی گئی ہے۔ تاریخ دکن مؤلفہ عبدالعلیم محمد نصراللہ خان قمر، حیدرآباد دکن کی ۵ سال (۱۸۹۳ء، ۱۸۹۸ء) خصوصی تاریخ ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ وزیر نامہ مؤلفہ نواب امیر علی بہادر، اودھ کی تاریخ ہے۔ جو ۱۸۷۵ء میں مکمل ہوئی۔ "لب تاریخ سندھ" صوبہ سندھ کی از ابتدا تا ۱۹۰۰ء تاریخ ہے۔ اس کے مصنف خان بہادر خداداد خان ہیں۔ کتاب چھپ چکی ہے۔

سرسید احمد خان (م ۱۸۹۸ء) کی تالیف "جام جم" خاندان تیموریہ و مغلیہ کی تاریخ ہے۔ اس میں امیر تیمور سے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کے عہد حکومت کے حالات مختصراً اور بزبان فارسی لکھے گئے ہیں۔ یہ تاریخ سرسید احمد کی پہلی تصنیف مانی جاتی ہے۔ مصنف کی زندگی میں دوبار چھپی اور اب گویا نایاب ہے۔ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی (م ۱۹۱۴ء) نے ۱۸۸۱ء میں "سوانح حکیم ناصر خسرو" فارسی زبان میں لکھی۔ اس کی زبان حیرت انگیز حد تک دلآویز ہے۔ یہ کتابچہ ۱۹۷۲ء میں ایران میں شائع ہو گیا تھا۔ اور ۱۹۷۳ء کے اوائل میں اس کا اردو ترجمہ پاکستان سے شائع ہوا۔ مولانا حالی کی چند دیگر فارسی تحریریں ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ (۱۹۵۹ء) میں چھپی تھیں۔ پنڈت شیو جی کی تاریخ کشتواڑ ۱۹۳۸ء میں لکھی گئی اور اس علاقے کی اہم فارسی تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ پیر غلام حسن کھویہامی (م ۱۸۹۸ء) "تاریخ حسن" کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے اور کشمیر کی سب سے اہم اور مبسوط تاریخ ہے۔ کتاب اور اس کا اردو ترجمہ چھپ چکا۔

پہلی دو جلدوں کو پروفیسر صاحب زادہ حسن شاہ، رجسٹرار اسلام آباد یونیورسٹی نے چھپوایا تھا۔ فارسی کی ایک دوسری اہم تاریخ "تاریخ کبیر" مؤلفہ حاجی محمد محی الدین مسکین ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۰ء میں مکمل ہوئی۔

تذکروں میں نواب صدیق حسن خان (م ۱۸۸۹ء) کے "شمع انجمن" کے ذکر سے شروع کریں۔ اس تذکرہ میں الفبائی ترتیب سے ۹۸۷ متقدم و معاصر شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ کتاب ۱۸۷۵ء میں مکمل ہوئی ہے۔ "صبح گلشن" ان کے بیٹے سید علی حسن خان کی تالیف ہے۔ اس تذکرے میں کوئی دو ہزار شاعروں کا ذکر اور نمونہ کلام ملتا ہے۔ "تذکرہ روز روشن" مظفر حسین صبا گوپاموی کی تالیف ہے۔ یہ تذکرہ ۱۸۷۹ء میں مکمل ہوا اور اس میں قدیم و متاخر کوئی ساڑھے تین سو شعراء کا ذکر موجود ہے۔

حدیقۂ عشرت۔ ۹۳۰ شاعرات کا ذکر ہے۔ یہ تذکرہ ۱۸۹۳ء میں مکمل ہوا۔ مؤلف درگا پرشاد مہر سندیلوی ہے۔

سخنورانِ چشم دیدہ، ترک علی شاہ قلندر نوری کا مؤلفہ ہے۔ سال تالیف ۱۹۱۳ء ہے۔ اس میں دو سو سے زیادہ معاصر فارسی شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام مندرج ہے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم نے، جو کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے، ۲۸۰ معاصر ایرانی شعرا کا تذکرہ لکھا ہے۔ اس کتاب کا عنوان "سخنورانِ ایران در عصر حاضر" ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے فارسی شعرا کا ایک مختصر تذکرہ ایران سے شائع کروایا ہے۔ اس کتاب کے مطالب اور ۲۲ شعرائے کشمیر کا نمونۂ کلام بیشتر ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی مرحوم کی انگریزی تالیف "کشیر" سے ماخوذ ہے۔ یہ تذکرہ ایران صغیر یا تذکرہ شعرای پارسی زبان کشمیر کے نام سے چھپا ہے۔ ڈاکٹر گردھاری لعل ٹیکو کشمیری نے "برگزیدہ از پارسی سرایان کشمیر" کے نام سے ایک تذکرہ تہران سے شائع کروایا ہے۔ اس کتاب پر پروفیسر ڈاکٹر محمد معین مرحوم نے مقدمہ لکھا ہے۔ پیر سید حسام الدین راشدی نے ۱۹۶۷ء میں اقبال اکادمی کراچی کی طرف سے تذکرۂ اصلح "تذکرۂ شعرائے کشمیر" کے عنوان سے شائع کروایا اور اس کے ساتھ ساتھ ۳ جلدوں میں اس کا ضمیمہ تکملہ لکھا اور اسی ادارے کی طرف سے چھپوایا۔ اس طرح ان پانچ جلدوں میں کشمیر کے کوئی ۴۰۰ فارسی شعرا کا حال اور نمونۂ کلام کیا ہو گیا ہے۔ "تذکرۂ شعرائے کشمیر" کے ساتھ ساتھ اقبال اکادمی کراچی نے "تذکرۂ شعرائے پنجاب" شائع کروایا۔ اس میں تقریباً ۵۰۰ شعراء کا ذکر اور نمونۂ کلام بالاختصار موجود ہے۔ مؤلف لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید ہیں۔ ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی نے شاعران پارسی گو معاصر پاکستان کے عنوان سے اپنے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے۔ اس تذکرہ میں ان پاکستانی شعراء کا ذکر ملتا ہے جو ۱۹۶۵ء میں حیات تھے۔ تذکرہ کے آخر میں مؤلف نے ۹۹ ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے، جن پر کام کرنا ان کے مستقبل کا منصوبہ ہے۔ یہ تذکرہ ۱۹۷۰ء میں مکمل ہوا اور زیر اشاعت ہے۔

متفرق فارسی کتب / مصنفین

متفرقات میں چند سفرنامے اور دیگر فنون کی فارسی کتابیں ہیں۔ محمد زمان خان نے مشرقِ قریب و بعید کا سفر کیا ہے۔ اور "داستانِ جہان" نامی کتاب میں اپنے سفر کے تاثرات لکھے ہیں۔ یہ سفرنامہ ۱۹۰۲ء میں ایران سے شائع ہوا ہے۔ لیئق علی خان سالار جنگ یورپ کے سفر پر گئے انہوں نے "وقائع مسافرت" فارسی میں لکھی جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہو گئے تھے۔ نواب رام پور محمد کلب علی خان کا سفرنامہ "تذییل الحرم" عتباتِ مقدسہ کی زیارت کے بارے میں ہے اور یہ ۱۸۸۳ء میں رام پور سے شائع ہوا تھا۔

علوم پر لکھی جانے والی معروف کتابوں میں حساب علمی و عملی، الجبرا اور اسرار المشکلات قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی دو کتابیں ابوالحسن ارجمند ساز جی نے لکھیں۔ تیسری کتاب علمِ حل کے بارے میں میرزا محمد کی تالیف ہے۔ یہ کتابیں انیسویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی ہیں۔ مندرجہ ذیل طبی کتب اس دوران لکھی گئی ہیں۔

تریاق خواجہ (سانپ کے ڈسے ہوؤں کا علاج) مؤلفہ محمد نصراللہ خان، مخزن الاکسیر مؤلفہ امام الدین بن محمد، علاج الابدان مؤلفہ عبدالحق، شفاء الاطفال مرتبہ محمد صادق، کامل التشخیص مؤلفہ حکیم احمد سعید امروہوی اور اکسیر اعظم (۴ جلد) مؤلفہ حکیم محمد اعظم خان

۱۸۵۷ء کے بعد لغت کی بعض اہم کتب لکھی گئی ہیں۔

فرہنگ آنندراج مؤلفہ محمد پادشاہ۔ یہ لغت [illegible] ۱۸۸۸ء میں مکمل ہوا۔ برصغیر میں لکھے جانے والے لغتوں میں جامع ترین مانا جاتا ہے۔ پہلے ہندوستان میں اور اس کے بعد ایران میں چھپ چکا۔ ایران میں اسے ڈاکٹر محمد دبیر سیاقی نے ایڈٹ کیا ہے۔ لغت میں معانی کے لئے کثیر شواہد موجود ہیں۔

آصف اللغات ۱۹۰۷ء میں مکمل ہوا۔ مؤلف نواب عزیز یار جنگ بہادر ہیں۔ مفرد اور مرکب فارسی الفاظ کا اہم لغت ہے۔ معانی فارسی سے فارسی میں دیئے گئے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اردو میں بھی "خزانۃ اللغات" ایک عجیب لغت ہے۔ اس میں اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ترکی اور سنسکرت چھ زبانوں کے مترادفات یکجا کئے گئے ہیں۔ اسے منشی سید جمیل بھسوالی نے مرتب کیا اور ۱۸۸۷ء میں بھوپال سے شائع کروایا۔ درسی ضروریات کے لغت نیز انشاء اور گرامر وغیرہ کی متعدد کتب چند سالوں کے وقفوں کے بعد چھپتے رہے اور ان کا احاطہ کرنا غیر ضروری نظر آتا ہے۔

پاکستان کے معاصر فارسی نویس

قیامِ پاکستان کے بعد ایران کے ساتھ ہمارے روابط استوار ہوئے۔ اور ان دو ہمسایہ برادر ملکوں کے درمیان آمد و رفت اور دید و بازدید کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے نتیجے میں ہمارے فارسی خواں اور فارسی داں حضرات۔ اچھے فارسی نویس بننے لگے۔ اس وقت پاکستان میں ۳۰ کے قریب ایسے افراد موجود ہیں جو کئی برس تک ایران میں مقیم

رہے اور ایران کی مختلف یونیورسٹیوں سے ادب یا کسی دوسرے شعبے میں ڈاکٹریٹ وغیرہ کی سندیں لے چکے ہیں۔ یہ لوگ اچھی فارسی لکھ اور بول سکتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے مقالے پاکستان کے ماہنامہ ہلال اور ایران کے درجۂ اول کے مجلات میں چھپتے رہے ہیں۔ ان سب کے تحقیقی مقالات فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ فارسی میں صاحبِ تصانیف حضرات میں چند مشاہیر حسبِ ذیل ہیں۔

پیر سید حسام الدین راشدی: ان کے مرتبہ تذکرہ شعرائے کشمیر" ۵ جلد کا ذکر ہو چکا۔ اس کے علاوہ ان کی دس کے قریب فارسی کتابیں، سندھی ادبی بورڈ کراچی و حیدرآباد نے شائع کی ہیں۔ کتابیں کلاسیکل ہیں اور پیر صاحب نے ان پر فارسی کتب اور حواشی لکھے ہیں۔ ان کتابوں میں میر علی شیر قانع تتوی کی تالیفات مکلی نامہ، تحفۃ الکرام اور مثنویات و قصائد قانع، سید عبدالقادر تتوی کی حدیقۃ الاولیاء، سلطان محمد غزنی کی مقالات الشعراء اور یوسف میرک امیر خانی کی تاریخ مظہر شاہجہانی اور چند شعرا کی مثنویاں شامل ہیں۔ پیر صاحب سندھ کے ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ فارسی کے ساتھ ساتھ وہ سندھی ادب کی بھی خدمت کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی: ان کا ذکر دو بار ہو چکا ہے۔ موصوف کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "شرح احوال و آثار ملک الشعراء بہار" کے عنوان سے فارسی میں ہے اور چھپ چکا۔ علامہ اقبال پر ان کی تالیف "رومی عصر" ہے۔ انہوں نے ضربِ کلیم کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ "انتخاب شعر معاصر فارسی" کو لاہور بورڈ نے شائع [کیا]۔ فارسی امروز، داستانہای عشقی پاکستان اور سرود سرمد (صادق سرمد کے حالات اور شاعری) آپ کی دیگر تالیفات ہیں۔ ڈاکٹر عرفانی چند سال تک سہ ماہی "ہلال" کے مدیر رہے اور اس مجلے میں گرانقدر مقالے لکھ چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر: ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں شعبۂ فارسی کے صدر اور اس کالج کے پرنسپل رہے ہیں۔ آپ کے فارسی مقالات اورینٹل کالج میگزین، ہلال اور بعض ایرانی مجلات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اردو اور انگریزی میں آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایران کئی بار گئے ہیں۔ فارسی میں آپ نے تذکرہ مخزن الغرائب مولفہ شیخ احمد علی خان سندیلوی ہاشمی، "تاریخ گوہر نوشتہ سید نور الدین"، عبرت نامہ مصنفہ مفتی علی الدین لاہوری، درفش کاویانی مولفہ میرزا غالب، مانی لا انا فضل مرتبہ اللہ داد فیضی سرہندی (دفعۃ الکمال یہ لغت مکمل نہیں چھپی) اور کلیات جویائی تبریزی کشمیری ایڈٹ کر کے چھپوائی ہیں۔ "فارسی نامہ" آپ کی ایک دوسری تالیف ہے۔

ڈاکٹر غلام سرور: ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۹ء میں چکوال (ضلع جہلم) کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور وہیں سے انگریزی زبان میں "تاریخ شاہ اسماعیل صفوی" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے۔ ڈاکٹر موصوف ۱۹۳۳ء اور ۱۹۵۳ء میں ایران تشریف لے گئے ہیں۔ آپ اردو کالج کراچی اور کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر رہے۔ "ہلال" میں آپ کے تحقیقی مقالے اکثر چھپتے رہے۔ دوسری کتابوں کی تدوین کے علاوہ، آپ نے حسبِ ذیل کتابیں فارسی میں لکھی ہیں۔

۱۔ تاریخ زبان فارسی (در دو جلد) ۲۔ تاریخ زبان و ادب فارسی در شبہ قارہ (۳ جلد) ۳۔ فرہنگ مبسوط فارسی معاصر ۴۔ شرح حال ملک الشعرا بہار۔ "تاریخ ایران قدیم" کے نام سے آپ کی ایک اردو تالیف بھی موجود ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید: "تذکرۂ شعرای پنجاب" کے ضمن میں ان کا ذکر گزر گیا۔ انہوں نے "تذکرۂ طالب آملی" بھی مدوّن کیا اور چھپوایا۔ مگر اس کا مقدمہ سادہ اردو میں ہے۔

سید وزیر الحسن عابدی: وطن بجنور ہے۔ دہلی، لکھنؤ اور تہران میں تعلیم حاصل کی۔ گذشتہ ۲۰ برس سے یونیورسٹی اور اورینٹل کالج لاہور میں فارسی کے استاد ہیں۔ آپ بلا استثنا، فارسی کے فاضل ترین محققین میں سے ہیں۔ کلیات فیضی۔ فہرست مخطوطات شیرانی (ج ۱) غزلیات فارسی غالب، پانچ دو دو، مقالات منتخب از اورینٹل کالج میگزین (۲ جلد)، "وامق و عذرا" اور غزلیات سعدی و خسرو، آپ کی مساعی سے مدوّن و شائع ہوئیں۔ دبستان عجم (۲ جلد) اور منتخب زبان فارسی آپ کی دیگر تالیفات ہیں۔

ڈاکٹر سید علی رضا نقوی: وطن امروہہ ہے۔ تعلیم کراچی اور تہران میں پائی۔ "تذکرہ نویسی فارسی در شبہ قارہ" کے عنوان سے آپ نے تحقیقی مقالہ لکھا اور تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ یہ مقالہ ایران میں چھپ چکا اور ۱۹۶۴ء میں مؤلف کو اس پر سال کی بہترین کتب کے زمرہ میں انعام ملا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے "ہمالیہ" نامی کتابچہ میں چند اردو نظموں کو فارسی میں ترجمہ کر کے (اپنے ایک ساتھی کی ہمکاری سے) تہران سے شائع کروایا ہے۔ پاکستان کے عدالتی نظام کے بارے میں آپ نے ایک رسالہ "دستگاہ قضائی پاکستان" کے عنوان سے وزارت قانون، حکومت پاکستان کی طرف سے شائع کروایا ہے۔

فارسی ناول

جدید فارسی کے نثری ادب میں ناولوں کا ایک قابل قدر سرمایہ موجود ہے۔ اسمیں تراجم اور طبع زاد دونوں قسم کے ناول شامل ہیں۔ یہ صنف ادب اپنی مقبولیت کے باوجود ابھی تک مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ ناول کی اصطلاح اردو یا انگریزی ادبیات میں جن معنوں میں آتی ہے۔ فارسی میں نہیں آتی بعض مقالات میں "ناول" داستان کوتاہ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ایران میں ناول کی جگہ اس کا فرانسیسی مترادف رمان زیادہ عام ہے۔ فارسی رسائل میں اب رمان کی بجائے ناول کے لیے داستان کی اصطلاح بھی دیکھنے میں آ رہی ہے پہلے افسانے کو داستان کوتاہ کہا جاتا تھا اب اسے بھی داستان ہی کہتے ہیں۔ اسی لیے داستان

سے ناول اور افسانے کا فرق معلوم نہیں ہوتا بہر حال محتاط نقاد ناول کے لیے رمان کی اصطلاح ہی برتتے ہیں۔ فارسی ناول کا تفصیلی جائزہ پیش کرنا تو ممکن نہیں البتہ آئندہ سطور میں چند اہم ناولوں سے بحث کی جائے گی۔

ناصر الدین شاہ قاچار کا سفر نامہ یورپ اپنی عجیب و غریب معلومات اور دل کش انداز کی وجہ سے بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بعد دو فرضی سفر نامے "سیاحت نامہ ابراہیم بیگ" اور مسالک المحسنین کے نام سے لکھے گئے۔ دونوں سفر ناموں میں کہانی کا عنصر موجود ہے اور ایک واضح اصلاحی مقصد کے تحت معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی لیے نقاد ان دونوں کتابوں کو ناول تسلیم کرتے ہیں جو سفر نامے کے انداز پر لکھے گئے ہیں۔ دونوں کا موضوع ایرانی معاشرے کی کمزوریوں پر روشنی ڈال کر لوگوں کو بیداری اور اصلاح احوال کی دعوت دینا ہے۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ ۹۰۷-۱۹۰۶ حاجی زین العابدین مراغی کی تصنیف ہے۔ مسالک المحسنین ۱۳۲۲ھ کے مصنف کا نام عبد الرحیم طالبوف تھا۔ ناول میں سفر نامے کا یہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ آج کے ایک ممتاز ناول نگار حسین مدنی نے "اسمال در نیو یورک" اسی اسلوب میں لکھا۔ اس ناول کا ہیرو اسمال (اسماعیل) ایک اوباش ڈرائیور ہے جو دوسری عالمگیر جنگ میں، اپنے ایک امریکی دوست کی مدد سے ایک جہاز پر ملازم ہو کر امریکہ پہنچ جاتا ہے۔ مدنی نے اسمال کی مہمات، معاشقوں اور جھگڑوں کا ذکر بڑی شگفتگی سے کیا ہے امریکہ میں اسمال کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جاتی ہیں۔ وہاں اس پر عالمی سیاست کے راز منکشف ہوتے ہیں یہ ناول طنز و مزاح کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ان تینوں کتابوں کا ذکر محض اسلوب کی مشابہت کی وجہ سے ایک جگہ کیا گیا ہے۔ ورنہ آخری ناول موجودہ زمانے سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔

فارسی ناول میں شروع ہی سے سماجی حقیقت نگاری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مشفق کاظمی کا چھ جلدوں پر محیط "تہران مخوف" ایک طویل ناول ہے۔ اس ناول کی چار جلدیں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئیں۔ اس ناول میں محمد علی شاہ قاچار کے دور استبداد میں ایران کے معاشرتی انحطاط کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ اس وقت ایران میں مذہب، سیاست، اخلاق غرض ایرانی معاشرے کا پورا ڈھانچہ انارکی کا شکار تھا اور ہر جگہ منافقت کا دور دورہ تھا اس ناول کا ہیرو فرخ اپنی بے لوث محبت کے باوجود اپنی محبوبہ مہین کو نہ پا سکا کیوں کہ مہین کا باپ اپنی بیٹی کو وسیلۂ اقتدار بنانا چاہتا ہے۔ فرخ معاشرے سے نبرد آزمائی کرتا ہے اس جنگ میں تو وہ ناکام رہتا ہے۔ لیکن یہ جذبات انقلاب پسند بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ انقلاب سے زیادہ انتقامی کارروائیوں میں ملوث نظر آتا ہے۔ ناول کی کہانی اور طرز بیان دونوں دلچسپ ہیں کہیں کہیں تصنع کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس طویل ناول میں ایران کے ہر طبقے کا نمائندہ

موجود ہے۔ یہ ناول ایک طرح تہران کی متحرک زندگی کا ایک جیتا جاگتا مرقع معلوم ہوتا ہے

ملیح الدولہ سید محمد حجازی مرحوم کے دو ناول "ہما" اور "پریچہر" حقیقت نگاری اور طلاوتِ اسلوب کے اعلیٰ نمونے ہیں ـــ ہما۔ حسن علیخان اور ہما کی داستان محبت ہے اس میں حجازی نے ایران کے سماجی اور سیاسی کوائف کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے ہما ایک باسلیقہ، ذہین اور شائستہ لڑکی ہے۔ پریچہر ایک ہوس پرست عورت کی کہانی ہے جسے علی جیسا کمزور دل شوہر ملا۔ پریچہر کے ہرجائی پن کی وجہ سے علی کی زندگی ایک المیہ بن کر رہ جاتی ہے دونوں میاں بیوی آخر میں ایک ترکمان سردار کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں:

زیبا حجازی کا ایک طویل ناول ہے حسین خان اور زیبا اس کے مرکزی کردار ہیں حسین خان ایک متدین نوجوان زیبا کے دام عشق میں پھنس کر اپنی منزل سے بھٹک جاتا ہے۔ وہ کلرک سے سیاستدان اور پھر اخبار نویس بنتا ہے اس ناول میں بھی حجازی نے بڑی صراحت سے ایرانی معاشرے کی ان تمام خامیوں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ جو مشروطے سے پہلے کے ایران میں موجود تھیں۔ ان ناولوں میں فنی نقائص موجود تو ہیں لیکن حجازی کے حسن بیان سے کسی حد تک ان کی تلافی ہو جاتی ہے۔

مسعود دہاتی کے ناول بھی ایرانی معاشرے کے صحیح عکاس ہیں۔ دہاتی نے ایرانیوں کے مذہب ضعیف الاعتقادی، عیش کوشی، نظام تعلیم اور نظم حکومت پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ تفریحاتِ شب، در تلاشِ معاش، اشرف المخلوقات، گلہائی کہ در جہنم میروید اور بہشتِ آرزو ان کے مشہور ناول ہیں۔ ان ناولوں میں کہیں کہیں ان کا واعظانہ انداز کھٹکتا ہے۔ مسعود دہاتی کی زبان اخباری اور عامیانہ ہے

جواد فاضل مرحوم بہت پرنویس ناول نگار تھے۔ انہوں نے تقریباً چالیس ناول لکھے، ازدواجی مسائل، جنسی بے راہروی اور سماجی برائیاں ان کے ناولوں کے موضوعات ہیں۔ جواد فاضل کے پلاٹ بڑے دلچسپ ہیں۔ پڑھنے والے کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ نویسندہ، ماجرا، در این دنیا، عشق و رشک ان کے معروف ناول ہیں۔ عورتوں کی زبوں حالی کے موضوع پر عباس خلیلی کے ناول "روزگارِ سیاہ" "انتقام" اور "انسان" بھی قابلِ ذکر ہیں۔

گذشتہ دس پندرہ سالوں میں ایرانی ناولوں میں سماجی حقیقت نگاری کا عنصر زیادہ واضح صورت میں سامنے آیا ہے۔ شوہر آہو خانم، تنگسیر، افسانہ و افسوں اور درازنائے شب اس دور کے نمائندہ ناول ہیں ان ناولوں میں دور حاضر کے بدلتے ہوئے نظام کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ نئے حالات کو ناول نگاروں نے صحیح تناظر میں پیش کیا ہے۔ صنعتی ترقی سے جو سماجی مسائل جنم لیتے ہیں ان کی بازگشت بھی ان ناولوں میں سنائی دیتی ہے۔ ناول نگاروں میں اصلاح کا احساس بھی ملتا ہے۔

علی محمد افغانی کا ناول شوہر آہو خانم ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کہانی کا مرکزی کردار تہران سے دور ایک چھوٹے سے قصبے کا نانبائی سید میران ہے۔ یہ شخص کئی بچوں کی ماں، اپنی خدمتگزار اور باوفا بیوی آہو خانم کے

ہوتے ہوئے ایک نوجوان اور خوبصورت عورت ہما کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔ یہ شادی اس گھر کا سکون غارت کر دیتی ہے اس شادی سے ہما کی توقعات بھی پوری نہیں ہوتیں وہ سید میران سے طلاق لے لیتی ہے اور گھر کے حالات پہلے ہی کی طرح ہو جاتے ہیں۔ سید میران زندگی کی یکسانیت میں تبدیلی کا خواہشمند ہے اور ہما اس تبدیلی کی علامت ہے لیکن اس کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔ ناول کافی ضخیم ہے۔

ایران کے مشہور افسانہ نگار صادق چوبک کے ناول تنگسیر کو بھی ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ تنگستان فارس کا رہنے والا ایک شخص محمد اس ناول کا ہیرو ہے۔ یہ اپنی عمر بھر کی کمائی بوشہر کے ایک بزاز کو کاروبار کے لیے دے دیتا ہے وہ سارا سرمایہ ہضم کر جاتا ہے۔

محمد اس سرمایہ کی واپسی اور اپنے دشمنوں سے انتقام کے لیے میدان میں آتا ہے۔ یہ بدی کے خلاف ایک فرد کی جدوجہد کی کہانی ہے۔ ناول کے پلاٹ کی تشکیل، کردار نگاری اور ایرانی معاشرے کی عکاسی میں صادق چوبک نے بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔

افسانہ و افسوں ———— م۔ دیہ در کا لکھا ہوا۔ ناول ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس کا مرکزی کردار ایک ادھیڑ عمر، شادی سے مایوس عورت حلیمہ بی بی ہے جو اپنا نام بدل کر حلیمہ بن جاتی ہے۔ اپنی چالبازیوں کے ذریعے ایک صاحب حیثیت شخص وجیہ اللہ سے شادی کر کے سوسائٹی میں ایک اہم مقام حاصل کر لیتی ہے۔ وہ بہت جلد سوسائٹی کی مشہور عورت بن جاتی ہے۔ بالآخر وہ ایک جرائم پیشہ سازشی گروہ سے تعلقات قائم کر لیتی ہے جس تیزی کے ساتھ وہ عروج پر آئی اسی تیزی کے ساتھ وہ زوال کے گڑھے میں گر پڑی۔ اس کا انجام خاصا عبرتناک ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ہاتھوں قتل ہو جاتی ہے۔ اس طرح ناول نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دھوکے سے حاصل کیا ہوا جاہ و منصب پائیدار نہیں ہوتا۔ بعض سخن کے تبصرہ نگار افسانہ و افسوں کو روایتی انداز کی ایک کوشش سے زیادہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن روسی پروفیسر کیمیسارو نے صنعتی دور کے پیچیدہ معاشرے کے پس منظر میں اسے ایک بہترین کاوش قرار دیا ہے۔ صنعتی معاشرے کے تمام کردار مثلاً تاجر، کارخانہ دار، سرمایہ دار، جیلر، منیجر، شاعر، اہل قلم، صحافی اور سیاست باز سبھی اس میں جلوہ گر ہیں اور ناول نگار نے ان کرداروں کے گھناؤنے باطن کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

جمال میر صادقی کا دراز نامی شب ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ ایران میں نئے اور پرانے نظام کی آویزش سے پیدا ہونے والے مسائل اس ناول کا موضوع ہیں۔ کمال اور منوچہر اس کے مرکزی کردار ہیں۔ کمال کا تعلق ایک قدامت پسند گھرانے سے ہے اور وہ اپنے دوست منوچہر کی بدولت زندگی کے بارے میں ایک ترقی پسندانہ رویہ اپنا لیتا ہے۔ کمال نئے دور کا نیا انسان ہے۔ موجودہ دور کے فارسی ناولوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج کا ایرانی ناول نگار سماجی مسائل کا بہتر شعور رکھتا ہے اور انہیں چابکدستی سے پیش کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہے۔

تاریخی ناول: ایران میں تاریخی ناول بھی بڑی تعداد میں لکھے گئے ان کا سلسلہ [illegible] اور جرجی زیدان کے

ناولوں کے تراجم سے ہوا پھر ایرانیوں نے اپنے شاندار ماضی (ایران قبل از اسلام) کے موضوع پر ناول لکھے فارسی کے معروف تاریخی ناول حسب ذیل ہیں۔ عشق و سلطنت (شیخ موسیٰ ہمدانی)، انتقام خواہان مزدک (صنعتی زادہ)، پہلوان زند (دانشیمن پرتو)، جنت پاک (حسین قلی مرزا)، یعقوب لیث (یحییٰ ذیب)، لازیکا۔ منظام ترکی غزنوی قتل جمعی۔ فارسی میں موریہ کے انگریزی ناول حاجی بابا اصفہانی ترجمہ شیخ احمد روحی نے کیا۔ ترجمہ اتنا برجستہ ہے کہ اس پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے چونکہ حاجی بابا اصفہانی کا موضوع بھی ایرانیوں کی معاشرتی زندگی ہی ہے اس لیے یہ بہت مقبول ہوا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی عظیم ناول نگار ہو جس کے آثار فارسی میں ترجمہ نہ ہوئے ہوں بالزاک، کافکا، البرٹ کامیو، چیشرنگ، ڈکنز، ورجینیا وولف ہیمنگوے و اسٹینی امریکہ کے لکھنے والوں کے اکثر ناول فارسی میں منتقل ہو چکے ہیں۔

حواشی: (۱) میر سخن از احمد احمدی و حسین رزمجو ص: ۲۶۵ چاپ مشہد ۱۳۴۵

(۲) مجلہ سخن دورہ ہجدہم شمارہ ۴ ۵

(۳) مجلہ سخن دورہ بیست و سوم شمارہ ۴

بہترین کتابیں

- اُردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک
- اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: آغاز سے 2000ء تک
- عربی ادب کی تاریخ: دورِ جاہلیت سے موجودہ دور تک
- اُردو زبان کی مختصر ترین تاریخ
- پنجابی زبان و ادب کی تاریخ
- عربی ادب میں مطالعے
- تاریخِ ادبِ اُردو
- ادب اور لاشعور
- ادب اور کلچر
- اُردو زبان کیا ہے؟
- تخلیق اور لاشعوری محرکات
- ادب کا بدلتا منظرنامہ: اُردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ
- بیسویں صدی میں اُردو ادب
- فلسطین اُردو ادب میں
- ہمارا ادب
- سرمایۂ اُردو
- سفینۂ اُردو: شعری اور نثری ادب کے منتخبات

- تو زکِ اُردو
- کمکِ اُردو
- مسائلِ ادب: تنقید و تجزیہ
- اصنافِ ادب
- باغ و بہار (عکسی ایڈیشن)
- پنجابی علم و ادب میں مسلمانوں کا حصہ
- سفینۂ ادب
- مُعاصر ادب
- معین الادب معروف بہ مُعین الشعراء

Rs. 400.00

www.sang-e-meel.com
www.sang-e-meel.net